BAUL(N) - 101

بی۔اے۔اُردو

سمسٹرِ اوّل

BACHELOR OF ARTS (URDU)

FIRST SEMESTER

MAJOR CORE

غزل

GHAZAL

ولی اورنگ آبادی

سراج اورنگ آبادی

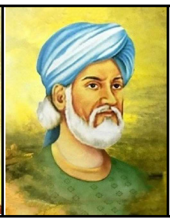
خواجہ میر درد

میر تقی میر

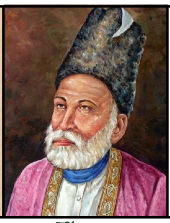
مرزا غالب

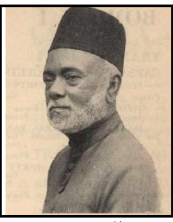
آرزو لکھنوی

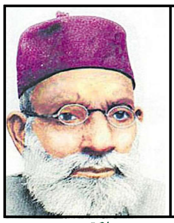
حسرت موہانی

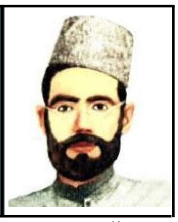
عزیز لکھنوی

اصغر گونڈوی

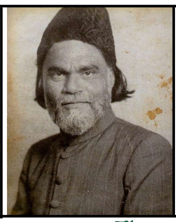
جگر مرادآبادی

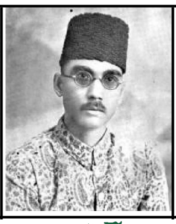
یگانہ چنگیزی

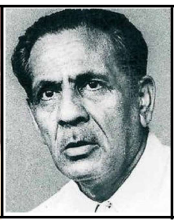
فراق گورکھ پوری

مجروح سلطان پوری

ناصر کاظمی

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

بی۔اے۔اُردو

BACHELOR OF ARTS (URDU)

سالِ اوّل

FIRST YEAR

سمسٹر اوّل

FIRST SEMESTER

بی۔اے۔یو۔ایل۔(این۔) - ۱۰۱ - غزل

BAUL(N) - 101 - GHAZAL

MAJOR CORE

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی-(نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

سرپرستِ اعلیٰ:

پروفیسراو. پی.ایس.نیگی، وائس چانسلر،اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی،ہلدوانی۔

کمیٹی بورڈ آف اِسٹڈیز:

پروفیسررینوپرکاش(ڈائریکٹراسکول آف ہیومنٹیز (SOH) اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی(UOU)،ہلدوانی۔

پروفیسرتوقیراحمدخاں،ریٹائرڈپروفیسرشعبۂ اردو،دہلی یونی ورسٹی،دہلی۔

پروفیسرسیدمحمدارشدرضوی،گورنمنٹ رضاپی.جی.کالج،رام پور۔

شہپرشریف،اسسٹنٹ پروفیسرشعبۂ اُردو،اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی،ہلدوانی۔

محمدافضل حسین،اسسٹنٹ پروفیسروکورس کوآرڈِنیٹرشعبۂ اردو،اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی،ہلدوانی۔

رجسٹرار:

پروفیسرپی.ڈی. پنت،اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی،ہلدوانی۔

کورس کوآرڈِنیٹرواڈیٹر:

محمدافضل حسین(اُستاؔدبریلوی)

صدرِشعبۂ اردو،اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی،ہلدوانی

C جملہ حقوق بحقِ ناشرمحفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں یونی ورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب ''اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی'' کے بی.اے. اُردوسالِ اوّل، سمسٹر اوّل، غزل کے نصاب کا جزو ہے۔ مزید معلومات یا کسی بھی وضاحت کے لئے یونی ورسٹی حکّام یا صدرِ شعبۂ اردو سے یونی ورسٹی کے حسبِ ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

DEPARTMENT OF URDU

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

UNIVERSITY ROAD, BEHIND TRANSPORT NAGAR (Teenpani Bypas)

HALDWANI-263139 Phone:05946-261122

پیش لفظ

اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی کا قیام اُتراکھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت ۳۱/ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو عمل میں آیا جس کا مقصد آبادی کے بڑے حصے کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے اُن لوگوں تک تعلیم پہنچانا ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب کالجز یا یونی ورسٹیز تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔یونی ورسٹی کے تعلیمی پروگرام ''بیچلر آف آرٹ'' کے تحت ''بی.اے.اردو'' بھی شامل ہے۔یہ کتاب بی.اے.اردو سالِ اوّل، سمسٹر اوّل، غزل کے نصاب میں شامل ہے جس کا نام ''بی.اے. یو.ایل (این.)-۱۰۱، غزل ہے۔یہ کتاب ۱۵/ اکائیوں پر مشتمل ہے جو الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی طریقۂ تعلیم کی کتابوں کو {خود تدریسی مواد، SLM} (Self Learning Materials) کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ طالبِ علم کو یہ مواد خود ہی پڑھنا ہوتا ہے۔روایتی درس گاہوں کے خلاف اسے پڑھانے کے لئے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں رہے گا بلکہ آپ یہ مواد خود ہی پڑھیں گے اور سمجھیں گے۔اِس صورتِ حال کے تحت اسباق کو اِس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں موجودگی کا احساس ہو اور کلاس میں نہ ہونے کی کمی کافی حد تک دُور ہو سکے۔یہی وجہ ہے کہ ہر اکائی کا آغاز اغراض و مقاصد سے کیا گیا ہے تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اُس اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟ اُس کے بعد تمہید دی گئی ہے جس میں سبق کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔اکائی کے درمیان ''اپنے مطالعے کی جانچ'' کے تحت کچھ سوالات بھی دِیے گئے ہیں تاکہ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے اُسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے؟ اِس بات کا اندازہ ہو سکے۔اُن سوالات کے جوابات آخر میں دِیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود اُن سوالات کے جوابات دیں پھر آخر میں دِیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملالیں تاکہ آپ کو اپنی صلاحیت کا اندازہ ہو اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہو جائے۔امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اُس کے نمونے بھی دِیے گئے ہیں۔ساتھ ہی ہر اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کے معانی اور حوالہ جاتی کتب کے نام بھی دِیے گئے ہیں تاکہ آپ اُن کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں۔

ہم آپ کی کامیابی کے لئے دعائیں اور نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

بی.اے.اُردو
(B.A.URDU)
سالِ اوّل
FIRST YEAR
سمسٹر اوّل
FIRST SEMESTER
بی.اے. یو.ایل.(این.)-۱۰۱-غزل
BAUL(N) - 101, GHAZAL

اکائی نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
بلاک نمبر 01:			06
اکائی 1	اُردو غزل کی تعریف، ابتدا، مختصر تاریخ اور بنیادی خصوصیات	پروفیسر شارب ردولوی	07
اکائی 2	ولیؔ اورنگ آبادی	ڈاکٹر پرویز احمد	21
اکائی 3	سراجؔ اورنگ آبادی	ڈاکٹر اختر علی	36
بلاک نمبر 02:			51
اکائی 4	خواجہ میر دردؔ	ڈاکٹر صابر علی	52
اکائی 5	میر تقی میرؔ	ڈاکٹر صابر علی	65
اکائی 6	مرزا غالبؔ	ڈاکٹر مشتاق صدف	81
بلاک نمبر 03:			96
اکائی 7	آرزوؔ لکھنوی	ڈاکٹر پرویز احمد	97
اکائی 8	حسرتؔ موہانی	پروفیسر افغان اللہ	110
اکائی 9	عزیزؔ لکھنوی	پروفیسر محمود الحسن	124

بلاک نمبر 04:		**137**
اکائی 10 اصغرؔ گونڈوی	ڈاکٹر پرویز احمد	138
اکائی 11 جگرؔ مرادآبادی	ڈاکٹر ریشمہ پروین	152
اکائی 12 یگانہؔ چنگیزی	ڈاکٹر اختر علی	164
بلاک نمبر 05:		**177**
اکائی 13 فراقؔ گورکھ پوری	پروفیسر افغان اللہ	178
اکائی 14 مجروحؔ سلطان پوری	ڈاکٹر سرورالہدیٰ	192
اکائی 15 ناصرؔ کاظمی	ڈاکٹر مشتاق صدف	204

✵

بلاک نمبر 01

اکائی 01 اُردوغزل کی تعریف،ابتدا،مختصرتاریخ اوربنیادی خصوصیات

اکائی 02 وؔلی اورنگ آبادی

اکائی 03 سراؔج اورنگ آبادی

اکائی 01 : اُردوغزل کی تعریف،ابتدا،مختصرتاریخ اور بنیادی خصوصیات

ساخت

01.01 : اغراض ومقاصد
01.02 : تمہید
01.03 : غزل کی تعریف
01.04 : غزل کے اجزاے ترکیبی
01.05 : غزل کی مختصرتاریخ
01.06 : غزل کی بنیادی خصوصیات
01.07 : غزل کی زبان
01.08 : صنائع وبدائع
01.09 : خلاصہ
01.10 : فرہنگ
01.11 : نمونہ امتحانی سوالات
01.12 : حوالہ جاتی کتب
01.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

01.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ اردوغزل اوراس کی خصوصیات کاتفصیل سے مطالعہ کریں گے۔غزل کی تعریف،اس کے اجزاے ترکیبی،مختصر تاریخ،بنیادی خصوصیات،غزل کی زبان اوراس میں استعمال ہونے والی مختلف صنعتوں مثلاً تلمیح،لف ونشر،مبالغہ اورایہام کے علاوہ مضامینِ غزل پربھی روشنی ڈالی جائے گی۔زیرِنظر اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اردوغزل اوراس کی بنیادی خصوصیات سے واقف ہوجائیں گے جس سے آپ کوعام زندگی میں بھی غزل کوسمجھنے میں آسانی ہوگی۔جب غزل سمجھنے لگیں گےتوغزل سے آپ کی دل چسپی میں یقیناًاضافہ ہوگا۔

01.02 تمہید

غزل اردوشاعری کی بہت اہم صنف ہے۔اردوشاعری میں جومقبولیت غزل کوحاصل ہوئی وہ کسی دوسری صنف کونہیں ملی۔غزل کو پسند کرنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں اردونہیں آتی۔آپ کوغزل کی مقبولیت کاایک قصہ سناتا ہوں۔دودوست رات کے وقت باتیں کرتے چلے جارہے تھے کہ اچانک ایک دوست رک گیا۔دوسرے دوست نے دریافت کیا: کیابات ہے؟ پہلے دوست نے کہا کہ: غور

سے سنو! کوئی غالب کی غزل گا رہا ہے۔ دوسرے دوست نے کہا، ''غزل ہے تو واہ'' یعنی غزل ہر جگہ ہر صورت میں قابلِ تعریف ہے۔ اس طرح سبھی لوگ غزل کو پسند کرتے ہیں، کہیں مشاعرہ ہو تو ہزاروں کی تعداد میں لوگ غزلیں سننے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ ساری ساری رات غزلیں سنتے اور اپنی پسند کے شعر لکھ کر لاتے ہیں اور دوستوں کو سناتے ہیں۔

01.03 غزل کی تعریف

غزل عربی لفظ ہے جس کے معنی عورت یا محبوب سے باتیں کرنے کے ہیں لیکن ایک صنف کی حیثیت سے یہ عرب کی پیداوار نہیں ہے۔ عرب میں غزل صنفِ قصیدہ کا جز وتھی۔ قصیدے کے بیچ میں کبھی کبھی شعرا عاشقانہ اشعار شامل کر دیا کرتے تھے۔ ایران میں اسے قصیدے سے الگ کر کے ایک علاحدہ صنفِ سخن کی حیثیت دی گئی اور ایک آزاد صنفِ سخن کی حیثیت سے اسے ایسی مقبولیت اور ترقی ملی کہ وہ دوسری قدیم اصناف سے آگے نکل گئی۔ فارسی شعرا نے بھی غزل کو بے حد فروغ دیا۔ اردو میں غزل فارسی سے آئی اس لئے عام طور پر اس میں وہی عناصر ترکیبی اور صفات پائی جاتی ہیں جو فارسی غزل میں ملتی ہیں۔ غزل صرف معاملاتِ عشق تک محدود نہیں ہے۔ اس کا دامن رفتہ رفتہ وسیع ہوتا گیا اور زندگی کے مختلف مسائل اس میں جگہ پاتے گئے۔

01.04 غزل کے اجزاے ترکیبی

اجزاے ترکیبی، ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن سے مل کر غزل بنی ہے یا یوں کہیں کہ جو غزل کی پہچان ہیں اور جن کی کمی سے غزل مکمل نہیں ہوتی۔ مثلاً مطلع، حسنِ مطلع، مقطع، ردیف اور قافیہ وغیرہ

مطلع: مطلع غزل کے پہلے شعر کو کہتے ہیں۔ لیکن غزل کا پہلا شعر ہی مطلع نہیں ہوتا بلکہ مطلع کے لئے ضروری ہے کہ اس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہو اور اگر مردّف غزل ہے تو دونوں مصرعوں میں قافیہ اور ردیف ضروری ہیں۔

حُسنِ مطلع: کسی غزل میں دو مطلعے یا ایک سے زائد مطلعے ہوں تو اسے حسنِ مطلع کہتے ہیں۔ غزل میں مطلعوں کی تعداد مقرر نہیں۔ ایک سے زائد مطلعے بھی ہو سکتے ہیں لیکن عام طور پر ایک ہی مطلع ہوتا ہے۔ اب آپ سوال کریں گے کہ قافیہ اور ردیف کیا ہیں۔ یہ سوال ذہن میں آنا فطری بات ہے۔

قافیہ: قافیہ کے لئے آسان لفظ 'تُک' ہے۔ آپ اکثر کسی بات پر کہتے ہیں، کیا تک بٹھائی ہے۔ یعنی ایک طرح کے الفاظ لانا جیسے پیمانہ، افسانہ، دیوانہ یا شام، آرام، نام اور دام وغیرہ، اِن الفاظ کو قافیہ کہتے ہیں۔ اس طرح شاعر کسی بھی لفظ کو قافیہ بنا سکتا ہے مثلاً درج ذیل مطلع میں اعتبار اور انتظار قافیے ہیں:

غضب کیا، ترے وعدے کا اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا
(داغ)

ردیف: ردیف وہ لفظ یا الفاظ کا مجموعہ ہے جو مطلع کے دونوں اور باقی اشعار کے دوسرے مصرعوں میں قافیہ کے بعد لایا جائے۔ ردیف کے طور پر کسی بھی لفظ کا استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن پوری غزل میں اس کی پابندی لازمی ہوگی۔ مثلاً غالب کی غزل کا مطلع ہے:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اِس درد کی دوا کیا ہے

اور میرؔ کے شعر کا مطلع ہے:

ہو گئی شہر شہر رسوائی اے مری موت! تُو بھلی آئی

پہلے مطلع میں 'ہوا' اور 'دوا' قافیے ہیں اور ''کیا ہے'' ردیف ہے۔ دوسرا مطلع غیر مردف ہے یعنی اُس میں ردیف کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ 'رسوائی' اور 'آئی' اس میں قافیے ہیں۔

تعدادِ اشعار: غزل میں تعدادِ اشعار کی کوئی قید نہیں ہے لیکن عام طور پر غزل میں ۵/۷/۹/ یا ۱۱/ اشعار ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ اشعار کی غزلیں بھی شعرا نے لکھی ہیں۔ عام رواج مختصر غزلوں کا ہے۔ فراقؔ گورکھ پوری ان شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے طویل غزلیں لکھی ہیں۔

مقطع: غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص نظم کرتا ہے وہ مقطع کہلاتا ہے۔ مقطع میں شعرا نے اپنے تخلص سے خوب فائدہ اُٹھایا ہے۔ مومنؔ کا مقطع ہے:

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں مومنؔ نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم (مومنؔ)

اب تو جاتے ہیں بُت کدے سے میرؔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا (میر تقی میرؔ)

کیفیّتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سوداؔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں (محمد رفیع سوداؔ)

اس طرح غزل کے آخری شعر میں اگر شاعر نے تخلص نظم کیا ہے تو وہ مقطع کہلائے گا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ غزل کے کیا معنی ہیں؟

﴿۲﴾ حُسنِ مطلع کسے کہتے ہیں؟

﴿۳﴾ غزل کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟

01.05 غزل کی مختصر تاریخ

اردو ادب کی مختلف اصناف میں صنفِ غزل کے ارتقا کا سفر سب سے قدیم ہے۔ مؤرّخین کا خیال ہے کہ شمالی ہند کی مقامی زبان میں غزل گوئی کی ابتدا تیرہویں، چودھویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ یہ زمانہ امیر خسرو کا ہے۔ غزل کے اوّلین نقوش ہمیں امیر خسرو کے کلام میں ملتے ہیں اردو کی کئی غزلیں ان سے منسوب ہیں۔ ان کو اردو غزل کا پہلا شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ شمالی ہند میں امیر خسرو کے بعد جنوبی ہند کے صوفیا اور بادشاہوں نے اس کی سرپرستی کی۔ قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، علی عادل شاہ ثانی، وجہیؔ، غواصیؔ، عرفیؔ، نصرتیؔ، شاہیؔ، قاضی محمود بحریؔ اور شوقیؔ وغیرہ ایسے قابلِ ذکر شعرا ہیں جنھوں نے غزل کے نشو ونما میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ دَور غزل کا تشکیلی دَور ہے۔ قلی قطب شاہ اس دَور کا سب سے بڑا اور اہم شاعر ہے۔ اس کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تسلیم کیا گیا۔ دکن میں اردو شاعری لگ بھگ پونے تین سو سال تک ترقی کے مدارج طے کرتی رہی، اس درمیان شمالی ہند میں اردو شاعری خصوصاً غزل کے حوالے سے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ وجود میں نہیں آیا۔

اردوغزل کوترقی اور صحیح سمت دینے میں وؔلی دکنی نے بڑااہم رول ادا کیا۔انہوں نے غزل کے مضامین کووسعت دی اوراس میں نئے انداز پیدا کیے۔اردوغزل کوایک نیا رنگ اور نیالب ولہجہ عطا کیا۔ان کے بعض اشعار اتنے صاف اورآسان انداز میں لکھے گئے ہیں کہ ان پر آج کی زبان کا گمان ہوتا ہے۔وؔلی جب ۱۷۰۰ء میں دہلی آئے اوراپنے کلام کوساتھ لائے توان کے کلام سے متاثر ہوکر یہاں جوشاعری شروع ہوئی اس میں ایہام گوئی اور رعایتِ لفظی پرزیادہ زور دیا گیا۔سراج الدین علی خاں آرزو اورآغا قزلباش نے ایہام کے اشعار کہے۔ وؔلی کے دور کے دوسرے شعرا میں آبؔرو، حاتؔم ،مضموؔن، شاکرؔ ناجی اور یک رنگ وغیرہ نے اردوغزل کی روایت کوآگے بڑھایا۔ان شعرا میں سراج الدین خاں آرزؔو اورمظہؔر جانِ جاناں کے اردوغزل پر بڑے احسانات ہیں۔ایہام گوئی اوررعایتِ لفظی کی وجہ سے غزل میں معنویت اوراثرآفرینی کم ہوئی اورشاعری احساسات وجذبات کی صحیح ترجمانی کے بجائے لفظ اورمعنی کا گورکھ دھندا بن گئی۔

آرزؔو اورمظہؔر جانِ جاناں نے غزل کوایہام سے باہر نکالا۔غزل میں سادہ گوئی اورانسانی جذبات واحساسات کی ترجمانی پرزور دینے کا سہرا ان دونوں شعرا کے سرجاتا ہے۔ایہام گوئی کے خلاف سب سے پہلے مرزا مظہر جانِ جاناں نے آوز بلند کی۔اس کے بعد میؔر، دردؔ اورسوداؔ کا عہد آتا ہے۔یہ دوراردوغزل کا سنہرا دور ہے۔ان صاحبِ طرز شعرا نے غزل کے دامن کوبے حد وسیع کیا اوراس کونیا رنگ،روپ عطا کیا۔فنّی اعتبار سے غزل کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ان تینوں شعرا کی اپنی اپنی طرز تھی۔میؔر نے داخلیت کے تحت قلبی واردات واحساسات کی شاعری کی۔دردؔ نے صوفیانہ رنگ اپنایا اورتصوف کے رموز ونکات بیان کیے۔ان کی غزلوں میں عشق کی پاکیزگی اورروحانیت کی جلوہ گری ہے۔سوداؔ کی غزلیں رنگینی وسرمستی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ان کے یہاں خارجیت کا بہترین رنگ ملتا ہے۔انہوں نے دل کے بجائے دنیا کی باتیں اپنی غزلوں میں زیادہ کی ہیں۔اس دَور کے دیگر شعرا میں انعام اللہ خاں یقیؔن، میر اثؔر، میر سوزؔ اور قائؔم وغیرہ قابلِ ذکر غزل گوشعرا ہیں۔

دہلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ اردوشعروادب کا مرکز بنا۔لکھنوی شعرا میں انشاؔ، جرأتؔ، مصحفیؔ، ناسخؔ اور آتشؔ صفِ اول کے شعرا ہیں۔بیشتر لکھنوی شعرا نے لکھنوی ماحول میں رنگ کر شاعری کی۔ان شعرا نے معنی آفرینی وجذبات نگاری کے مقابلے میں لفظی زیبائش وآرائش پر زیادہ زور دیا جس سے غزل آورد، تکلف اورصنعت گری کا نمونہ بن کر رہ گئی۔البتہ مصحفیؔ اورآتشؔ نے اپنے آپ کوخالص لکھنوی انداز سے بچائے رکھا۔ان کے کلام میں پستی اورسطحی لذت کشی کم ہے۔ناسخؔ نے بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال کیا اورتشبیہات واستعارات میں شاعری کوگم کر دیا۔ان کی غزلیں اثرآفرینی سے محروم ہیں لیکن ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے زبان کی اصلاح کا کام کیا۔

میؔر، دردؔ اورسوداؔ کے بعد ایک لمبے عرصے تک دہلی بہترین غزل گوشعرا سے خالی رہی۔بعد میں غالبؔ، ذوقؔ اورمومنؔ نے دہلی میں غزل گوئی کو وقار بخشا۔ان شعرا نے غزل کوفکر وفن دونوں اعتبار سے متاثر کیا۔غالبؔ نے تفکر، ذوقؔ نے خارجیت اورمومنؔ نے غزل کوایک نیا اندازِ بیان بخشا۔غالبؔ نے فنی اعتبار سے غزل کو وسعت دیتے ہوئے اظہار کے نئے نئے وسیلے تلاش کیے۔پیچیدہ اورتہ دار جذبات کے اظہار کے لئے نئی نئی علامتوں اورانوکھی تشبیہوں اوراستعاروں کا استعمال کیا۔ذوقؔ کی غزلیں صاف ستھری، شگفتگی سے بھرپور اور شستہ لب ولہجہ لئے ہوئے ہیں۔مومنؔ کے یہاں حسن وعشق کا ایک نگارخانہ آباد ہے۔ان کی غزلیں، نازک خیالی، شگفتگی اورشوخیِ ادا میں اپنی مثال آپ ہیں۔اس کے علاوہ نصیرؔ دہلوی، بہادر شاہ ظفرؔ، منشی صدرالدین آزردہؔ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، انشاء اللہ خاں انشاؔ، داغؔ اورامیرؔ مینائی وغیرہ نے غزل کوآگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کا اثر نمایاں طور پر اردو شاعری پر پڑا۔ جس کی وجہ سے غزل کے موضوع اور ہیئت میں تبدیلی آئی۔ اگر چہ اس دور میں غزل کے بجائے نظم نگاری کو عروج حاصل ہوا، تاہم غزل نے اپنی اہمیت کو کم نہ ہونے دیا۔ اس نے ماحول اور مذاق کے مطابق اپنے آپ کو بدلا اور عشق و عاشقی کے مخصوص دائرے سے باہر نکل کر ان وسعتوں میں آئی جہاں سے وہ زندگی کے تلخ حقائق سے آنکھیں ملانے لگی۔ اس دور میں غزل کو نیا رنگ و آہنگ دینے اور اس کی آب یاری کرنے والوں میں حسرتؔ موہانی، اقبالؔ، عزیزؔ لکھنوی، آرزوؔ لکھنوی، شادؔ عظیم آبادی، ثاقبؔ لکھنوی، فانیؔ بدایونی، اصغرؔ گونڈوی، سیمابؔ اکبر آبادی، جگرؔ مراد آبادی اور یگانہؔ چنگیزی وغیرہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان شاعروں نے غزل کو روایتی انداز سے باہر نکالتے ہوئے اس کو اپنے عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور زندگی کے دیگر مسائل کو بھی غزل میں پیش کیا۔

ترقی پسند تحریک کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوتا ہے۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر غزل گو شعرا نے حقیقت پسندی پر زیادہ زور دیا۔ نئے نئے تجربات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اشاریت اور رمزیت کو استعمال کرتے ہوئے اس سے فائدہ اُٹھایا۔ فیض احمد فیضؔ، فراقؔ گورکھ پوری، علی سردار جعفری، ساحرؔ لدھیانوی، احمد ندیم قاسمیؔ، غلام ربانی تاباںؔ، معین احسن جذبیؔ، مجروحؔ سلطان پوری، کیفیؔ اعظمی، جگن ناتھ آزادؔ، مجازؔ، خلیل الرحمٰن اعظمی، روشن صدیقی اور ناصرؔ کاظمی وغیرہ قابلِ ذکر ترقی پسند غزل گو شعرا میں سے ہیں۔

۱۹۶۰ء سے جدیدیت اور مابعدِ جدیدیت کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں آزاد غزل اور اینٹی غزل کے مختلف تجربات کیے گئے۔ لسانی شکست و ریخت کا نعرہ بھی بلند کیا گیا، ذاتی کرب، روحانی بحران اور سنگین مسائل کو نئے انداز اور جدید رموز و علائم کے ساتھ ساتھ پیش کیا گیا۔ جدید غزل کو نئے نئے موضوعات اور نئے نئے انداز سے برتا جا رہا ہے۔ اس کو نئی رفعتوں، بلندیوں اور وسعتوں سے ہم کنار کرنے کی کوشش آج بھی جاری ہے۔ اس دور کے غزل گو شعرا میں سلطان اخترؔ، پروین شاکرؔ، اسعدؔ بدایونی، کوثر مظہری، طارق متین، شہپر رسول، عالم خورشید، وسیمؔ بریلوی، عرفان صدیقی، اسلم الٰہ آبادیؔ، مظہر امام، خورشید اقبال، احسنؔ رضوی، اصغرؔ گورکھ پوری، عادل منصوری، مصورؔ سبزواری، صدیقہ شبنم، ذکیؔ بلگرامی، پیرزادہ قاسم، فرحت احساس، نعمان شوق، خالد سعید، محسن زیدی، محمد علوی، قمر جمیل اور اعتماد صدیقی وغیرہ اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان شعرا اور ان کے علاوہ دیگر شعرا کی کوششوں سے اردو غزل پوری آب و تاب سے نئے نئے تجربات اور حوصلوں کے ساتھ ترقی کی راہ پر گام زن ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ اردو کا پہلا غزل گو شاعر کس کو کہا گیا؟

﴿۵﴾ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کون ہے؟

﴿۶﴾ ایہام گوئی کے خلاف سب سے پہلے کس شاعر نے آواز بلند کی؟

﴿۷﴾ اردو شاعری کا سنہرا دور کن شعرا کے دور کو کہا گیا ہے؟

﴿۸﴾ ترقی پسند تحریک کے پانچ نمائندہ غزل گو شعرا کے نام بتایئے؟

01.06 غزل کی بنیادی خصوصیات

غزل کی خصوصیات یا شناخت کو دوطرح سے بیان کیا جاسکتا ہے۔اول ظاہری صورت جس میں قافیہ، ردیف، مطلع، حسنِ مطلع اور مقطع وغیرہ ہیں۔دوسرے اس کی اندرونی ہیئت یعنی اس کے مضامین، زبان، تشبیہات اور استعارے جوغزل کوغزل بناتے ہیں۔غزل کے مضامین کے سلسلے میں یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ اس میں پیار، محبت یا معاملاتِ عشق کا ذکر زیادہ ہوتا ہے۔اردو کے مشہور شاعر فراؔق گورکھ پوری کی بھی یہی رائے ہے۔انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''غزل کے اشعار معاملاتِ حسن وعشق پر زیادہ مشتمل ہوتے ہیں۔''

(فراؔق گورکھ پوری بحوالہ اردو شاعری کا فنی ارتقا۔مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ص ۱۳)

لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ غزل میں صرف معاملاتِ حسن وعشق ہی ہوتے ہیں۔اصل میں غزل کی زبان کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔غزل میں ساری باتیں براہِ راست نہیں کہی جاتیں۔غزل کا حسن اس کی رمزیت اور ایمائیت میں ہے۔اس میں استعمال ہونے والے الفاظ مثلاً شمع، پروانہ، محفل، ساقی، گلشن، بہار، اسیری اور قفس عاشقانہ مفہوم کے الفاظ لگتے ہیں لیکن شاعران الفاظ کے پردے میں کچھ اور ہی کہتا ہے۔

غزل کی بنیادی خصوصیات میں اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر شعر معنی اور مفہوم کے اعتبار سے اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے یعنی غزل میں اگر پانچ یا سات اشعار ہیں تو وہ اپنے معنی میں ایک دوسرے سے الگ ہوں گے۔غزل کا ہر شعر اپنی جگہ پر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے مثلاً سحؔر بلرام پوری کی یہ غزل دیکھیے:

اندر کی تکلیف چھپانی پڑتی ہے — چہرے پر مسکان سجانی پڑتی ہے
تم کیا جانو وحشت کس کو کہتے ہیں — کیوں راتوں کی نیند گنواتی پڑتی ہے
ظلم ہمیشہ سہنے والی چیز نہیں — آخر کار آواز اُٹھانی پڑتی ہے
شعر نگاری کوئی کارِ سہل نہیں — سچ پوچھو تو جان لگانی پڑتی ہے
نقالی کی نحوست سے بچنے کے لئے — سب سے الگ پہچان بنانی پڑتی ہے

سحؔر بلرام پوری کی اس غزل کو آپ پڑھیں اور غور کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اس کا ہر شعر معنی کے اعتبار سے الگ ہے۔بعض ناقدین نے غزل پر اسی لئے اعتراض کیا کہ اس کے اشعار میں ربط نہیں ہوتا۔اعتراضات کرنے والوں میں ایک بڑا نام کلیم الدین احمد کا ہے، جن کا خیال ہے کہ غزل نیم وحشی صنفِ سخن ہے۔بعض شعرا نے ایسی غزلیں بھی کہی ہیں جن کے اشعار میں موضوع یا معنی کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ایسی غزلوں کو غزلِ مسلسل کہتے ہیں لیکن ایسی مثالیں عام نہیں ہیں۔

غزل کی بنیادی خصوصیات میں مضامین غزل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔غزل کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ان کا شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔شاعری یا ادب چوں کہ زندگی کا ترجمان ہوتا ہے، اس لئے زندگی کے بیش تر موضوعات پر غزل میں اشعار مل جاتے ہیں۔موضوعات یا مضامین کی تفہیم کے لئے انہیں چند خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے لیکن یہ تقسیم نامکمل ہی کہلائے گی۔یہاں پر غزل کے کچھ خاص مضامین رموضوعات کی مثالیں درج کی جارہی ہیں:

عاشقانہ:

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے ‏ اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے (میرؔ)
کیفیّتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سوداؔ ‏ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں (سوداؔ)
مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے ‏ آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم (شادؔ)
کس نے بھیگی ہوئی زلفوں سے یہ جھٹکا پانی ‏ جھوم کر آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی (آرزوؔ)
رنگ پیراہن کا خوشبو، زلف لہرانے کا نام ‏ موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام (فیضؔ)

زمانے کی شکایت:

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا ‏ کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا (دردؔ)
آیا جو اِس جہاں میں سو برباد ہی گیا ‏ نے جامِ جم نہ تختِ سلیمان رہ گیا (مصحفیؔ)
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ‏ ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے (دردؔ)

ہستی کی ناپائیداری:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے ‏ یہ نمائش سراب کی سی ہے (میرؔ)
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ ‏ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے (غالبؔ)
انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ ‏ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے (انیسؔ)
دار فانی میں یہ کیا ڈھونڈ رہا ہے فانیؔ ‏ زندگی بھی کہیں ملتی ہے فنا سے پہلے (فانیؔ)

صوفیانہ شاعری:

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا ‏ ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا (دردؔ)
نہ کعبہ جا نہ بت خانہ، جو آنا ہو تو دل میں آ ‏ کہیں اللہ کا جلوہ نہیں، اور ہے تو اِس گھر میں (شادؔ)
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ‏ ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا (غالبؔ)

☆☆☆☆☆

01.07 غزل کی زبان

اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے کہ غزل میں گفتگو اشارے اور کنایے میں کی جاتی ہے۔جس کا مقصد اظہار کو پر اثر اور دل کش بنانا ہوتا ہے۔زبان میں خوب صورتی پیدا کرنے کے لئے شاعروں نے تشبیہ، استعارے اور کنایے وغیرہ سے کام لیا۔جس سے زبان کی خوب صورتی کے ساتھ معنی میں بھی نئے نئے پہلو پیدا ہوئے ہیں۔غزل اگر ایک طرف بہت آسان، صاف اور سادہ زبان میں ملتی ہے تو دوسری طرف یہ تشبیہ واستعارے سے بھی آراستہ ہے جس نے غزل کو ہر خاص وعام میں مقبول بنایا ہے۔

مثلاً یہ شعر دیکھیں۔

سرہانے میؔر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

یا

اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی
آپ کے پاؤں کے نیچے دِل ہے

یہ اشعار زبان کی سادگی میں اپنی آپ مثال ہیں۔اسی طرح شعرانے غزل میں زمانے کے حالات اور انتشار کو بہت سادہ لیکن پر اثر انداز میں پیش کیا ہے جس سے غزل کی زبان کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مثلاً خواجہ حیدر علی آتشؔ کا شعر ہے ؎

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

یا میر انیسؔ کا شعر ہے ؎

بازار بند ہوگئے ، جھنڈے اُکھڑ گئے
فوجیں ہوئیں تباہ ، محلے اُجڑ گئے

ان اشعار میں دونوں شاعروں نے اپنے عہد کی تباہی و بربادی کو پیش کیا ہے۔اس طرح کے اور بھی اشعار مثال میں دیے جا سکتے ہیں جن میں کسی استعارے اور کنایے کے بجائے واقعے کو صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے۔غزل کا لطف اور اس کا حسن تشبیہات و استعارات اور صنائع میں پوشیدہ ہے۔غزل کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ بڑی سے بڑی بات اشاروں اشاروں میں کہہ دی جاتی ہے۔غزل میں یہ کام شاعر تشبیہ، استعارے اور صنعتوں سے لیتا ہے۔اسی لئے رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ ’’غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔‘‘

01.08 صنائع و بدائع

صنائع و بدائع کا استعمال شعر کی لفظی و معنوی وسعت اور دل کشی کے لئے کیا جاتا ہے۔ان کی بہت سی قسمیں ہیں اور شعرانے ان کے استعمال میں فن کاری کے ایسے جوہر دکھائے ہیں جو کسی دوسری زبان میں مشکل سے ملیں گے۔صنائع دو طرح کے ہوتے ہیں ایک صنائعِ لفظی اور دوسرے صنائعِ معنوی۔صنائعِ لفظی کا تعلق الفاظ کے استعمال سے ہے مثلاً ہم معنی الفاظ کا استعمال جیسے صبا اور سبا یا ذو معنی الفاظ کا استعمال جیسے چارہ گر اور چارہ وغیرہ۔شعرانے زبان اور الفاظ کے استعمال میں ہمیشہ نئے نئے گوشے پیدا کیے ہیں جس کی بہت اچھی مثالیں صنائعِ معنوی میں نظر آتی ہیں۔صنائعِ معنوی کا تعلق معنوی خوبیوں سے ہوتا ہے جس میں شاعر الفاظ کے استعمال سے نئے معنوی نکات پیدا کرتا ہے۔یہاں پر تعارف کے طور پر صنائعِ لفظی و معنوی کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں:

صنعتِ تلمیح: صنعتِ تلمیح اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں کسی مشہور واقعے، شخص یا کردار کی طرف اشارہ ہو۔تلمیح کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک لفظ سے پورا واقعہ سامنے آجاتا ہے۔مثلاً غالبؔ کا مشہور شعر ہے ؎

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ابنِ مریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جنہیں خدا نے معجزہ عطا کیا تھا کہ وہ بیماروں کو اچھا اور مُردوں کو زندہ کر سکتے تھے۔ اس شعر میں غالبؔ ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس صنعت سے شعرا نے طرح طرح سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بعض شعرا نے اپنے عہد کے حالات کو پیش کرنے کے لئے تلمیح کا سہارا لیا ہے، مثلاً اقبالؔ کا شعر ہے۔

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

اس شعر میں 'ابراہیم' اور 'نمرود' تلمیح کے الفاظ ہیں جو اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ نمرود نے دہکتی ہوئی آگ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ڈلوا دیا تھا۔ اقبالؔ اس واقعے کے حوالے سے کہتے ہیں کہ آج پھر وہی صورتِ حال ہے کہ اولادِ ابراہیم علیہ السلام کو نمرود جیسے ظالم و جابر حکمراں کا سامنا ہے۔ کیا خدا کو پھر امتحان مقصود ہے۔

صنعتِ لف ونشر: لف کا معنی لپیٹنا اور نشر کا معنی پھیلانا ہے۔ شعر کے پہلے مصرعے میں چند چیزوں کو بیان کیا جائے پھر دوسرے مصرعے میں اُن چیزوں کے متعلقات کا ذکر کیا جائے تو اُس کو صنعتِ لف ونشر کہیں گے مثلاً۔

تیرے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار
گل جدا، سرو جدا، نرگسِ بیمار جدا

اس شعر میں رخسار کے تعلق سے گل، قد کے تعلق سے سرو اور چشم کے تعلق سے نرگسِ بیمار کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ان الفاظ میں ایک معنوی ربط بھی ہے۔ دوسرے یہ لف ونشر کے ساتھ استعارے کا لطف بھی دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے۔

ابرو نے، مژہ نے، نگہِ یار نے، یارو
بے رتبہ کیا تیغ کو، خنجر کو، سناں کو

صنعتِ مبالغہ: کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کو مبالغہ کہتے ہیں۔ اردو اصنافِ سخن میں مبالغے کو سب سے زیادہ قصیدے میں جگہ ملی ہے۔ مبالغہ شاعری میں ایک صنعت ضرور ہے لیکن اگر مبالغہ حد سے بڑھ جائے تو ذہن اس کو قبول نہیں کرتا۔ حالاں کہ شاعر کی شعری مہارت اور زبان پر اس کی قدرت کا اندازہ اس کی مبالغہ آرائی سے ہوتا ہے۔ سوداؔ کا ایک شعر ہے۔

جوشِ روئیدگیِ سبزہ سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گاوِ زمیں کے بھی جو پھوٹے کونپل

سوداؔ کہتے ہیں کہ بہار کا ایسا جوش ہے کہ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ سبزے کی روئیدگی کی اس شدت کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کہیں اس گائے کی سینگ میں بھی کونپل نہ نکل آئے جس پر یہ دنیا ٹکی ہے۔ اس میں زبان پر قدرت اور لطف بھی ہے لیکن حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب ایک شعر ایسا دیکھیے جس میں مبالغہ تو ہے لیکن ذہن اسے گرمی کی شدت کی تصویر کشی سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر
(میر انیسؔ)

میر انیسؔ نے اس شعر میں مبالغے کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ وہ مبالغہ نہیں محسوس ہوتا ہے۔

ایہام: ایہام کا معنی دھوکے میں ڈالنا ہے۔ یعنی ایسے لفظ کا استعمال جس کے دو معانی ہوں۔ ایک قریب کا معنی اور ایک دُور کا، سامع اور قاری قریب کا معنی سمجھیں جب کہ شاعر دور کا معنی مراد لے۔ اس زمانے میں یہ صنعت بہت مقبول تھی لیکن بعد کے شعرا نے اسے ناپسندیدہ قرار دیا لیکن اس کے باوجود اس کی مثالیں اکثر شعرا کے یہاں مل جاتی ہیں۔ دیا شنکر نسیمؔ کا شعر ہے۔

مے کش کو ہوس ایاغ کی ہے
پروانے کو لو چراغ کی ہے

''لو'' کے معنی 'شعلے' کے ہیں۔ شمع کی لو، چراغ کی لو ہم برابر استعمال کرتے ہیں لیکن لو کے ایک معنی محبت اور آرزو کے بھی ہیں جیسے کہتے ہیں اسے اللہ سے لو لگی ہے۔ لو لگنا یعنی کسی کی محبت میں گرفتار ہونا۔ یہاں پر شاعر کی مراد پروانے کی چراغ سے محبت ہے۔ جس محبت میں وہ چراغ پر قربان ہو جاتا ہے۔

تشبیہ: تشبیہ ایک عام لفظ ہے۔ انگریزی میں اسے ''**Simile**'' اور ہندی میں ''اپما'' کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کے بارے میں کسی دوسری چیز کے ذریعے مثال دینا یا مشابہت تلاش کرنا۔ میرؔ کا شعر ہے۔

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اس شعر میں میرؔ نے محبوب کے ہونٹوں کی نزاکت کی مثال گلاب کی پنکھڑی سے دی ہے۔ اسی مشابہت کو تشبیہ کہتے ہیں۔ اس تشبیہ نے شعر کا لطف دوبالا کر دیا ہے۔ تشبیہ کی کچھ مثالیں دیکھیے۔

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا جادو ہیں ترے نین غزالاں سے کہوں گا (ولیؔ دکنی)

اُڑی آتی ہیں آج بھی آنکھیں جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں (میرؔ)

نام بھی لینا ہے جس کا اک جہانِ رنگ و بو دوستو! اُس نو بہارِ ناز کی باتیں کرو (فراقؔ)

استعارہ: استعارہ بھی تشبیہ کی طرح شعر کی دل کشی اور تاثر میں اضافہ کرتا ہے۔ استعارہ کا معنی اُدھار لینا ہے یعنی اس میں کسی کی صفات کو اُدھار لیا جاتا ہے۔ استعارے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ شعر میں تہ داری اور معنی میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ تشبیہ میں ایک چیز سے دوسری چیز کی مثال دی جاتی ہے جب کہ استعارے میں صفت کی بنا پر اس کو وہی چیز ٹھہرایا جاتا ہے۔ اصطلاحی الفاظ میں کہا جائے گا کہ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ کی مشابہت دکھائی جاتی ہے اور استعارے میں مشابہت کے بجائے مشبہ کو ہی مشبہ بہ قرار دیا جاتا ہے اور انہیں مستعار لہ اور مستعار منہ کہتے ہیں۔ نثر میں اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ کسی کی بہادری کے بارے میں اگر کہا جائے کہ ''اکبر شیر ہے'' تو یہاں پر اکبر مستعار لہ ہے اور شیر جسے استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا مستعار منہ ہے۔ مثلاً

ہیں یاد وہ بے مثال آنکھیں
کیا ہیں وہ تیری غزال آنکھیں

اس شعر میں محبوب کے لئے غزال کا لفظ استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔اس کی چنداور مثالیں درج ذیل ہیں:

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک (غالبؔ)

باغ باں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے (ثاقبؔ)

تشبیہ اور استعارے کی بہت سی قسمیں ہیں۔ یہاں پر صرف استعارے کے بنیادی مفہوم کو پیش کیا گیا ہے۔شعرا نے عام طور پر جن الفاظ کو استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے ان میں کچھ مخصوص طرح کے الفاظ ہیں جنہیں کئی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔مثلاً چمن یا باغ سے متعلق استعارے، جس میں گلشن، بہار، غنچہ، خزاں، سرو، بلبل، گل چیں، صیاد، سبزہ اور شبنم وغیرہ شامل ہیں۔بعض استعاروں کا تعلق مے کدے سے ہے مثلاً شراب، ساقی، مے خانہ، جام، شیشہ، سبو، ساغر اور اسی طرح بعض دوسرے موضوعات سے متعلق استعارے ملتے ہیں۔ جیسے بزم، شمع، پروانہ، چراغ اور قفس وغیرہ۔

کنایہ: اشارے میں کوئی بات کرنے کو کنایہ کہتے ہیں۔ یہ بھی تشبیہ و استعارے کی طرح شعر کے معنی کو وسعت دیتا ہے اور اس کو دل کش و خوب صورت بناتا ہے۔کنایہ دراصل وہ لفظ یا الفاظ ہیں جن سے ان کے اصل معنی بھی مراد لئے جا سکتے ہیں لیکن اس کا خاص لطف حقیقی معنی میں ہی آتا ہے۔مختصر الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کنایہ چھپے ہوئے معنی یا پوشیدہ بات کی طرح اشارہ ہے۔غالبؔ کا شعر ہے۔

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
وہ نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا
(غالبؔ)

یہاں غالبؔ نے ''نگارِ آتشیں رُخ'' سے سورج مراد لیا ہے یعنی یہ کنایہ ہے سورج کا جو صبح مشرق سے نمودار ہوتا ہے۔آتشؔ کا شعر ہے۔

گیسوؤں کا ترے سودا شعرا رکھتے ہیں
یہی باعث ہے جو وہ فکرِ رسا رکھتے ہیں
(آتشؔ)

شعرا نے ہمیشہ محبوب کی زلفوں کی لمبائی کا ذکر کیا ہے یہاں آتشؔ اسے فکرِ رسا کے کنایے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔کنایے کی چند اور مثالیں درج ذیل ہیں۔

تصویر کھینچی اس نے رخِ سرخ فام کی
اک صفحہ میں قلم نے، گلستاں تمام کی
(آتشؔ)

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
(میرؔ)

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۹﴾ تلمیح کسے کہتے ہیں؟ مثال کے ساتھ لکھیے۔

﴿۱۰﴾ صنعتِ لف ونشر کی مثال دیجیے۔

﴿۱۱﴾ یہام کے کیا معنی ہیں؟

﴿۱۲﴾ تشبیہ کسے کہتے ہیں؟

﴿۱۳﴾ استعارے کی تعریف لکھیے اور اس کی مثال دیجیے۔

﴿۱۴﴾ کسی شعر میں کنایہ کی نشان دہی کیجیے۔

01.09 خلاصہ

اس اکائی میں غزل کے بارے میں بیش تر اہم باتوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس میں غزل کی تعریف، اجزاے ترکیبی، مختصر تاریخ، بنیادی خصوصیات، زبان، صنائع وبدائع اور اس کے مضامین سے بحث کی گئی ہے۔ جہاں تک غزل کی خصوصیات یا مضامین کا تعلق ہے، وہ زندگی کے مسائل وموضوعات کی طرح بے حساب ہیں۔ ہمارے احساسات، جذبات اور مشاہدات کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہوگا جس پر ہمیں غزل کے اشعار نہ مل جائیں لیکن اس اکائی میں اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ زبان یا اس سے متعلق صنائع وبدائع کے اہم نکات سے واقفیت ہو سکے۔اسی لئے صنائع وبدائع اور تشبیہ واستعارے کی تعریف وتشریح کردی گئی ہے جو بار بار غزل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

01.10 فرہنگ

ابہام	:	مبہم، جس کے معنی نہ سمجھ میں آئیں	کوتاہ	:	چھوٹا
اصطلاح	:	عام معنی کے علاوہ کوئی اور معنی	مرقع	:	تصویر
ایمائیت	:	اشاروں اشاروں میں	مستعارلہ	:	جس کے لئے کوئی استعارہ لایا جائے جیسے 'محبوب'
تیغ	:	تلوار			
درماں	:	علاج	مستعارمنہ	:	جس چیز کو استعارے کے طور پر استعمال کیا جائے جیسے 'غزال'
رمزیت	:	چھپا کر، پوشیدگی			
روئیدگی	:	پیدا ہونا، اُگنا	مشابہت	:	ایک جیسا ہونا
سبحہ	:	تسبیح	مشبہ	:	جس چیز کو کسی چیز سے تشبیہ دی جائے جیسے ''محبوب کے لب''
سبو	:	گھڑا، ٹھہرانا، مٹکا			

سخن	: شاعری	مشبہ بہ	: جس چیز سے تشبیہ دی جائے جیسے ''گلاب کی پنکھڑی''
سناں	: برچھی		
صفات	: خوبیاں (صفت کی جمع)	مشتمل	: شامل
صنعت	: شاعری کی قسم	مقطع	: غزل کا آخری شعر
طاق	: وہ عدد جو اکیلا ہو جیسے ۳/۵/۷/وغیرہ	ناقدین	: تنقید کرنے والے
طویل	: لمبی	نکو	: حسین، خوب صورت، نیک
عناصر	: اجزا (عنصر کی جمع)	ہیئت	: شکل
فروغ	: ترقی		

01.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰۔۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : غزل کی تعریف لکھیے اور اس کے اجزاے ترکیبی پر روشنی ڈالئے۔

سوال نمبر۲ : غزل کی خصوصیات بیان کیجیے۔

سوال نمبر۳ : غزل کے موضوعات پر روشنی ڈالئے۔

سوال نمبر۴ : صنعتِ تلمیح اور صنعتِ لف ونشر کی تعریف مثالوں کے ساتھ بیان کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰۔۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : حسنِ مطلع کسے کہتے ہیں؟

سوال نمبر۲ : صنائع وبدائع کی تعریف مثالوں کے ساتھ تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۳ : کنایہ کو مثالوں کے ساتھ واضح کیجیے۔

سوال نمبر۴ : غزل کی مختصر تعریف اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

01.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو غزل از یوسف حسین خاں

۲۔ اردو غزل از ڈاکٹر کامل قریشی

۳۔ اردو ادب کے پچاس سال از عبدالاحد خاں خلیل

۴۔ درسِ بلاغت از ترقی اردو بورڈ

۵۔ غزل اور مطالعۂ غزل از عبادت بریلوی

01.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

(۱) غزل عربی لفظ ہے جس کے معنی عورت یا محبوب سے باتیں کرنے کے ہیں۔

(۲) کسی غزل میں ایک سے زائد مطلع ہوں تو اسے حسنِ مطلع کہتے ہیں۔

(۳) غزل کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ مطلع، حسنِ مطلع، قافیہ، ردیف، تعدادِ اشعار، مقطع۔

(۴) امیر خسرو

(۵) قلی قطب شاہ

(۶) مرزا مظہر جانِ جاناں

(۷) میرؔ، دردؔ اور سوداؔ

(۸) ا۔فیض احمد فیضؔ ۲۔ساحرؔ لدھیانوی ۳۔کیفیؔ اعظمی ۴۔مجروحؔ سلطان پوری ۵۔مجازؔ

(۹) کسی مشہور واقعے، شخص یا کردار کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔ مثلاً ؎

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے　　کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے　　(اقبالؔ)

(۱۰) صنعتِ لف ونشر کی مثال ؎

ابرو نے، مژہ نے، نگہ یار نے یارو　　بے رتبہ کیا تیغ کو، خنجر کو، سناں کو

(۱۱) ایہام کا معنی دھوکے میں ڈالنا ہے۔ یعنی شعر میں ایسے لفظ کا استعمال کرنا جس کے دو معنی ہوں ایک قریب کا معنی اور ایک دور کا یعنی چھپا ہوا معنی، سامع و قاری قریب کا معنی سمجھیں جب کہ شاعر چھپا ہوا معنی مراد لے۔

(۱۲) کسی چیز کے بارے میں کسی دوسری چیز کے ذریعے مثال دینا یا مشابہت تلاش کرنے کو تشبیہ کہتے ہیں۔

(۱۳) استعارے کے معنی 'مستعار' لینے یا مانگ لینے کے ہیں یعنی اس میں کسی کی صفات کو مستعار لیا جاتا ہے۔
اصطلاح میں کہا جائے گا کہ استعارے میں مشابہت کے بجائے مشبہ کو ہی مشبہ بہ قرار دیا جاتا ہے اور انہیں مستعار لہ اور مستعار منہ کہتے ہیں۔ مثلاً ؎

ہیں یاد وہ بے مثال آنکھیں　　کیا ہیں وہ تیری غزال آنکھیں

(۱۴)

صبح آیا جانبِ مشرق نظر　　وہ نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا　　(غالبؔ)

یہاں پر غالبؔ نے ''نگارِ آتشیں رُخ'' سے سورج مراد لیا ہے یعنی یہ کنایہ ہے سورج کا جو صبح مشرق سے نمودار ہوتا ہے۔

اکائی 02 : ولی محمد ولؔی اورنگ آبادی

ساخت

02.01 : اغراض ومقاصد
02.02 : تمہید
02.03 : ولؔی اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی
02.04 : ولؔی اورنگ آبادی کی شاعرانہ خصوصیات
02.05 : ولؔی اورنگ آبادی کی پہلی غزل
02.06 : ولؔی اورنگ آبادی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
02.07 : ولؔی اورنگ آبادی کی دوسری غزل
02.08 : ولؔی اورنگ آبادی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
02.09 : خلاصہ
02.10 : فرہنگ
02.11 : نمونہ امتحانی سوالات
02.12 : حوالہ جاتی کتب
02.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

02.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ولؔی اورنگ آبادی کی حیات اور شخصیت کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جائے گا اور ولؔی کی شاعرانہ خصوصیات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ولؔی کی دونوں غزلوں پر مجموعی تبصرے کے ساتھ تمام اشعار کی تشریح بھی عام فہم زبان میں پیش کی جائے گی۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ ولؔی کی شخصیت، شاعری، جمالیات، زبان اور ان کے رنگ وآہنگ سے خاطر خواہ واقف ہوسکیں گے۔

02.02 تمہید

ولؔی اورنگ آبادی کو اردو شاعری کا باوا آدم تصوّر کیا جاتا ہے۔ وہ اردو شاعری میں ایک طرزِ خاص کے موجد ہیں۔ ولؔی سے قبل اردو شاعری کی روایت دکن میں ملتی ہے۔ جب کہ شمالی ہند میں فارسی شاعری کا چرچا تھا۔ ولؔی نے اردو غزل کو شمالی ہند میں رواج دے کر نہ صرف اردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا بلکہ اردو شاعری میں شمال اور جنوب کو ملانے کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہے۔ ولؔی جمال پرست شاعر ہیں۔ اسی لئے حُسن وعشق ان کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض اہم انسانی صفات مثلاً قناعت پسندی، ہم دردی، محبت و

اخلاص اور اُخوت و بھائی چارگی کا درس دے کر اپنی شاعری میں تصوّف کا رنگ بھر دیا ہے۔ ان کے یہاں کیف و سرور کی کیفیت بھی نظر آتی ہے اور زبان و بیان کا لطف بھی۔ ان سب سے بڑھ کے ولؔی نے دکنی غزل کی اہم خصوصیت یعنی حقیقت پسندی کی روایت کو آگے بڑھا کر دکنی شاعری کو جلا بخشی ہے۔ ان کی شاعری کے مذکورہ اوصاف، اردو شاعری میں آج بھی انہیں زندہ و پائندہ بنائے ہوئے ہیں۔

02.03 ولؔی اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی

ولؔی اورنگ آبادی کی تاریخِ پیدائش، مقام اور نام کے سلسلے میں محققین میں اختلاف ہے۔ بعض کے مطابق ولؔی گجراتی ہیں تو بعض ان کو اورنگ آبادی مانتے ہیں لیکن سبھی اس بات سے اتّفاق کرتے ہیں کہ وہ ۱۶۶۸ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا نام ولی محمد اور تخلّص ولؔی تھا۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں حاصل کی اور بعد میں احمد آباد میں شاہ وجیہ الدّین کی خانقاہ میں اس کو مکمل کیا۔ یہیں شاہ نورالدّین سہروردی کے مرید ہوئے۔ ولؔی اورنگ آباد کو چھوڑ کر گجرات کیوں گئے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> ''اورنگ زیب عالم گیر کی جنگی کارروائیوں نے سارے دکن اور خصوصاً اس کے صدر مقام اورنگ آباد کو ایک میدانِ کارزار بنا دیا تھا۔ ولؔی نے جب اس شہر میں آنکھ کھولی تو اس آشوبِ قیامت کو دیکھا اور جنگ کے جو اثرات ہوتے ہیں ان کو شدّت سے محسوس کیا۔ اس صورتِ حال سے نجات پانے کے لئے ولؔی نے احمد آباد گجرات کی طرف ہجرت کی اور وہاں ان کے مرشدِ کامل حضرت شاہ نورالدّین سہروردی سے وابستگی اور حضرت شاہ وجیہ الدّین کے مدرسے کی فضا نے ان کے لئے آغوشِ مادر کا کام کیا اور وہ یہیں کے ہو رہے۔''

ولؔی نے ایک بزرگ زادے ابوالمعالی کے ساتھ ۱۱۱۲ھ مطابق ۱۷۰۰ء میں دہلی کا سفر کیا تو دیکھا کہ وہاں فارسی زبان میں شاعری کا رواج ہے۔ بیدلؔ، خان آرزؔو، سعداللہ گلشنؔ، فراقؔ، ندیمؔ اور فطرت وغیرہ اس وقت فارسی میں شاعری کر رہے تھے۔ شمالی ہند میں اردو کا چلن ضرور تھا مگر شعر و ادب کے لئے فارسی کو ہی معیاری زبان سمجھا جاتا تھا۔ جب ولؔی کا دیوان دہلی پہنچا اور ولؔی نے سعداللہ گلشنؔ کے مشورے پر اپنی زبان میں فارسی زبان کے الفاظ کو استعمال کر کے ایک نیا طرز اختیار کیا تو دیکھتے ہی دیکھتے اس نئی زبان کے چرچے شمالی ہند میں بھی عام ہونے لگے۔ ولؔی کی زبان سے متاثر ہو کر نہ صرف ان کے ہم عصر بلکہ بعد کے شعرا نے بھی ان کی زمینوں میں شاعری کی اور اپنے کلام میں ان کی عظمت کا اعتراف بھی کیا۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن میں ولؔی کی زمینوں میں اس عہد کے شعرا کا کلام ملتا ہے۔

ولؔی	: روح بخشی ہے کام تجھ لب کا	دمِ عیسیٰ ہے نام تجھ لب کا
آبرؔو	: مست دل ہے مدام تجھ لب کا	جامِ صہبا ہے نام تجھ لب کا
ولؔی	: بات میٹھی ترے لباں کی صنم	حد انگیز شہد و شکر ہے
حاتؔم	: حق میں عاشق کے تجھ لباں کا بچن	قند ہے نیشکر ہے شکر ہے
ولؔی	: خوب رُو خوب کام کرتے ہیں	یک نگہ میں غلام کرتے ہیں
فائزؔ	: جب سجیلے خرام کرتے ہیں	ہر طرف قتلِ عام کرتے ہیں

وؔلی : کیا ہو سکے جہاں میں ترا ہم سَر آفتاب تجھ حسن کی اگن کا ہے یک اخگر آفتاب

میرؔ : مُنہ دھوتے اس کے آتا تو ہے اکثر آفتاب کھاوے گا آفتابہ کوئی خود سر آفتاب

شمالی ہند کے اکثر شعرا وؔلی کی شاعری سے متاثر نظر آتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کی عظمت کا اعتراف بھی بعض کے کلام میں ملتا ہے۔مثلاً:

میرؔ : خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے سے معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن تھا

حاتمؔ : حاتم یہ فنِ شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں لیکن وؔلی ولی ہے جہانِ سخن کے بیچ

آبروؔ : آبرو شعر ہے ترا اعجاز پر وؔلی کا سخن قیامت ہے

غرض وؔلی کے کلام کی مقبولیت سے شمالی ہند میں غزل گوئی کی راہ ہموار ہوئی اور بعد میں آنے والوں نے ان سے متاثر ہو کر صنفِ غزل کو ترقّی کی راہ پر گام زَن کیا۔وؔلی نے کم وبیش تمام اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کے مطبوعہ کلّیات میں غزلیں،مثنویاں، رباعیات،مستزاد،مخمّس ترجیع بند اور قطعات وغیرہ شامل ہیں لیکن غزل ان کی محبوب ترین صنف ہے۔اسی لئے انہوں نے اسی میں اپنی فکرِ رسا کے جوہر دکھائے ہیں۔اردو ادب کا یہ تابندہ ستارہ ۷۰۷اء میں خالقِ حقیقی سے جاملا۔ان کا مزار احمد آباد میں نیلی گنبد کے قریب مزارِ موسیٰ ساگ اور شاہی باغ کے درمیان موجود ہے۔

وؔلی نازک خیال اور حد درجہ حسّاس انسان تھے۔وہ فطرتاً ملنسار واقع ہوئے تھے۔محبت ان کا مسلک تھا۔خاص طور پر صوفیاے کرام اور بزرگانِ دین سے انہیں گہری عقیدت تھی اور وہ ان سے والہانہ محبت رکھتے تھے اور جو لوگ وؔلی کے مزاج سے واقف تھے وہ ان سے بے اختیار محبت کرتے تھے۔غرض اپنے ہم عصر شعرا،اُمرا اور دوست،احباب سب سے وؔلی کا برتاؤ نہایت مخلصانہ ہوتا تھا۔ڈاکٹر عبادت بریلوی وؔلی کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وؔلی خاصے ملنے جلنے والے آدمی تھے۔ان کے احباب کا حلقہ خاصا وسیع تھا اور بعضوں سے تو ان کی محبت عشق کی سرحدوں میں داخل ہوگئی تھی۔ (وؔلی اورنگ آبادی،ص.۲۹)

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ وؔلی کا پورا نام کیا تھا؟

﴿۲﴾ وؔلی اورنگ آبادی کہاں پیدا ہوئے تھے؟

﴿۳﴾ وؔلی کس پیر کے مرید تھے؟

02.04 وؔلی اورنگ آبادی کی شاعرانہ خصوصیات

وؔلی نے تمام اصنافِ سخن،غزل،مثنوی،رباعی،مستزاد،مخمّس ترجیع بند اور قطعہ وغیرہ میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی شہرت ان کی غزلوں کے سبب سے ہی ہے۔ان کی غزلیں سادگی،سلاست،شیرینی وترنّم،کیف وسرور اور تاثر کی بدولت اپنی انفرادی شان رکھتی ہیں۔ان کے کلام کی سب سے اہم خوبی ان کی زبان کی صفائی اور سادگی ہے۔دکنی شاعر ہونے کے باوجود ان کے یہاں دکنی الفاظ کا استعمال بہت کم ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات کی ترجمانی کے لئے نہایت آسان اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔مثال کے لئے چند اشعار پیش ہیں:

یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا　　ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
جسے عشق کا تیر کاری لگے　　اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
خوب رو خوب کام کرتے ہیں　　یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

ولؔی کی غزلوں میں ہمیں حقیقت پسندی بھی ملتی ہے، حسن وعشق کے جلوے بھی نظر آتے ہیں اور تصوّف کا رنگ بھی۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو ولؔی کی غزلوں کو مقبول بناتی ہیں۔ آیئے اب ان کی غزل گوئی کی خصوصیات کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں۔

حقیقت پسندی:۔ دکنی غزل کی سب سے اہم خصوصیت حقیقت پسندی ہے۔ قدیم دکنی شاعروں کی طرح ولؔی بھی ایک حقیقت پسند شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے، وہ ہندوستانی تہذیب ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں تشبیہات واستعارات اور تلمیحات کے ذریعے ہندوستانی ماحول کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ انہوں نے ہندوستانی تہذیب وتمدّن اور یہاں کے پھلوں، پھولوں، شہروں، باغوں، موسموں، پرندوں، جانوروں، دریاؤں، بہاروں اور تہواروں وغیرہ کا ذِکر کرکے نہ صرف یہ کہ دکنی شاعری کی روایت کی پیروی کی ہے بلکہ اردو شاعری کو اس کی بنیاد سے جوڑنے کا کام بھی کیا ہے جو شمالی ہند کی شاعری میں ۱۷۰۰ء کے بعد پروان چڑھی۔

شمالی ہند کی اس وقت کی شاعری میں مرصّع نگاری اور تصویر کشی کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس ولؔی کی شاعری میں ہمیں حقیقت پسندی کا رجحان ملتا ہے۔ چند اشعار بطور مثال دیکھیں:

کوچۂ یار عین کاسی ہے　　جوگیِ دل وہاں کا باسی ہے
اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال　　ہندوے ہردوار باسی ہے
زلف تیری ہے موج جمنا کی　　تِل نزک اس کے جیوں سناشی ہے

☆

تری زلفاں کے حلقے میں اَہے یوں نقشِ رُخ روشن　　کہ جیسے ہند کے بھیتر لگیں دیوے دوالی میں
جودھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم!　　ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج
اس رین اندھاری میں مت بھول پڑوں تس سوں　　ٹک پاؤں کے جھانجھر کی جھنکار سناتی جا

مذکورہ بالا اشعار سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ولؔی کے یہاں ہندوستانی عناصر اور مقامی ماحول کی جھلک کس قدر رچی بسی ہوئی تھی۔

تصوّف:۔ دکنی غزل کی دوسری اہم خصوصیت حُسن وعشق کا بیان ہے۔ ولؔی ایک جمالیاتی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کے اس پہلو سے بحث کرتے ہوئے اکثر ناقدین نے عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کا ذِکر کیا ہے۔ ولؔی کے یہاں یہ دونوں تصوّرات ملتے ہیں۔ ہندوستان میں بے شمار صوفیائے کرام گزرے ہیں۔ خاص کر دکن میں کئی بزرگانِ دین کے نام ملتے ہیں مثلاً خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، میراں جی شمس العشّاق، برہان الدّین جانم اور امین الدّین اعلیٰ وغیرہ۔ ان صوفیائے کرام کے علاوہ دکن کے اکثر شعرا کے یہاں تصوّف کے اثرات نمایاں ہیں۔ ولؔی کا تعلّق بھی چوں کہ اسی سرزمین سے ہے لہٰذا لازمی بات ہے کہ اس بات کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں تصوّف کا اثر

اس وجہ سے بھی نظر آتا ہے کہ انہوں نے جس زمانے میں آنکھ کھولی وہ انتشار کا دَور تھا۔ وہ بادشاہ جو علم و ادب کی سر پرستی دل کھول کر کیا کرتے تھے، وؔلی نے انہیں لاچار و مجبور اور قید ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک طرف مغلوں کے حملے دیکھے تھے تو دوسری طرف مرہٹوں کو لوٹ مار کر کے خزانوں کو لوٹتے دیکھا تھا۔ یہی وہ حالات تھے جن کو وؔلی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایسے دَور میں تصوّف لوگوں کی پناہ گاہ اور آسودگی کا ایک واحد ذریعہ ہوتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے شعرا میں تصوّف کی ایک لہر موج زن نظر آتی ہے۔ وؔلی کے یہاں تصوّف کا رنگ نظر آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وؔلی کا تعلّق احمد آباد (گجرات) سے رہا ہے۔ وہاں بھی کئی ایک اہم بزرگ گزرے ہیں۔ احمد آباد کے مشہور صوفی شاہ نورالدّین سے وؔلی درسِ سلوک لیا کرتے تھے۔ جو سہروردی سلسلے کے ایک مشہور بزرگ تھے۔ اس کے علاوہ وؔلی، شاہ گلشن کو بھی اپنا استاد مانتے تھے جو خود ایک صوفی بزرگ تھے۔ اس طرح وؔلی کے یہاں تصوّف کے عناصر کا آنا لازمی بات تھی۔ انہوں نے اپنے کالم میں جگہ جگہ تصوّف کے معاملات یعنی توحید، عشقِ رسول ﷺ، فقر، قناعت، قلندری اور درویشی وغیرہ کا ذِکر واضح طور پر کیا ہے:

الٰہی! رکھ مجھے تو خاکِ پا اہلِ معانی کا
کہ کھلتا ہے اسی صحبت سے نسخہ نکتہ دانی کا

اسباب سوں دنیا کے بے غرض ہوں سدا میں   بِن تیل ہور بتّی روشن چراغ میرا
مجھ دل کے آ چمن میں کر یک نظر تماشا   داغاں کے ہے گلاں سوں روشن یو باغ میرا
ہر ایک سوں متواضع ہو سروری یہ ہے   سنبھال کشتیِ دل کو قلندری یہ ہے
نکال خاطرِ فاتر سوں جامِ جم کا خیال   صفا کر آئنہ دل کا سکندری یہ ہے

شرابِ شوق سیں سرشار ہیں ہم
کبھو بے خود، کبھو ہشیار ہیں ہم

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وؔلی نے تصوّف کے وسیلے سے زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور بنیادی انسانی مسائل کو اپنے مخصوص صوفیانہ نقطۂ نظر سے سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں فلسفیانہ و مفکّرانہ انداز نہیں ملتا بلکہ زندگی کے معاملات کو جذبے اور وجدان کے ذریعے سمجھانے کی کوشش ملتی ہے، جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں نیا رنگ و آہنگ پیدا ہو گیا ہے، جو ان کی شاعری کی اہم خوبی ہے۔

حُسن و عشق کا بیان:۔ وؔلی نے جہاں صوفیانہ رموز کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے، وہیں ان کی شاعری میں حُسن و عشق کا ذِکر بھی ملتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وؔلی کے کلام میں زیادہ تر حُسن و عشق کے موضوعات ہی ملتے ہیں، جو غزل کا بنیادی موضوع ہے۔ محبوب کے حُسن و ادا کی تعریف، محبوب کا سراپا، یعنی چہرہ، رخسار، لب، زلفیں، آنکھیں وغیرہ کا ذکر ان کے یہاں بار بار ملتا ہے۔ ان موضوعات میں تکرار کے باوجود ان کی باتیں قاری پر گراں نہیں گزرتیں بلکہ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ انہوں نے عشق کی اہمیت کو تسلیم کیا، عشق وہ چاہے کسی بھی صورت میں کیوں نہ ہو، ان کی نگاہ میں اس کو اوّلیت حاصل ہے۔ اور انسان کی نجات کا ذریعہ بھی یہی عشق ہے۔ حقیقی اور مجازی کی بات بعد میں آتی ہے۔ اوّلیت عشق کو حاصل ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

وؔلی اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ حقیقت تک پہنچنے کا واحد ذریعہ عشقِ مجازی ہے۔ اس لئے وہ بار بار عشقِ مجازی پر زور دیتے ہیں۔ اور اس کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تواضع خاک ساری ہے، ہماری سرفرازی ہے　　حقیقت کے لغت کا ترجمہ عشقِ مجازی ہے
وؔلی جو عشق بازی میں حقیقت سوں نہیں واقف　　سخن اس کا قیامت میں گُلِ باغِ ندامت ہے

وؔلی چوں کہ عشق کے دل دادہ ہیں لہٰذا ان کی غزلوں میں زیادہ تر موضوعات حُسن وعشق کے متعلّق ہی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے عشق کے میدان میں نہ صرف قدم رکھا بلکہ اس کو اپنے طور پر سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا محبوب خیالی یا تصوّراتی نہیں ہے بلکہ وہ اسی دنیا کا جیتا جاگتا پیکر ہے۔ انہوں نے اپنے محبوب کو مبہم نہیں رکھا ہے بلکہ اسے نازنین، مہ جبین، موہن، سری جن، ہری، پیا، سجن اور دل رُبا جیسے ناموں سے یاد کیا ہے، چند اشعار بطور مثال دیکھیے:

دل کو لگتی ہے دل رُبا کی ادا　　جی میں بستی ہے خوش ادا کی ادا
دل کو گر مرتبہ ہو درپن کا　　مفت ہے دیکھنا سری جن کا
وؔلی وصل و جدائی سوں سجن کی　　کبھو صحرا کبھو گلزار ہیں ہم
طالب نہیں مہر و مشتری کا　　دیوانہ ہو جو تجھ پری کا

اگر موہن کرم سوں مجھ طرف آوے تو کیا ہووے
ادا سوں اُس قدِ نازک کوں دکھلاوے تو کیا ہووے

وؔلی جمال پرست شاعر ہیں۔ وہ اپنے محبوب کی تعریف طرح طرح سے کرتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب کا سراپا بڑے مؤثّر انداز سے بیان کرتے ہیں۔ دراصل غزل کا بنیادی موضوع محبوب کی تعریف کرنا ہے۔ انہوں نے اپنے محبوب کی تعریف میں اس کے اعضائے جسمانی کی تعریف کے علاوہ اس کی نظروں اور اداؤں کی تعریف بھی نئے نئے انداز سے کی ہے یہی وجہ ہے کہ وؔلی کو اردو شاعری میں ایک بڑا سراپا نگار بھی مانا جاتا ہے۔

قد ترا رشکِ سرو و رعنا ہے　　معنیِ ناز کی سراپا ہے

دیکھا ہے جن نے تیرے رخسار کا تماشا
نئیں دیکھتا سُرج کی جھلکار کا تماشا

اُوپر پیش کی گئی مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ وؔلی نے محبوب کے سراپا کی کتنی عمدہ تصویر کشی کی ہے، اس کے قد کا بیان ہو یا اس کی زلفوں کا، رُخسار کی تعریف ہو یا اس کے پاؤں اور جھانجھر کی جھنکار کا، سب کے بیان کرنے کا انداز ایسا انوکھا ہے کہ بار بار انہی باتوں کو دہرانے کے باوجود ان کی یہ باتیں گراں نہیں گزرتیں بلکہ ایک عجیب سا لطف دیتی ہیں۔ اکثر شاعری میں سراپا نگاری کے بیان میں ابتذال کی گنجائش

رہتی ہے لیکن وؔلی کا کلام اس سے یکسر پاک نظر آتا ہے۔انہوں نے محبوب کے سراپا کے بیان میں احتیاط کوملحوظ رکھا ہے۔وؔلی کی شاعری کی اس خوبی کا ذِکر کرتے ہوئے ڈاکٹرعبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''وؔلی نے حُسنِ نسوانی کے بیان میں کہیں بھی ابتذال کو پیدا ہونے نہیں دیا ہے۔اس بیان میں لذّت پسندی اور لطف اندوزی کا خیال ضرور موجود ہے لیکن تعیّش پسندی سے اس کا کوئی تعلّق نہیں ہے۔''

(وؔلی اورنگ آبادی،ادارۂ ادب وتنقید،لاہور،۱۹۸۱ء،ص۔۱۵۵)

ترے دو نین جب دیکھوں نظر بھر مجھے تب نرگستاں یاد آوے
اس رین اندھاری میں مت بھول پڑوں تس سوں ٹک پاؤں کے جھانجھر کی جھنکار سناتی جا

وؔلی کے کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں سوز وگداز اورغم واندوہ کی کیفیت نہیں ملتی بلکہ اس کے برعکس ان کے یہاں مسرّت وانبساط کا احساس ملتا ہے لیکن ان کی اس نشاطیہ کیفیت میں توازن اورصحت مندی کی ایک لہر موج زَن نظر آتی ہے۔یعنی وہ صرف دروں بیں نہیں بلکہ ظاہر پرست بھی تھے۔انہوں نے نہ صرف قلبی واردات کا ذِکر کیا بلکہ زندگی اور کائنات کو عام زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں کسی حسین وجمیل چہرے کے ساتھ مناظرِ فطرت کی عکّاسی بھی دیکھنے کوملتی ہے۔ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے ایک جگہ ان کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وؔلی کا امتیازِ خاص ہے کہ وہ ان معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جن کی غزل بلکہ سارے کلام کو پڑھ کرغم کی کیفیت پیدا ہونے کی بجائے طبیعت پر شگفتگی طاری ہوجاتی ہے۔ان کے عاشقانہ اشعار میں جذب وسروراور شوق ونشاط کی لہر دوڑ رہی ہے۔''

(وؔلی سے اقبالؔ تک،چمن بک ڈپو،اردو بازار دہلی،ص۔۱۴)

زبان وبیان:۔ وؔلی کی غزلوں کی ایک اہم خصوصیت اس کی زبان ہے۔وؔلی کا تعلّق چوں کہ شمالی وجنوبی ہند دونوں جگھوں سے رہا ہے اسی لئے دونوں جگھوں کی زبان کی خصوصیات ان کے کلام میں درآئی ہیں۔انہوں نے فارسی وعربی الفاظ اورترکیبوں کومقامی بولیوں کے الفاظ کے ساتھ ملاکراس طرح استعمال کیا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ الفاظ ایک ودسرے کے لئے ہی بنائے گئے تھے۔یعنی ان سے کسی طرح کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا اوران ترکیبوں کا استعمال وہ اس خوبی سے کرتے ہیں کہ اس میں موسیقیت اورغنائی کیفیت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ مثلاً:

دیکھ اس نرگسی قبا کے نین نرگستاں کوں دیکھنے مت جا
باد صبا کا ساتھ لیا ہوں چمن میں جا ہر تار میں زُلف کی ترے سیر جا کروں
مجھ کوں اس صندلی قبا کی ادا اے ولی دردِ سر کی دارو ہے

تشبیہ واستعارہ:۔ وؔلی کے کلام میں تشبیہات واستعارات کاحُسن نظر آتا ہے۔وؔلی نے مروّجہ تشبیہات کے عمدہ استعمال کے ساتھ ساتھ نئی تشبیہات بھی وضع کی ہیں۔تشبیہات واستعارات کے استعمال کا ہنرانہیں خوب آتا ہے،وہ تشبیہات واستعارات کا استعمال اس خوبی

سے کرتے ہیں کہ اشعار میں جان پڑ جاتی ہے اوران کی تشبیہیں بولتی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں۔ وہ جس چیز کا بیان کرتے ہیں اس کی تصویر نگاہوں میں رقص کرنے لگتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہر پلک عاشقوں کے جی کے تئیں کاٹنے کوں بس ایک آرا ہے
کان کے دُر کی کیا کروں تعریف پہلوے ماہ جیوں ستارا ہے
موجِ دریا کو دیکھنے مت جا دیکھ اس زلفِ عنبریں کی ادا
یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر ناگنی جیوں کنویں پہ پیاسی ہے
اے گلِ باغِ حسن مکھ سوں ترے جلوہ پیرا ہے رنگ و بوے حیا

وؔلی کی بیش تر غزلوں میں ہمیں جہاں تشبیہا تا واستعارات کا حُسن نظر آتا ہے وہیں گل وبلبل، چمن و باغ، گلشن و بہار، غنچہ و کلی، شبنم، شراب، جام، شمع، پروانہ اور چراغ جیسے استعارے بھی نظر آتے ہیں۔ ان استعاروں کے خوب صورت استعمال سے انہوں نے اپنی غزل میں جان ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ وؔلی کی غزلوں میں تشبیہات واستعارات کے ساتھ ساتھ شعری صنعتوں کا بھی عمدہ استعمال ملتا ہے۔ ان صنعتوں کا استعمال انہوں نے اس خوبی سے کیا ہے کہ ان کے اشعار کا حُسن دوبالا ہوگیا ہے۔

صنعتِ مبالغہ: ۔وؔلی نے اپنی غزلوں کے حسن کو بڑھانے کے لئے مبالغہ کا جگہ جگہ استعمال کیا ہے۔ یہ ان کا کمال ہے کہ وہ اپنے محبوب کے حسن کی تعریف اس قدر بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں کہ اس پر مبالغہ کا اثر صاف ظاہر ہونے لگتا ہے لیکن وؔلی کی اس مبالغہ آرائی سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انہیں زبان وبیان پر کس قدر قدرت حاصل تھی۔ اس سلسلے میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

تجھ مکھ کے آفتاب کی گرمی کوں دیکھ کر جل شوق کی اگن سوں ہوا جیوں انگارہ دِل
گر مضطرب ہیں عاشقِ بے دل عجب نہیں وحشی ہوئے ہیں تیری انکھاں دیکھ کر غزال
تیری طرف انکھیاں کوں کہاں تاب کہ دیکھیں سورج سوں زیادہ ترے جامے کی بھڑک ہے

ان اشعار میں وؔلی کی شاعری میں جذبے کی فراوانی کی شدّت بھی ہمیں نظر آتی ہے اور زبان کا لطف بھی اوراس کے ساتھ ہی زبان و بیان پر ان کی قدرت ومہارت کا بھی ہمیں علم ہوتا ہے۔

صنعتِ مراعات النظیر: ۔وؔلی نے اپنی غزلوں میں صنعتِ مراعات النظیر کا استعمال بڑی عمدگی سے کیا ہے۔صنعتِ مراعات النظیر اس وقت قائم ہوتی ہے جب شعر کے پہلے مصرعے میں ایک بات کہی جائے اور دوسرے مصرعے میں اسی کی مناسبت سے چند الفاظ کا استعمال کیا جائے۔ وؔلی کے یہاں اکثر یہ صنعت ملتی ہے۔ چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں بغور دیکھیں:

رحم کرتا نئیں ہمارے حال پر شوخ ہے سرکش ہے بے انصاف ہے
مجھ سوں کیوں کر ملے گا، حیراں ہوں شوخ ہے، بے وفا ہے، سرکش ہے
تغافل شوخ کا عاشق کے حق میں ستم ہے، ظلم ہے، جور و جفا ہے
صنم مجھ دیدۂ و دل میں گذر کر ہوا ہے، باغ ہے، آبِ رواں ہے

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے محبوب کے تغافل اور جفاکشی کا ذکر بڑی عمدگی سے کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں اسی مناسبت سے اس سے تعلّق رکھنے والے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اس طرح اس صنعت کے ذریعے وؔلی نے اپنے کلام کے حُسن میں اضافہ کیا ہے۔

صنعتِ تضاد:۔ وؔلی کے کلام میں ہمیں صنعتِ تضاد کی خوبی بھی نظر آتی ہے۔ یعنی وؔلی نے اپنے شعر کے حسن کو دوبالا کرنے کے لئے متضاد الفاظ کا استعمال کیا ہے، مثلاً:

زلف و رُخ ہے ترا جو لیل و نہار　　مجھ کوں واللّیل، والضّحٰی کی قسم

وؔلی وصل و جدائی سوں سجن کی　　کبھو صحرا، کبھو گلزار ہیں ہم

صوتی آہنگ:۔ وؔلی کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں الفاظ کی تکرار ایسا صوتی آہنگ پیدا کرتی ہے جو کانوں کو نہ صرف بھلا معلوم ہوتا ہے بلکہ اس سے ایک نغمگی و ترنّم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، مثلاً:

نہ وہ بالا، نہ وہ بالی، بلا ہے　　بلائے عاشقاں ناز و ادا ہے

تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کوں کیا کاجل　　یہ روشی افزا ہے انکھیاں کو لگاتی جا

جب سوں وہ نازنیں کی میں دیکھا ہوں چھب عجب

دل میں مرے خیال ہیں تب سوں عجب عجب

☆

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں گل رُوسوں

خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

ان اشعار میں نہ صرف وؔلی کے کلام میں صوتی آہنگ کا علم ہوتا ہے بلکہ ایک غنائی کیفیت کا بھی لطف آتا ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو وؔلی کی شاعری کو دوسرے شعرا سے منفرد کرتی ہیں۔ ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''وؔلی کے کلام میں غنائیت اور موسیقیت بہت زیادہ ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے الفاظ کی کیفیت اور صوتی اثرات کا بہت خیال رکھا ہے۔ منفرد الفاظ کے صوتی آہنگ اور ان کے ملنے سے جو غنائیت اور موسیقیت پیدا ہوتی ہے، ان سب کو نگاہ میں رکھ کر شعر کہے ہیں۔''　　(مطالعہ وؔلی، ص.٦٥)

وؔلی کے کلام کے مطالعے کے بعد بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ وؔلی نے اپنی شاعری میں شعر کے فنّی محاسن یعنی صنعتوں کا بڑی عمدگی سے استعمال کیا ہے۔ مختلف تشبیہات و استعارات کو اس خوبی سے شعر میں جگہ دی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ انہی کے لئے مخصوص تھیں۔ جہاں وؔلی نے اپنی شاعری میں زبان و بیان کا کمال دکھایا ہے، وہیں غزل کے موضوعات کا بھرپور استعمال بھی کیا ہے۔ ان کے یہاں زبان و بیان کے ساتھ ساتھ موضوعات میں بھی انفرادیت دکھائی دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں معنویت اور طرزِ ادا میں رعنائی و دلکشی نظر آتی ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر وؔلی اردو شاعری میں منفرد لب و لہجے کے شاعر کہے جاتے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ ولؔی کے کلام سے صنعتِ تضاد کی مثال پیش کیجیے۔

﴿۵﴾ صوتی آہنگ کی مثال ولؔی کے کلام سے دیجیے۔

﴿۶﴾ تشبیہ کی مثال پیش کیجیے۔

02.05 ولؔی اورنگ آبادی کی پہلی غزل

﴿۱﴾

﴿۱﴾ تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

﴿۲﴾ تعریف ترے قد کی الف وار سری جن
جا سروِ گلستاں کوں خوش الحاں سوں کہوں گا

﴿۳﴾ مجھ پر نہ کرو ظلم تم اے لیلیِ خوباں
مجنوں ہوں ترے غم کوں بیاباں سوں کہوں گا

﴿۴﴾ جلتا ہوں شب و روز ترے غم میں اے ساجن
یہ سوز ترا مشعلِ سوزاں سوں کہوں گا

﴿۵﴾ بے صبر نہ ہو اے ولؔی اس درد سوں ہرگز
چلتا ہوں ترے درد میں درماں سوں کہوں گا

02.06 ولؔی اورنگ آبادی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ اس غزل کو پڑھنے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ ناقدین نے آج تک غزل کی جو تعریفیں بیان کی ہیں ان پر یہ غزل پوری طرح کھری اُترتی ہے۔ مثلاً غزل کا مطلب ہے حسن و عشق کی باتیں کرنا، محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کرنا، عاشق کا اپنے دلی جذبات کا اظہار والہانہ طور پر کرنا وغیرہ۔ زیرِ بحث غزل شروع سے آخر تک انہی کیفیات کا اظہار ہے۔ شاعر پہلے اپنے محبوب کے حُسن کی طرح طرح سے تعریفیں بیان کرتا ہے۔ مثال کے طور پر محبوب کے لب، آنکھیں، اس کی قد وقامت اور خوب صورتی کی دل کھول کر بڑائی کرتا ہے اور آخر

تک آتے آتے اپنا دلی مدّ عا بیان کرتا ہے۔اپنا حرفِ مدّ عا بیان کرتے ہوئے اپنے دل کوخود ہی تسلّی دیتا ہے کہ بے صبر نہ ہو میں تمہارا درد، تمہاری پریشانی اوردل کی لگی کوتمہارے چارہ گریعنی محبوب سے کہوں گا اور اُمّید ہے کہ تمہارا حال سن کر، تمہاری کیفیت جان کروہ پری رُخ تم پر مہربان ہوگا اورتمہاری تمام تر پریشانیاں دُور ہو جائیں گی۔غزل میں عاشق کواپنے محبوب سے اسی طرح کی توقعات ہمیشہ ہوتی ہیں اورمحبوب کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے۔اس غزل کے خاص نکات یہ ہیں:

اس غزل میں تشبیہات اور تلمیحات کا استعمال خصوصی توجّہ کا طالب ہے۔

غزل میں شروع سے آخر تک ''سوں'' لفظ پر غور کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ بیش تر اشعار میں اس کا استعمال کلیدی لفظ کے طور پر کیا گیا ہے۔

غزل کی تشریح:۔

شعراوّل: اس شعر میں لفظ 'سوں' خاص توجّہ کا طالب ہے۔کیوں کہ اس شعر میں 'سوں' ہی کلیدی لفظ ہے اوراسی سے معنوی پہلو پیدا ہوتے ہیں۔جب شاعر کہتا ہے کہ 'تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا' تو اس کے دو مطلب ہوتے ہیں۔ایک تو یہ کہ تیرے ہونٹوں میں بدخشاں کے لعل سی سرخی ہے۔دوم یہ کہ تیرے ہونٹ بدخشاں کے لعل کی طرح ہی قیمتی ہیں۔شاعر کہتا ہے کہ اے میرے محبوب تیرے ہونٹوں کی جو خوبی ہے، اُسے دیکھ کر مجھے لعلِ بدخشاں کی یاد آجاتی ہے۔تیرے لبوں کوتو میں لعلِ بدخشاں سے ہی تعبیر کروں گا تیری آنکھوں میں جو سحر ہے، جو جادو ہے، جو نشہ ہے انہیں دیکھ کر میں تو یہی کہوں گا کہ یہ ہرن کی مانند ہیں۔ان میں وہی شوخی ہے، وہی چنچل پن ہے جو غزالوں میں ہوتی ہے۔اسی لئے میں انہیں غزالوں جیسی ہی کہوں گا۔

شعردوم: شاعر کہتا ہے کہ میرے محبوب کا قد الف کی طرح بالا ہے، یہ بات میں گلستاں میں جا کر سرو سے نہایت میٹھے لہجے میں کہوں گا۔یہاں اس شعر میں شاعر کے نزدیک کہیں نہ کہیں اس کے ذہن میں یہ بات ضرور پوشیدہ ہے کہ میرے محبوب کا قد سرو سے کہیں بڑھ کر ہے تبھی تو وہ یہ دعویٰ کر رہا ہے۔

شعرسوم: اس شعر میں بھی شاعر نے تلمیح کا استعمال کیا ہے۔اے میرے پیارے محبوب! تم مجھ پر ظلم نہ کرو ورنہ میں تمہارے ظلم کی روداد صحرا سے کہوں گا۔

شعرچہارم: شاعر کہتا ہے کہ اے ساجن! میں تیری قربت پانے کے غم میں بس تیری ایک نظرِ کرم کی امّید میں، رات دن جل رہا ہوں، ایسے میں میرا حال ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی آگ میں جلا ہوا ہو۔آگ سے جلنے پر جو تکلیف ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح تیرے غم میں میں جل رہا ہوں۔اس لئے مجھے اس شدید تکلیف سے نجات دلا دے۔کیوں کہ میرے اس دکھ کا مداوا صرف تیرے ہی پاس ہے اس لئے میری فریاد سن لے اور خدا کے واسطے مجھ پر عنایت کی نظر کردے۔

شعرپنجم: شاعر اپنے آپ کو تسلّی دیتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ اے ولؔی! اس درد کے واسطے تو حیران نہ ہو، میں ابھی جاتا ہوں اور تیرے محبوب سے تیرا حال بیان کرتا ہوں۔جس کے غم میں تو اس قدر آہیں بھر رہا ہے، جب اس کو تیرے حال کی خبر ہوگی تو وہ تجھ پر ضرور نظرِ عنایت کرے گا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ تلمیح سے آپ کیا سمجھتے ہیں، مثال کے ساتھ بتائیے؟

﴿۸﴾ تکرارِ لفظی کی مثال وَلی کے کلام سے پیش کیجیے۔

02.07 وَلی اورنگ آبادی کی دوسری غزل

﴿۲﴾

﴿۱﴾ کوچۂ یار عین کاسی ہے
جوگیِ دل وہاں کا باسی ہے

﴿۲﴾ اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال
ہندوے ہردوار باسی ہے

﴿۳﴾ یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر
ناگنی جیوں کنوے پہ پیاسی ہے

﴿۴﴾ جس کی گفتار میں نہیں ہے مزہ
سخن اس کا طعامِ باسی ہے

﴿۵﴾ اے وَلی ! جو لباس تن پہ رکھا
عاشقاں کے نزک لباسی ہے

02.08 وَلی اورنگ آبادی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ اس غزل میں وَلی نے اپنے محبوب کے حُسن و جمال کی تعریف مختلف طریقوں سے کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں سب سے پہلے وہ اپنے محبوب کی گلی کی تعریف کرتے ہیں۔ چوں کہ شاعر نے اپنے محبوب کی گلی کو کاشی کی گلی کے مترادف قرار دیا ہے، اسی لئے آگے بھی وہی ترکیبیں استعمال کی ہیں، جن سے سنت سنیاسیوں اور جوگیوں کو خاص لگاؤ ہوتا ہے۔ وَلی کے عہد کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے بڑی بے باکی سے ہندو بھکتی تحریک کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ محبوب کے رُخسار، اس کی زلفیں اور ٹھوڑی پہ قائم تِل کی مختلف زاویوں سے تعریف کرتے ہوئے اس کو کبھی جمنا کی موج، کبھی ناگن سے تشبیہ دینے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی شاعری کی بھی تعریف کرنے

کی سعی کی اور کہا ہے کہ جس کی شاعری میں لطف نہیں ہے وہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے کہ طعام کا باسی ہو۔ محبوب جو بھی لباس زیب تن کرتا ہے اس پر وہ خوب پھبتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ہر لباس عاشقوں کے دل کو خوب بھاتا ہے۔ پوری غزل عشقِ مجازی کے رنگ پر مبنی ہے لیکن وؔلی کا اپنا ایک مقام ہے اور وہ اس سے فروتر کوئی بات نہیں کہتے۔ ان کی غزل میں تشبیہ کا استعمال خوب کیا گیا ہے۔ یا پھر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ پوری غزل میں تشبیہ نے ایک خاص شان اور رنگ پیدا کر دیا ہے۔ ایک اور خاص بات اس غزل کی یہ ہے کہ اس میں ہندو بھگتی تحریک کی ترکیبیں خوب استعمال کی گئی ہیں۔ جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر بھگتی تحریک سے کافی متاثر ہے۔ یہی سبب ہے کہ ''کاسی، جوگی، بیراگ، ہردوار اور سنیاسی جیسی ترکیبیں استعمال کر کے غزل کو ایک آہنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے جس سے ایک وحدتِ تاثر قائم ہوتا ہے۔

غزل کی تشریح:۔

شعر اول: وؔلی نے محبوب کی گلی کو کاشی سے تشبیہ دے کر اپنے محبوب کی گلی کے مرتبے کو بلند کر دیا ہے۔ یعنی اس کے محبوب کی گلی کوئی ایسی ویسی گلی نہیں بلکہ کاشی کی پاک اور مقدّس گلی کی مانند ہے اور اس کا دل اس مقدّس گلی کا باشندہ ہے۔

شعر دوم: شاعر کہتا ہے کہ اے میرے محبوب! تیری پیشانی کے اوپر یہ تِل مجھے ہندوے ہردوار باسی کی مانند لگ رہا ہے۔

شعر سوم: محبوب کی کالی کالی زلفیں جو کہ اس کی ٹھوڑی پر آئی ہوئی ہیں انہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ کوئی ناگن کنویں پر پیاسی بیٹھی ہو۔

شعر چہارم: وہ شخص جس کی گفتگو میں لطف نہیں ہے یا جس کی بات پر لطف نہیں ہے اس کا کلام باسی کھانے کی طرح بے مزہ ہے۔

شعر پنجم: وؔلی کہتے ہیں کہ محبوب نے جو بھی لباس زیب تن کیا، عاشقوں کے نزدیک وہی اس پر خوب کھلتا ہے۔ جس کے باعث عاشق اس کے ذوق کے قائل ہو گئے ہیں یا پھر سارا زمانہ اس کا قائل ہو گیا ہے۔

02.09 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے وؔلی کی زندگی، حیات، مزاج اور ان کی شاعری کی خصوصیات پر اجمالاً نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے آپ کو ان کی حیات اور شاعری کا خاطر خواہ علم یقیناً ہو گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ انہوں نے شمال اور جنوب کو ملانے کا جو گراں قدر کام انجام دیا ہے اور جس کا اثر ان کی زبان پر بھی دکھائی دیتا ہے اس سے بھی آپ کو واقف کرانے کی کوشش اس اکائی میں کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ وؔلی کی شخصیت، شاعری اور اس کی خصوصیات سے نہ صرف آگاہ ہو چکے ہوں گے بلکہ خود بھی ان کی شاعری اور شخصیت پر مختصراً اظہارِ خیال کر سکیں گے۔ ان کی دو غزلوں کے مطالعے، مجموعی تاثر اور ان کی تشریح کے مطالعے سے بھی آپ کو وؔلی کی شاعری، شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اکائی کے آخر میں فرہنگ اور کتابیات کے علاوہ اپنے مطالعے کی جانچ کے سبھی سوالوں کے جوابات بھی دیے گئے ہیں۔ کتابیات سے آپ کو مزید مطالعے میں ضرور مدد اور رہنمائی فراہم ہوگی۔ اُمید ہے کہ آپ اس سے ضرور فائدہ اُٹھائیں گے۔

02.10 فرہنگ

تلمیح	:	کلام میں کسی تاریخی قصّے یا واقعے کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں	سراپا	:	سرتاپا، سر سے پاؤں تک
			سرج	:	سورج
توازن	:	برابری، ہم وزن	سرخوشی	:	مسرّت، شراب کا سرور

جلوہ پیرا	ظاہر ہونا، ایک خاص طرز سے اپنے تئیں بن سنور کے ظاہر ہونا۔	سوں	سے
		صحت مند	تندرست، درست
جیوں	جیسے	غم واندوہ	فکروتردّد، رنج
جھانجھر	پائل، ایک قسم کا پاؤں کا آواز دار زیور	کیف وسرور	نشہ، خوشی
خاکِ پا	پاؤں کے نیچے کی مٹی، نہایت حقیر، مسکین	مکھ	چہرہ، منہ
درپن	آئینہ	مناظرِ فطرت	قدرتی نظارے
زنخداں	ٹھوڑی	نشاطیہ کیفیت	خوشی یا شادمانی کی حالت

02.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰۔۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اردو شعرا کے کلام میں ولؔی کے اثرات کی نشان دہی کیجیے!

سوال نمبر۲ : ولؔی کا تعلق اورنگ آباد سے ہے یا گجرات سے، اپنی معلومات قلم بند کیجیے!

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰۔۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : ولؔی کی عشقیہ شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کیجیے!

سوال نمبر۲ : ولؔی کی سوانح و شخصیت کے بارے میں اپنی واقفیت سے آگاہ کیجیے!

سوال نمبر۳ : ولؔی کی غزلوں کی خصوصیات کے تعلّق سے اپنی معلومات کا اظہار کیجیے!

02.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو غزل ولؔی تک — از — ڈاکٹر سیّد ظہیر الدّین مدنی

۲۔ دکن میں اردو — از — نصیر الدّین ہاشمی

۳۔ دکنی غزل کی نشونما — از — ڈاکٹر محمد علی اثر

۴۔ کلّیاتِ ولؔی — از — نور الحسن ہاشمی

۵۔ مطالعۂ ولی — از — ڈاکٹر شارب ردولوی

02.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ ولؔی اورنگ آبادی کا پورا نام ولی محمد تھا۔

﴿۲﴾ ولؔی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔

﴿۳﴾ ولؔی شاہ وجیہ الدّین کی خانقاہ میں شاہ نور الدّین سہروردی کے مرید بنے۔

﴿۴﴾ تجھ مکھ کے آفتاب کی گرمی کوں دیکھ کر ☆ جل شوق کی اگن سوں ہوا جیوں انگارہ دل

﴿۵﴾ نہ وہ بالا نہ وہ بالی بلا ہے ☆ بلائے عاشقاں ناز و ادا ہے

﴿۶﴾ تشبیہ کے اصل معنی ہیں ایک چیز کو دوسری کے مانند ٹھہرانا۔
یہ شعر میں اس وقت قائم ہوتی ہے جب شاعر کسی دوسری چیز سے مشابہ قرار دیتا ہے۔ مثلاً:
کان کے در کی کیا کروں تعریف ☆ پہلوئے ماہ جبیوں ستارا ہے

﴿۷﴾ کلام میں کسی تاریخی قصّے یا واقعے کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔ جیسے:
دی بادشہی حق نے تجھے حسن نگر کی ☆ یو کشورِ ایراں میں سلیماں سوں کہوں گا

﴿۸﴾ عجب کچھ لطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں گل رُو سوں ☆ خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

✵

اکائی 03 : سراؔج اورنگ آبادی

ساخت

03.01 : اغراض ومقاصد
03.02 : تمہید
03.03 : سراؔج اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی
03.04 : سراؔج اورنگ آبادی کی شاعرانہ خصوصیات
03.05 : سراؔج اورنگ آبادی کی پہلی غزل
03.06 : سراؔج اورنگ آبادی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اورتشریح
03.07 : سراؔج اورنگ آبادی کی دوسری غزل
03.08 : سراؔج اورنگ آبادی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اورتشریح
03.09 : خلاصہ
03.10 : فرہنگ
03.11 : نمونہ امتحانی سوالات
03.12 : حوالہ جاتی کتب
03.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

03.01 اغراض ومقاصد

اردو شاعری میں ولؔی دکنی کی شاعری سے ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ولؔی نے قدیم روایاتِ شاعری سے انحراف کرتے ہوئے نئی شاعری کی ایجاد کی۔ان کے پیروکاروں میں بہت سے شعرا کے نام تاریخی کتب میں ملتے ہیں۔جن میں سب سے اہم نام سراؔج اورنگ آبادی کا ہے۔آپ اس اکائی میں دکنی شاعری کی خصوصیات اور سراؔج اورنگ آبادی کے شعری اوصاف کے متعلّق پڑھیں گے۔اس اکائی کو پڑھ کر اندازہ لگائیں کہ دکنی شاعری،شمالی ہند کی شاعری سے کتنی مختلف ہے۔زبان و بیان،طرزِ ادا اور اظہارِ مطالب کے اعتبار سے دونوں جگہوں کی شاعری کا آپ کو بخوبی اندازہ ہوجائے گا۔سراؔج کی حیات کے ان گوشوں کو بھی اُجاگر کیا جائے گا جس سے آپ اندازہ لگائیں گے کہ سراؔج صرف تیرہ سال کی عمر میں تصوّف ومعرفت کی وادی میں داخل ہو گئے تھے اور ان پر جذب وکیفیت طاری ہوئی۔ساتھ ہی ان کی غزلوں کی تشریح ،مشکل الفاظ کی فرہنگ اور مختلف سوالات و جوابات بھی پیش کیے جائیں گے۔جس سے آپ کو سراؔج کی شخصیت اور ان کی شاعری کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

03.02 تمہید

شمالی ہند کی شاعری اور جنوبی ہند کی شعری جہات میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔لب ولہجہ، زبان و بیان، طرزِ ادا اور موضوعاتِ شعر میں دونوں مقامات کی شاعری ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہے۔جب ہم شمالی ہند کی شاعری میں میر تقی میرؔ، میر دردؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کو پڑھتے ہیں تو ہمیں زبان کے لہجے کے اعتبار سے اور لسانی نقطۂ نظر سے ایک مخصوص نظریے کا احساس ہوتا ہے تو دوسری جانب جنوبی ہند کی شاعری میں ولیؔ، نصرتیؔ، رستمیؔ، ہاشمیؔ، جنیدی، قاضی محمود بحریؔ اور سراجؔ اورنگ آبادی کا لب ولہجہ اور زبان و بیان ایک دم الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ یہاں ہم اسی دکنی شاعری کے ایک اہم شاعر سراجؔ اورنگ آبادی کے بارے میں مطالعہ کریں گے جن کی شاعری میں سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔تصوّف و معرفت کے رموز ان کی شاعری کے اہم اوصاف ہیں۔ان تمام نکات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جنھیں سراجؔ نے اپنی شاعری میں پیش کیا۔آیئے ہم دیکھیں کہ سراجؔ کی حیات اوران کی خدمات کیا تھیں؟

03.03 سراجؔ اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی

سیّد سراج الدّین نام اور تخلّص سراجؔ تھا۔سراجؔ اورنگ آبادی کے نام سے شہرت پائی۔سراجؔ کی پیدائش اورنگ آباد میں ۱۷۱۵ء میں ہوئی۔آپ ساداتِ حسینی خاندانِ مشائخ سے تھے۔اورنگ آباد ہی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔سراجؔ بارہ سال کی عمر تک تحصیلِ علم میں مشغول رہے۔بعدازاں آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہوگئی۔وہ صحرانوردی کرتے اور کبھی حضرت برہان الدّین غریب کے مزار پر جا بیٹھتے۔ ان کے والدان کی وحشت کم کرنے کی غرض سے انہیں گھر لے جاتے اور ان کے پاؤں میں زنجیر پہنا دیتے تاکہ وہ گھر سے باہر نہ نکل سکیں۔ اسی جذب کی کیفیت کو سراجؔ نے منتخب دواوین کے دیباچے میں لکھا ہے۔وہ اپنا حال اس انداز میں لکھتے ہیں:

> ”یہ فقیر بارہ برس کی عمر میں جوش و جذبہ وغلبۂ شوق سے سات برس تک برہنہ تن و برہنہ سر رہا۔اکثر اوقات عالمِ بے خودی میں حضرت شاہ برہان الدّین غریب دولت آبادی کے روضہ کے اطراف میں گھومتا۔ اسی حالتِ مستی میں اکثر اشعار فارسی زبان سے برآمد ہوتے۔مگر تحریر کے دائرے میں نہیں آتے اور اگر وہ تمام اشعار موجود ہوتے تو ایک ضخیم و بزرگ دیوان مرتّب ہو جاتا۔پھر مدّتِ مذکورہ کے بعد حضرت خواجہ سیّد شاہ عبدالرّحمٰن چشتی المتوفّی ۱۶۱۱ء کی خدمت میں پہنچا۔حسنِ ارادت سے مرید ہوا۔ان دونوں میں بیاسی خاطر عزیزی عبدالرّسول خاں جو فقیر کے برادرِ طریقت تھے،اکثر اشعار زبانِ ریختہ میں لکھے گئے ہیں۔خاں صاحب نے جواہر متفرّق جو تخمیناً پانچ ہزار اشعار تھے۔حروفِ تہجّی میں ترتیب دیا اور کامل دیوان شائقین کی خدمت میں بھیجا۔پھر فقیری اختیار کی اور مرشد کے حکم سے شعر گوئی ترک کی۔“
>
> (تاریخ ادب اردو۔رام بابو سکسینہ۔صفحہ ۵۱)

اس اقتباس سے اندازہ ہوگیا کہ سراجؔ صرف بارہ سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔بعدازاں سلوک و معرفت کی وادی میں داخل ہوئے۔شعر گوئی کی شروعات کی اور سات سال تک وہ اسی جذب و کیف کی حالت میں رہے۔جب ان کی طبیعت میں قدرے سکون ہوا تو ۱۷۳۳ء میں شاہ عبدالرّحمٰن چشتی سے ہم کلام ہوئے اور اردو میں شعر کہے اور چوبیس سال کی عمر میں ۱۷۵۵ء میں دیوان مکمّل کیا۔مرشد نے

شعر گوئی سے منع کیا تو فارسی شعرا کے دواوین کا مطالعہ کیا اور پسندیدہ غزلوں کا انتخاب ''منتخب دیوانہا'' ۱۷۳۹ء میں مرتب کیا۔ سراجؔ نے تمام اصنافِ سخن میں اشعار کہے۔ ہیں۔ ان کی ایک مثنوی ''بوستانِ خیال'' ۱۷۴۷ء میں لکھی گئی جو ایک درد انگیز آپ بیتی ہے۔ یہی درد اور تاثیر سراجؔ کے پورے کلام میں موجود ہے۔ جس سے سراجؔ کو ولیؔ دکنی اور محمود بحریؔ کے بعد تیسرا بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ سراجؔ اورنگ آبادی نے پانچ سال کے اندر اندر فارسی کے تمام مشہور اساتذہ کا کلام پڑھ لیا تھا۔ انہیں فارسی ادب اور خصوصاً شاعری سے غیر معمولی دل چسپی تھی۔ چنانچہ بارہویں سال سے جب ان پر جذب کی کیفیت طاری ہوئی تو اضطراری طور پر فارسی اشعار ان کی زبان سے جاری ہونے لگے۔ اس عرصے میں سراجؔ کی طبیعت کے پوشیدہ جوہر ظاہر ہونے لگے۔ یہ وقت ان کی شاعری کی ابتدا کا دور تھا۔ جب فارسی اشعار بے اختیاری طور پر ان کی زبان سے جاری ہو جاتے تھے۔ اگر ان کا تمام کلام جمع ہو گیا ہوتا تو سراجؔ کو نمایاں مقام حاصل ہوتا۔ ابھی تک جو بھی ان کے فارسی کلام ملے ہیں وہ ادھورے ہیں اور جستہ جستہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان کی فارسی شاعری پر صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

سراجؔ نے ۱۷۴۴ء میں حضرت شاہ عبدالرحمٰن سے بیعت کی اور یہی زمانہ ان کی اردو شاعری کے آغاز اور عروج کا ہے اور غالب گمان یہ ہے کہ وہ اپنے شعر کی تاثیر کو اپنے مرشد عبدالرحمٰن کے فیضِ روحانی کا اثر تصوّر کرتے تھے۔ یہ شعر ان کی فیض رسانی کی دلیل ہے۔

مشعلِ سوزِ جگر ہے ہر غزل میری سراجؔ
شمعِ دل روشن ہے فیضِ شاہ رحماں کے طفیل

سراجؔ اورنگ آبادی جب حضرت شاہ عبدالرحمٰن کے سلسلۂ ارادت میں داخل ہوئے تو ان کی عمر صرف بیس سال کی تھی۔ وہ ابھی لااُبالی انداز کی زندگی گزارتے تھے۔ سراجؔ جب اپنے مرشد کی خدمت سے الگ ہوتے تو ان کا زیادہ تر وقت شعر و شاعری میں گزرتا۔ ان کے گھر پر ان کے احباب اور دوستوں کا ہجوم رہتا۔ حالاں کہ سراجؔ کے گھر والوں کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ ان کے گھر پر ہمیشہ لوگوں کا مجمع لگا رہے لیکن سراجؔ کو اس کی پروا نہیں تھی۔ ان کی طبیعت کا اندازہ ان کے ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

معتبر نئیں جمال ظاہر کا
گردشِ روزگار کی سوگند
دیکھا ہوں سب طرف نگہِ امتیاز سیں
کوئی دوسرا نظر نہیں آیا مثالِ دوست

ڈاکٹر جمیل جالبی نے سراجؔ اورنگ آبادی کی حیات و خدمات اور شاعری سے متعلق لکھا ہے کہ ان کے دل میں جذب و کیف کی وہ بے خودی شامل تھی جس نے محویت کا سرور ان کے دل میں ڈال دیا تھا۔ وہ عشقِ حقیقی میں اس قدر غرق رہتے تھے کہ دنیا کی ہر شے سے لاتعلّقی ان کی شخصیت کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''سراجؔ کے کلام سے یہ بات شدّت سے محسوس ہوتی ہے کہ یہ ''آواز'' اردو شاعری میں پہلی بار سنی جا رہی ہے۔ اس میں ایک ایسی خود سپردگی اور ایسی سرشاری ہے جو اب تک کسی شاعر کے یہاں اس طرح سمٹ کر، جم کر سامنے نہیں آئی تھی۔ سراجؔ کی شخصیت کی تعمیر میں جن عناصر نے حصہ لیا ان میں عالمِ جذب و کیف

سے پیدا ہونے والی ''محویت'' نے بنیادی رنگ بھرا۔عشق کے غلبہ نے نشۂ بے خودی کو جنم دیا۔فارسی زبان و ادب کے گہرے شغف نے اظہار کے وسیلوں کو موئثر بنانے میں مدد کی۔ذہانت کا یہ عالم کہ بہت کم عمری میں ہی تعلیم سے فارغ ہو گئے اور جب بارہ سال کے ہوئے تو سرشاریِ عشق نے جنون کی کیفیت اختیار کر لی اور سراؔج اسی کیفیت میں صحرانورد ہو گئے۔دن رات گھومتے اور شاہ برہان الدّین غریب کے مزار پر منزل کرتے ۔اسی عالمِ بےخودی میں فارسی اشعار منہ سے بے ساختہ جاری ہوتے۔''

(تاریخ ادب اردو، جلد اوّل،ص۔۵۶۶)

سراؔج کی اردو شاعری کی ابتدا اور عروج کا یہ وہ زمانہ تھا جب عبدالرّسول خاں سے ان کی دوستی بڑھی۔بچپن سے ان کی دوستی کے جو نقش ان کے دل پر مرتّب ہوئے تھے، اب بہت گہرے ہو گئے تھے۔سراؔج کے دیگر دوستوں میں ضیاء الدّین خان پروانہ،شاہ تاج الدّین، شاہ چراؔغ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ضیاء الدّین کو جو محبت سراؔج سے تھی وہ ان کے تخلّص سے ظاہر ہے۔جو سراؔج کی رعایت سے اختیار کیا گیا تھا۔ان کے نام سراؔج نے جو خطوط لکھے ہیں ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ سراؔج ان سے کس درجہ بے تکلّفی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ضیاء الدّین نے بھی سراؔج کی بہت خدمت کی لیکن سراؔج کو جو محبت عبدالرّسول خاں سے تھی وہ ان میں سے کسی اور سے نہیں تھی۔انہی کے اصرار کرنے پر سراؔج اپنا اردو کلام زیورِ تحریر سے آراستہ کرنے پر مجبور ہوئے اور عبدالرّسول خاں نے ان منتشر جواہر پاروں کو ردیف وار ترتیب دے کر سراؔج کا کلام مرتّب کیا۔

سراؔج کے کلام میں بعض جگہ عبدالرّسول خاں کے اشارے بھی پائے جاتے ہیں۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سراج کو عبدالرسول خاں سے کس قدر محبت تھی اور ان سے کتنی گہری دوستی تھی۔

صبا میرے جوانِ لشکری کوں جا خبر کرنا
دلِ بے درد میں اس یار کے جا کر اثر کرنا

عبدالرّسول خاں آخری زمانے میں لشکر میں شریک ہو گئے تھے۔سراؔج کے خطوط سے اس جانب اشارہ ملتا ہے۔انہی کی وجہ سے سراؔج کبھی کبھی لشکر میں رہا کرتے تھے۔اس مختصر مدّت میں سراؔج کی شاعری بہت عروج کو پہنچی جس سے سراؔج کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کی شہرت بھی اسی قلیل مدّت میں ہوئی جو دیگر شعرا کو کئی سالوں میں ملتی ہے۔یہ سراؔج کی قابلیت اور ذہانت کی دلیل ہے ۱۱۵۶ھ سے پہلے سراؔج اورنگ آبادی کی شاعری کی شہرت گجرات اور شمالی ہند کے علمی مرکزوں دہلی وغیرہ تک پہنچ چکی تھی۔ریختہ میں ولؔی دکنی کے بعد سب سے بڑے استاد تسلیم کیے گئے اور ولؔی کے جانشین تصوّر کیے گئے۔

۱۱۶۱ھ میں حضرت شاہ عبدالرّحمٰن چشتی کا انتقال ہو گیا۔سراؔج کو ان سے جو ارادت تھی اس کے مدِّ نظر یہ جاں کاہ صدمہ ان کے لئے یقیناً تکلیف دہ تھا۔وہ پہلے ہی فقر و درویشی اختیار کر چکے تھے۔اس حادثے کے بعد وہ اور بھی دنیا سے کنارہ کش ہو گئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔اس زمانے میں جب انہیں دنیا سے بہت کم لگاؤ رہ گیا تھا۔انہوں نے اپنے شعری ذوق کی تشفّی کے لئے ایک مناسب مشغلہ تلاش کر لیا۔ان کے رگ و پے میں فارسی کا ذوق بچپن ہی سے سرایت کر چکا تھا۔اب پھر ان کے لئے یہ جاذبِ توجّہ بنی کیوں کہ سراؔج شعر کہنا ترک کر چکے

تھے۔اب انہوں نے ایک نیا شغل شروع کیا۔انہوں نے فارسی اساتذہ کے دیوانوں کا انتخاب شروع کیا اور ۱۱۹۶ھ میں اسے مکمّل کر کے ایک دیباچہ بھی لکھا۔اس مجموعے کا نام ''منتخب دیوانہا'' رکھا۔''منتخب دیوانہا'' غالباً سراؔج کا آخری کارنامہ تھا۔اس کے بعد سوائے خطوط کے شاید انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔

زندگی کے آخری دَور میں سراؔج اورنگ آبادی کی شخصیت نہایت مقدّس اور بزرگ ہوگئی تھی۔عوام وخواص ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔سارا شہران کا معتقد تھا۔ان کی بزرگی اور شاعری کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ان کے مریدوں کی تعداد کثیر تھی لیکن ان کے خاص معتقدین میں ضیاء الدّین، تاج الدّین اور شاہ چراغ کے علاوہ چند ہی معتقدین کے نام تاریخی کتابوں میں ملتے ہیں۔ان کے شاگردوں کی تعداد کافی تھی جن میں ضیاءالدّین پرواؔنہ، لالہ جے کشن، مرزا مغل کمترؔ، میر مہدی متین، مرزا محمود خاں نثاؔر، محمد عطا ضیاؔ اور رضا بیگ خاں وغیرہ۔

سراؔج اورنگ آبادی کا یہ دَوران کی زندگی کا خوب صورت ترین دَور تھا۔یہ دَور سراؔج کے لئے شہرت، عزّت اور احترام کے لحاظ سے بہترین زمانہ تصوّر کیا جاتا ہے۔انہیں شاعری میں استادی کا درجہ حاصل تھا۔شہر کے بہت سے خوش گفتار ان کی شاگردی کا دَم بھرتے تھے۔علاوہ ازیں سراؔج اورنگ آبادی کی علماوفضلا اور شعرا کے ہر حلقے میں شہرت اور عزّت ہوتی تھی۔اس دَور میں اورنگ آباد میں جتنے بھی بڑے اہلِ قلم اور فن کار موجود تھے وہ سارے ان کے دوست یا ان کے معتقد تھے۔علاّمہ غلام علی آزاؔد بھی ان کے ملنے جلنے والوں میں سے تھے۔شفیقؔ جو پہلے سراؔج کو اپنا دوست سمجھتے تھے ان کی بزرگی اور شہرت کے باعث ان کا احترام کرنے لگے تھے۔''چمنستانِ شعرا'' مصنّف اسد علی خاں تمنّاؔ میں اس جانب اشارہ ملتا ہے۔

سراؔج کی عزّت وتکریم پورے شہر کے علما اور رؤسا کے درمیان یکساں تھی۔اس تمام عزّت وتقدّس کے باوجود سراؔج کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ وہ گھر میں تنہا رہا کرتے تھے۔ان کی خدمت کے لئے صرف دو خدمت گار مامور تھے۔ضیاء الدّین پرواؔنہ ملازمت کے سلسلے میں بیجاپور میں مقیم تھے۔شاہ چراغ احمد نگر میں اور عبدالرسول لشکر میں رہا کرتے تھے۔شاہ تاج الدین جوان کے قریبی دوستوں میں تھے وہ بھی ان کے پاس نہیں تھے۔

سراؔج آخری وقت میں موذی امراض میں مبتلا ہو گئے۔مرضِ بواسیر، ضعفِ معدہ اور اسہال جیسے امراض میں وہ مبتلا رہا کرتے تھے۔شاہ تاج الدین کو لکھے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ سراؔج بعض وقت مرض کی شدّت کی وجہ سے کھڑے ہونے سے بھی معذور ہو جاتے تھے۔انھی تکالیف کے سبب انہوں نے شاہ چراغ کو (جوان کے خاص دوستوں میں تھے) خط لکھا کہ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوں تا کہ ان کی ہمّت میں اضافہ ہو سکے لیکن وہ اپنی مجبوریوں کے سبب ان کے پاس حاضر نہ ہو سکے۔شاید کوئی خاص وجہ تھی جس کے باعث شاہ چراغ، سراؔج کی خدمت میں حاضری نہ دے سکے۔سراؔج کی بیماری میں روز بروز شدّت آتی گئی اور سراؔج کا اسی مرض میں ۴رشوّال ۱۱۷۷ھ مطابق ۱۷۶۳ء بروز جمعہ انتقال ہوگیا۔ان کی وفات پر پورے شہر میں ماتم چھایا رہا اور لوگوں نے سوگ منایا۔

میر حسنؔ اور شمالی ہند کے بعض تذکرہ نگاروں نے سراؔج کو آبرؔو کا ہم عصر بتایا ہے۔دہلی میں اردو شاعری کی ترقی دراصل شاہ ظہور الدّین حاتؔم اور شاہ مبارک آبرؔو سے شروع ہوئی۔اسی لئے اردو شاعری کے اوّلین دَور کو انہی کے عہد سے موسوم کیا جاتا ہے۔جس طرح اس کے بعد کے زمانے کو میرؔ اور سوؔدا کے عہد سے موسوم کرتے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ سراؔج اورنگ آبادی کہاں اور کب پیدا ہوئے؟

﴿۲﴾ سراؔج کتنے سال تک تحصیلِ علم میں مشغول رہے؟

﴿۳﴾ سراؔج نے پسندیدہ غزلوں کا انتخاب کس نام سے مرتّب کیا؟

﴿۴﴾ سراؔج جذب کی حالت میں کس زبان میں شعر موزوں کرتے رہے؟

﴿۵﴾ سراؔج کی وفات کس سن میں ہوئی؟

﴿۶﴾ شمالی ہند کے تذکرہ نگاروں نے سراؔج کو کس شاعر کا ہم عصر قرار دیا ہے؟

03.04 سراؔج اورنگ آبادی کی شاعرانہ خصوصیات

ولؔی دکنی کے بعد سراؔج اورنگ آبادی کو دکنی شعرامیں اہم مقام حاصل ہے۔ سراؔج بچپن سے حُسن پرستی کی طرف مائل تھے۔ ابھی وہ پوری طرح سنِ شباب کو بھی نہ پہنچے تھے کہ ان پر ایک طرح کی مجذوبیانہ کیفیت طاری ہوگئی۔ جب یہ کیفیت سات سال کے بعد ختم ہوئی تو صوفیوں اور فقرا کے ساتھ رہنے لگے اور اسی طرح ساری زندگی بسر ہوگئی۔ جس وقت ان پر جذب و کیف کی حالت مسلّط رہتی تھی، اس وقت وہ نہایت موزوں شاعری کرتے اور ان کی شاعری کی زبان فارسی تھی مگر ان کا فارسی کلام ضائع ہوگیا۔

سراؔج اورنگ آبادی کو صوفی شعرامیں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ ان کی زندگی اور تخلیقات میں بڑا گہرا تعلّق ملتا ہے بلکہ ان دونوں کیفیات میں جوش اور بے قراری کا عنصر شدّت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سراؔج نے تمام اصنافِ سخن میں اشعار کہے ہیں اور صرف چوبیس سال کی عمر میں انہوں نے اپنا دیوان مکمّل کر لیا۔ سراؔج نے ایک مثنوی ''بوستانِ خیال'' ۱۷۳۹ء میں لکھی جو آپ بیتی ہے۔ ان کی متعدّد مثنویوں میں ''بوستانِ خیال'' زیادہ اہم ہے۔ اس میں کم و بیش گیارہ سو ساٹھ (۱۱۶۰) اشعار ہیں مگر یہ سراؔج کی صرف دو دن کی ریاضت اور مشق کا نتیجہ ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سراؔج کتنے بڑے قادرالکلام اور ذہین شاعر تھے۔ اس مثنوی کی کہانی بہت سلیس زبان میں، آپ بیتی کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ یہ مثنوی سیدھی سادی اور بہت آسان ہے۔ سراؔج نے اس مثنوی میں ایک شاعر اور ایک عاشق کی زندگی کی ایسی حقیقی اور پرکشش تصویرکشی کی ہے جو کسی معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں۔ انہوں نے اپنے تخیّل کی رفعت اور احساسات و واقعیت کی بڑی خوب صورت منظرکشی کی ہے۔ یہ مثنوی اردو کی خاص اور اہم تصنیفات میں شمار کی جاتی ہے۔

سراؔج اورنگ آبادی نے ولؔی کی روایتِ تصوّف کو آگے بڑھایا۔ غزل کی نئی تعبیر پیش کی اور اردو شاعری میں معرفت کے مضامین کو بڑی صفائی اور سلاست کے ساتھ پیش کیا۔ سراؔج کی شاعری حسنِ خیال، لطافتِ گفتار اور وسعتِ تخیّل کی ایک عظیم مثال ہے۔ جس کا مطالعہ ہر دَور میں کیا جائے گا۔ سراؔج اردو کے ان شعرامیں سے ہیں جو دماغ سے نہیں دل سے شاعری کرتے ہیں اور یہ شعرا کا ایک برگزیدہ طبقہ ہے جس میں ولؔی، دردؔ، میرؔ حسن میر انیسؔ، نظیرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ وغیرہ شامل ہیں۔ حقیقت میں اردو شاعری کی بہترین روایت انہی شعرا کی بدولت قائم ہے۔ عظیم ناقد اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی سراؔج کی شاعری کا محاکمہ اس انداز سے کرتے ہیں:

''سیّد سراج الدّین اَورنگ آبادی وَلؔی کے بعد اور دَورِ میرؔ و سوداؔ سے پہلے کے درمیانی عرصے کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔جن کی پُرگوئی، جوشِ طبع اور رنگِ سخن کو کوئی دوسرا نہیں پہنچتا۔ سراؔج کے کلام سے یہ بات شدّت سے محسوس کی جاسکتی ہے کہ یہ ''آواز'' اردو شاعری میں پہلی بار سنی جارہی ہے۔اس میں ایک ایسی خود سپردگی اور ایک ایسی سرشاری ہے کہ جواب تک کسی شاعر کے یہاں اس طرح سمٹ کر، جم کر سامنے نہیں آئی تھی۔''

(تاریخ اردو ادب، جلد اوّل،ص۔۵۶۶)

سراؔج کی انفرادیت ان کی مجذوبانہ کیفیت کی وجہ سے ہے۔ان کی شاعری میں تصوّف کے بھرپور اور عمیق عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ولؔی کی طرح سراؔج کے یہاں بھی مضامین کا تنوّع اور خیالات کی رنگارنگی ملتی ہے۔سراؔج کے کلام میں کسی طرح کی پیچیدگی اور ذو معانی الفاظ نہیں ملتے۔میرؔ نے ''نکات الشعرا'' میں اور میر حسؔن نے اپنے ''تذکرہ'' میں تحریر کیا ہے کہ سراؔج کو سیّد حمزہ دکنی سے تلمّذ حاصل تھا مگر دکن میں کسی شاعر کا نام سیّد حمزہ یا سیّد حمزہ علی نہیں تھا۔گمان غالب ہے کہ سراؔج نے کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی لیکن بزرگوں کی صحبت اور مشّاقی نے سراؔج کو اپنے دَور کا سب سے بڑا شاعر بنا دیا۔سراؔج کے کلام کی خصوصیات کا مطالعہ گہرائی سے کیا جائے تو ہمیں ان کی شاعری میں تکلّف اور بناوٹ کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ان کی شاعری سیدھی سادی بیانیہ شاعری ہے۔

سراؔج نے ایک دیوان فارسی کا اور ایک ریختہ کا (جس میں پانچ ہزار ۵۰۰۰ اشعار شامل ہیں) اپنی یادگار چھوڑے۔''منتخب دیوانہا'' کا ذِکر اوپر آچکا ہے۔اور مثنوی ''بوستانِ خیال'' کا تذکرہ بھی پچھلے صفحات میں مذکور ہے۔رام بابو سکسینہ نے سراؔج کی شاعری کی خصوصیات مختصر لفظوں میں اس طرح بیان کی ہیں:

''آپ کا کلام بھی ولؔی کی طرح ایہام و ذو معنی الفاظ سے پاک و صاف ہے۔سیدھا سادہ بیان ہے۔تکلّف و بناوٹ کا نشان نہیں۔اکثر غزلوں میں حسن و عشق کے کرشمے،بعض اشعار میں توحید و معرفت کا نقشہ،مضامین میں شگفتگی، خیالات میں بلندی اور کلام میں صفائی اور سادگی موجود ہے۔ریختہ میں ولؔی کے قائم مقام تھے۔دکن میں استادی کے مرتبے کو پہنچے۔ولؔی نے اس زمین میں جو کچھ سبزے لگائے سراؔج نے ان کو اپنی توجّہ کے پانی سے سیراب و شاداب کیا۔''

(تاریخ ادب اردو،ص۔۵۲)

ولؔی کی شاعری کی بنیادوں کو سراؔج نے کس طرح مضبوط کیا اور اسے کس انداز میں سیراب و شاداب کیا اس کا اندازہ آپ درج ذیل اشعار سے لگا سکتے ہیں۔جن میں سراؔج نے موسیقیت، جاذبیت، جدّت اور طراوت کو معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی

نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمتِ غیب سیں کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہو سو ہری رہی

سراؔج کے یہاں مختلف عشقیہ کیفیات میں تمیز کرنے اور انہیں الفاظ کی گرفت میں لانے کی زبردست صلاحیت ہے۔ عشق نے ان کے اندر ایک ایسا آہنگ اور احساسِ موسیقی پیدا کیا کہ وؔلی کے الفاظ سے کہیں زیادہ شگفتہ اور تروتازہ نظر آتے ہیں۔ سراؔج کے عشقیہ جذبات میں ایک گرمی، جلانے اور تڑپانے والی کیفیت بہت نمایاں ہے اور یہ کیفیت جب سرشاری اور بےخودی سے پیدا ہونے والے آہنگ، آواز اور لَے کو ساتھ لے کر الفاظ کے قالب میں اُترتی ہے تو الفاظ زندہ ہو جاتے ہیں اور شعر منہ سے بولنے لگتے ہیں۔ جمیل جالبی سراؔج کے شعری احساسات اور تخلیقی توانائی کا احاطہ کرنے کی ایماندارانہ کوشش کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں:

''دل چسپ بات یہ کہ عشق میں انتہائی شدّت ہے۔ وارفتگی ہے، عالمِ جذب وشوق میں صحرا صحرا پھرنے اور گریبان چاک کرنے کا احساس ہے لیکن اس کے ساتھ اظہار و بیان میں ایک نیا پن، ایک توازن ہے۔ یہاں دل اور دماغ بیک وقت مل کر ایک وحدت بناتے ہیں۔ اسی تخلیقی عمل میں سراؔج کی عظمت کا راز چھپا ہے۔ یہی وہ شعور ہے جو انہیں صفِ اوّل کا شاعر بنا دیتا ہے اور وؔلی کی روایت ''ریختہ'' تیزی سے اپنا چولا بدل کر اتنی آگے بڑھ جاتی ہے کہ میؔر کی شاعری، امکان کے اُفق پر ابھرنے لگتی ہے۔'' (تاریخ ادب اردو، جلد اوّل۔ ص۔ ۵۷۰)

شاعری کا ملکہ سراؔج کی فطرت میں اس طرح ودیعت کیا گیا ہے جس طرح ایک خوش نوا پرندے میں نغمہ سرائی کا ذوق ہوتا ہے۔ یہی چیز انہیں شعر کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ جتنی قلیل مدّت کے اندر ان کی شاعرانہ قابلیت کا نشو ونما ہوا وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک طرف فطری لگاؤ اور دوسری طرف شعرا کے کلام کے وسیع مطالعے نے سراؔج کے شعری مذاق اور معیار کو بہت بلند کر دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سراؔج نے اسی فطری دباؤ کے تحت شعر کہنا شروع کیا تھا لیکن پھر انہوں نے اس کو اپنے مرتبے سے کم تر چیز سمجھ کر بہت جلد ترک کر دیا۔ سراؔج کی شاعری ہر حقیقی شاعری کی طرح اتنی انفرادی خصوصیات کی مالک ہے کہ دوڈھائی سو سال کی وسیع شعری پیداوار کے باوجود ان کی شاعری کا رنگ آج بھی سب سے الگ اور ممتاز ہے۔ شاعری میں سراؔج نے وؔلی سے استفادہ کیا۔ چناچہ وہ اپنی زندگی ہی میں وؔلی کے جانشین کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ سراؔج ایک خاموش صناع (کاریگر) تھے۔ جس کو اپنے کمالات کا خود بھی علم نہ ہو۔ طبعاً وہ عزلت پسند واقع ہوئے تھے۔ سراؔج کی طبیعت ایک معیّن رفتارِ آبِ جُو جیسی تھی جو خاموشی کے ساتھ اپنا نغمہ سناتی ہوئی گزرتی ہے اور جس زمین میں پہنچتی ہے، اُسے گلزار بنا دیتی ہے۔ دیکھیے سراؔج کا وہی انداز جو خاموشی سے اپنی شعری حسیّت کا پیغام کتنی خوب صورتی سے پہنچاتا ہے:

ایک دن نین جھروکے کی طرف سیں گزرو مردمِ چشم ہے محتاج مری آنکھوں میں
ارے غم صبح آنے کی خبر ہے سرو قامت کی قیامت کل کوں آتی ہے عمل کر لے تو آج اپنا
زنجیر بھلی، قید بھلی، موت بھی جیوں تیوں پن حق نہ کرے کس کوں گرفتار کسی کا

سراؔج کی شاعری مجسم درد ہے اور وہ حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ بار بار اس درد کا ذِکر کرتے ہیں اور درد کی کیفیت اتنی شدید ہوتی ہے کہ قاری اسے اپنا درد محسوس کرنے لگتا ہے:

ازل سیں مجھ کوں دیا درد صانعِ تقدیر
مرے نصیب کے شربت میں زہر گھول چکا

کوئی ہمارے درد کا محرم نہیں　　آشنا نئیں، دوست نئیں، ہم دَم نہیں
عالمِ دیوانگی کیا خوب ہے　　بے کسی کا واں کسی کو غم نہیں
کسی کو رازِ پنہاں کی خبر نئیں　　ہمارے درد کوں کم جانتے ہیں
طبیباں پاس جانا دردِ سر ہے　　جگر کے درد کوں کم جانتے ہیں
جہاں مجھ غم کی آتش جلوہ گر ہے　　وہاں دوزخ کا قصّہ مختصر ہے

یہ درد و سوز میرؔ کے کلام کی بھی ایک خصوصیت ہے لیکن ان کا مخصوص نغمہ یاس ہے اور وہ اس مضمون کے بادشاہ ہیں لیکن سراؔج کے پاس ایک حسّاس قناعت، تسلیم و رضا، سپردگی بلکہ درد کی لذّت کی چاشنی موجود ہے۔ ان کے یہاں انتقام یا شکایت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کی اہم خصوصیت ان کا دردانگیز انداز ہے اور یہ خصوصیت نہ صرف ان کی غزل میں موجود ہے بلکہ ہر صنفِ کلام میں یہی تاثیر اور صفت پائی جاتی ہے۔ ان کی ایک مثنوی کا عنوان ہی ''سوز و گداز'' ہے۔ یہ دراصل سراؔج کی متصوّفانہ اور روحانی زندگی کا مسلک تھا اور یہی ان کی عین حیات تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ صبر و قناعت کا جو احساس ان کے کلام میں جاری و ساری نظر آتا ہے، اس سے اُس کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اپنی قسمت کے غم و رنج میں شاکر ہوں سراؔج
جو منجّم نے ازل کے، مری تقویم کیا

سراؔج کا عقیدہ تھا کہ ہستی محبت کے سوا کچھ اور نہیں۔ عشق، برقِ جاں سوز ہے لیکن یہ سوز لذّت سے خالی نہیں۔ انہیں اس سودے میں نفع کی فکر نہیں رہتی بلکہ اس برقِ جگر سوز کی روشنی میں انہیں حقیقتِ دنیا نظر آ گئی۔ یہ شعر دیکھیے۔

روشن ہے سبب عشق کے کیفیتِ عالم
آئینۂ دل ساغرِ جمشید ہوا ہے

محبت کے جذبے کے غیر اختیاری ہونے کا بھی انہیں پورا یقین تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ہے بسملِ شمشیر نگہ ذوق میں اپنے
دل حشر میں کس مُنہ ستی فریاد کرے گا
مت کرو شمع کوں بدنام، جلاتی وہ نہیں
آپ میں شوق پتنگوں کو ہے جل جانے کا

ان کے نزدیک عشق کی بدولت جو مصیبتیں نازل ہوتی ہیں وہ عاشق کا طرّہ امتیاز ہیں۔اسے وہ عاشق کی معراج تصوّر کرتے ہیں:

تڑپنا ، تلملانا ، غم میں جلنا ، خاک ہو جانا
یہی ہے افتخار اپنا، یہی ہے اعتبار اپنا

عشق نے خوں کیا ہے دل جس کا ‏ پارۂ لعل اشک ہے تس کا
چشمِ ساقی کا وصف لکھتا ہوں ‏ لے قلم ہات شاخِ نرگس کا
تم نے پائے ہو حُسن کی دولت ‏ پوچھتے کب ہو حال مفلس کا
بے کسی مجھ سیں آشنا ہے سراؔج ‏ نئیں تو عالم میں کون ہے کس کا

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ سراؔج نے اپنا دیوان کس عمر میں مکمّل کیا؟
﴿۸﴾ سراؔج کی مثنوی کا نام لکھیے؟
﴿۹﴾ چلی سمتِ غیب سیں کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا۔اس کا مصرعِ ثانی بتائیے؟

03.05 سراؔج اورنگ آبادی کی پہلی غزل

﴿۱﴾

﴿۱﴾ قد ترا سروِ رواں تھا مجھے معلوم نہ تھا
گلشنِ دل میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

﴿۲﴾ یار نے ابرو و مژگاں سیں مجھے صید کیا
صاحبِ تیر و کماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

﴿۳﴾ سب جگت ڈھونڈ پھرا یار نہ پایا لیکن
دل کے گوشہ میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

﴿۴﴾ نگہِ شوخ نے دل ایک کرشمہ میں لیا
کیا بلا سیف زباں تھا مجھے معلوم نہ تھا

﴿۵﴾ شبِ ہجراں کی نہ تھی تاب مجھے مثلِ سراؔج
رُخ ترا نور فشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

03.06 سراؔج اورنگ آبادی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ یہ پوری غزل تصوّف کے موضوعات پر مشتمل ہے مگر سراؔج نے اس میں تصوّف کے مسائل اپنی لاعلمی کی زبان سے ادا کیے ہیں۔سراؔج اپنے محبوب سے مخاطب ہوکر اپنی ہر اُس لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں جوان کے ذہن ودل کے دریچے نے انہیں محسوس کرایا۔یہ پوری غزل نہایت تسلسل کے ساتھ اظہارِ بیان کا خوب صورت مرقّع ہے۔جس میں غنائیت،موسیقیت اورالفاظ ومعانی کی ایک حسین دنیا موجود ہے۔ہر جگہ شاعر کو خدا ہی خدا دکھائی دیتا ہے اور سراؔج اپنی لاعلمی کا اظہاراس انداز میں کرتے ہیں کہ مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔کہ اس یار کا نام ونشان بھی ہے۔حالاں کہ اس کا نام ونشاں موجود ہے۔سراؔج کی یہ پوری غزل علمِ معرفت کی گہرائیوں کا پتہ دیتی ہے۔

غزل کی تشریح:۔

شعراوّل: شاعراپنے محبوب سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ تیرا قد اس سرو درخت کی طرح خوب صورت،طویل اور جاذبِ نظر ہے اور مجھے اس بات کی بھی خبر نہیں تھی کہ تو میرے دل میں ہی جلوہ گر ہے۔یعنی گلشنِ دل میں ہی ظاہری طور پر موجود تھا۔اس بات کی کوئی خبر نہیں تھی۔

دوسرا شعر: ایک استعاراتی انداز کا یہ شعر ہے۔جس میں شاعر نے اپنے محبوب کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ میرے یار نے بھوؤں اور مژگاں سے میرا شکار کیا۔یعنی اس کی آنکھوں کی دل فریبی نے مجھے اس کے دام میں گرفتار ہونے پر مجبور کیا۔مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ تیروکمان رکھتا ہے۔یہاں شاعر نے ابرومژگاں کو تیروکمان سے تشبیہ دی ہے۔شکل میں دونوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔صنعتِ تشبیہ کی خوبی اس شعر میں موجود ہے۔

تیسرا شعر: اس شعر میں عام صداقت کا اعلان ہے کہ محبوبِ حقیقی کو میں نے پوری دنیا میں تلاش کرلیا لیکن مجھے اس کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔وہ تو میرے دل کے گوشے میں ہی پوشیدہ تھا اور مجھے اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔

چوتھا شعر: نگاہِ شوؔق نے میرا دل ایک ہی جھٹکے میں لے لیا یعنی میں خود سے بے خبر ہوگیا۔اس کی زبان میں کیسی تلوار کی کاٹ ہے، مجھے معلوم نہیں تھا۔اس کی زبان کو سیف یعنی تلوار سے مشابہت دی گئی ہے اور اس شوخ کی نگاہ کو ایک ضرب پہنچانے والی شَے قرار دیا ہے۔یعنی عاشق کو اس شوخ کی نگاہوں نے ایک ہی ضرب میں گرفتارِ دام کر کے اپنے قبضے میں لے لیا۔اس کی زبان میں کس بلا کی تاثیر تھی۔

پانچواں شعر: جس طرح سراج کو یعنی چراغ کو جدائی کے غم میں تاب نہیں رہتی وہ چراغ جدائی کی طرح پوری رات جلتا ہی رہتا ہے ۔مجھے نہیں معلوم تھا کہ تیرا حُسن ، تیرا چہرہ اس قدر روشن تھا جیسے چراغ روشن ہوتا ہے۔میں اس حُسن میں کھو گیا اور تیری جدائی میں چراغ کی طرح پوری رات جلتا رہا۔مجھے تیری خوب صورتی اور نور کا اندازہ ہی نہیں تھا۔یہاں سراؔج نے اپنے تخلص سے خوب فائدہ اُٹھایا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ تیسرے مصرعے میں شاعر نے ''ابرو ومژگاں'' کو کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟

﴿۱۱﴾ ''میں سمجھتا تھا کہ اس یار کا ہے نام ونشاں'' میں 'یار' سے کیا مراد ہے؟

﴿۱۲﴾ ''شبِ ہجراں کی نہ تھی تاب مجھے مثلِ سراج'' میں 'شبِ ہجراں' سے کیا مراد ہے؟

03.07 سراؔج اورنگ آبادی کی دوسری غزل

﴿۲﴾

﴿۱﴾ خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

﴿۲﴾ شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

﴿۳﴾ نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں
کہ شرابِ صد قدح آرزو خُمِ دل میں تھی سو بھری رہی

﴿۴﴾ ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سیں یہاں ہوا
کہ نہ آئنہ میں رہی جلا نہ پری کوں جلوہ گری رہی

﴿۵﴾ کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراؔج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

03.08 سراؔج اورنگ آبادی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ اس غزل میں ایک خاص موسیقیت ہے جو قاری کو اپنے جادو میں گرفتار کر لیتی ہے۔ خدا کی یاد میں جو لوگ غرق ہوتے ہیں انہیں ایسی استعجاب و حیرت کی دنیا کی سیر کرنی ہوتی ہے۔ جہاں پہنچ کر ''تو'' اور ''میں'' کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ صرف ذاتِ واحد کی یاد رہتی ہے اور وہی ہر طرف دکھائی دیتا ہے۔ پوری غزل تصوّف کی ترجمانی کرتی ہے اور اس لمحے کی بیانیہ تصویر کشی کرتی ہے جس لمحے عاشق کو محبوب کا وصال نصیب ہوتا ہے۔ اس وقت عاشق پر کیسی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ کن آزمائشوں سے گزرتا ہے۔

غزل کی تشریح:۔

شعر اوّل: اس شعر میں شاعر اس کیفیت کو بتاتا ہے جو حیرتِ عشق کی ہوتی ہے یعنی اب تو عشق کی حیرت کی خبر سن کر اس کے عشق میں نہ جنوں رہا نہ پری رہی اور اس حالت میں نہ تو تو رہا اور نہ میں رہا۔ یعنی نہ تجھ کو تیری خبر ہے اور نہ مجھے اپنے وجود کا احساس ہے۔ بس ایک بے خبری کا عالم ہے۔

دوسرا شعر: اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ بےخودی کے بادشاہ نے مجھے برہنگی کا لباس عطا کیا ہے اور اس لباس کو زیبِ تن کرنے کے بعد نہ اب ہوش باقی رہا اور نہ جنوں کی بخیہ گری کا احساس ہے۔ میں اب ہوش وخرد سے عاری ہو چکا ہوں۔ یہی اس لباس کی خصوصیت ہے کہ جو اس کو پہنتا ہے اسے ہوش وحواس سے بےخبر ہو جانا پڑتا ہے۔

تیسرا شعر: میں اپنے یار کی نظر کے تغافل کا شکوہ کس زبان سے کروں کہ وہ کس طرح مجھ سے غافل ہے اور اس کی غفلت کی وجہ سے میری کیا کیفیت ہے۔ آرزو کے سو پیالوں کی شراب جو دل کے خُم میں تھی وہ بھری کی بھری رہی۔ میں اس کی ایک غفلت کا شکوہ کیا کروں یہاں تو پورا دل آرزو کے شراب سے پُر ہے تو صرف ایک آرزو کے پورا نہ ہونے کی شکایت کیا کروں۔

چوتھا شعر: شاعر کہتا ہے کہ تیرے حُسن کے جوش کی حیرت کا اس قدر اثر ہوا کہ آئینہ بھی اپنی شفافیت کھو چکا اور پری کی جلوہ گری بھی ختم ہو گئی۔ یعنی شاعر اپنے محبوب کے حُسن کی تعریف میں آئینے کی چمک اور پری کی جلوہ گری کو بھی ہیچ قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تیرے حُسن کی دولت میں اتنی تاثیر ہے کہ آئینہ اور پری نے اپنی حقیقت اور ماہیت کھو دی ہے اور یہ دونوں حُسن کی گرمی میں خاک ہو گئے ہیں۔

پانچواں شعر: غزل کے آخری شعر میں شاعر کہتا ہے کہ عشق کی آگ نے بےنوا سراج کے دل کو خاک بنا ڈالا کہ اس کے بعد کوئی خطرہ نہ رہا، نہ کوئی چیز باقی رہی۔ بس ایک بےخطری کی کیفیت اُس کے اوپر طاری ہے۔ یعنی عشق میں جلنے کے بعد انسان کو دنیا کی کوئی پرواہ نہیں رہتی اور نہ ہی کسی چیز سے بچنے کا احساس باقی رہتا ہے۔ اس آگ میں جل کر انسان بےخوف وخطر ہو جاتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۳﴾ سراؔج کی اس غزل میں کس چیز کی بالادستی موجود ہے؟

﴿۱۴﴾ قدحِ آرزو سے کیا مراد ہے؟

﴿۱۵﴾ پوری غزل کس رنگ میں رنگی ہوئی ہے؟

﴿۱۶﴾ سراؔج کی یہ غزل کیوں مشہور ہے؟

﴿۱۷﴾ ''کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بےنوائے سراج کو'' مصرع ثانی لکھ کر مکمّل کیجیے۔

03.09 خلاصہ

سیّد سراج الدّین سراؔج اورنگ آبادی جنوبی ہند کے تیسرے بڑے شاعر تھے۔ سراؔج کا مولد اورنگ آباد ہے جہاں وہ ۱۷۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ سادات حسینی خاندان سے تعلّق رکھتے تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں ہی ہوئی۔ ۱۲؍سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرتے رہے اور بعد ازاں ان پر جذب کی کیفیت طاری ہوگئی اور صحرانوردی کے لئے نکل پڑے اور اسی جذب کی حالت میں فارسی اشعار ان کی زبان پر جاری ہوتے تھے۔ ۲۴؍سال کی عمر میں انہوں نے اپنا دیوان مکمّل کیا۔ مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب بعنوان ''منتخب دیوانہا'' کے نام سے ترتیب دیا۔ ایک مثنوی ''بوستانِ خیال ۱۷۴۷ء میں لکھی جو کافی مشہور ہوئی۔ سراؔج نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ۱۷۴۷ء میں سراؔج نے حضرت شاہ عبدالرحمٰن کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ اس وقت سراؔج کی عمر ۲۴؍سال تھی۔ وہ ابھی لاابالی پن کی زندگی گزارتے تھے۔ سراؔج جب اپنے مرشد کی خدمت سے الگ ہوتے تو ان کا زیادہ تر وقت شعر موزوں کرنے میں گزرتا تھا۔ ان کے یہاں دوست احباب

کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ سراؔج کی شاعری میں عشق کی کیفیت کی سربلندی پائی جاتی ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں ان کا جواب نہیں۔ سلیس اور رواں زبان میں اپنے اشعار لکھتے ہیں اور ان کے اشعار میں ایک خاص قسم کی موسیقیت پائی جاتی ہے۔ تصوّف و معرفت کا رنگ ان کی پوری شاعری میں چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے اور یہی رنگ ان کی اکثر و بیشتر غزلوں پر غالب ہے۔ سراؔج نے خطوط بھی لکھے اور مختلف مثنویاں بھی لکھیں۔ مثنوی ''بوستانِ خیال'' میں ایک ہزار سات (۱۰۰۷) ابیات ہیں اور ''گل و بلبل'' کے افسانے میں جذبات اور معرفت کی ترجمانی موجود ہے۔ سراؔج کا ۱۷۶۳ء میں انتقال ہوا۔

03.10 فرہنگ

آب جُو	چشمہ، ندی، نالہ، نہر	سرشاری	لبریز ہونا، نشے میں چور ہونا، لبالب، چھلکتا ہوا
آپ بیتی	اپنی زندگی کی روداد، زندگی کے حقائق بیان	سوزِ جگر	دل کی تڑپ، جگر کی تپش
	کرنا	شعری حسّیت	اشعار کی خوبی محسوس کرنے کی قوت
اصنافِ سخن	شاعری کی مختلف قسمیں مثلاً غزل، نظم، قصیدہ	شغف	بے انتہا رغبت، غایت درجہ دلچسپی
	اور رباعی وغیرہ	صانعِ تقدیر	تقدیر بنانے والا، اللہ تعالیٰ
تحیرِ عشق	عشق کی حیرت انگیزی	صحرا نوردی	جنگلوں میں آوارہ پھرنا، بیابان میں پھرنا
تخیّل	قوّتِ متخیّلہ، تصوّر، خیال	صنّاع	کاری گر، ہنرمند، فن کار
چمنستان	باغ، پھولوں کا باغ، پھلواری، گلزار	قادر الکلام	کلام پر قابو، اور قدرت رکھنے والا
خوش گفتار	اچھی گفتگو کرنے والا، عمدہ بات کرنے والا	محاکمہ	دعویٰ، فیصلہ، انصاف طلبی
دواوین	دیوان کی جمع، شاعر کی موت کے بعد اس کا	محویت	خیال میں گم، غرق ہونا، استغراق
	شعری مجموعہ جو منظرِ عام پر آئے	معتقد	عقیدہ رکھنے والا، اعتقاد رکھنے والا
ریختہ	پڑا ہوا، بکھرا ہوا، اردو جو مختلف زبانوں سے	منجّم	علمِ نجوم کا ماہر، ستارہ شناسی کا ماہر
	مل کر بنی ہے	نہالِ غم	غم کی خوشی

03.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰۔۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : سراؔج کی غزلِ دوم کا خلاصہ پیش کیجیے۔

سوال نمبر ۲ : سراؔج کے یہاں عشق کی بالادستی موجود ہے۔ اظہارِ خیال کیجیے۔

سوال نمبر ۳ : مثنوی ''بوستانِ خیال'' پر اظہار کرتے ہوئے سراؔج کے شعری اوصاف لکھیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰۔۳۰ رسطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : سراؔج کی زندگی کے اہم کارناموں کا ذِکر کیجیے۔

سوال نمبر۲ : سراؔج اورنگ آبادی کی شاعری کی خصوصیات مع مثال تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۳ : سراؔج کے دوست، شیخ اور مرشد کے سوانحی اوصاف بیان کیجیے۔

03.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	از	سیّد احتشام حسین
۲۔	تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	از	جمیل جالبی
۳۔	کلّیاتِ سراج	از	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

03.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ اورنگ آباد میں ۱۷۱۴ء میں

﴿۲﴾ ۱۲رسال تک

﴿۳﴾ ''منتخب دیوانہا''

﴿۴﴾ فارسی زبان میں

﴿۵﴾ ۱۷۶۳ء میں

﴿۶﴾ آبرو کا

﴿۷﴾ چوبیس (۲۴) سال کی عمر میں

﴿۸﴾ بوستانِ خیال

﴿۹﴾ مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہو سو ہری رہی

﴿۱۰﴾ تیر وکمان سے

﴿۱۱﴾ خدا کی ذات

﴿۱۲﴾ جدائی کی رات

﴿۱۳﴾ عشق کی

﴿۱۴﴾ دل جو کہ آرزوؤں اور خواہشوں کا مسکن ہے

﴿۱۵﴾ تصوّف کے رنگ میں

﴿۱۶﴾ سادگی، موسیقیت اور عشق کی خصوصیات کی منفرد بیانیہ انداز کی وجہ سے

﴿۱۷﴾ نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی۔

بلاک نمبر 02

اکائی 04 خواجہ میر دردؔ

اکائی 05 میر تقی میرؔ

اکائی 06 مرزا غالبؔ

اکائی 04 : خواجہ میر دردؔ

ساخت

04.01 : اغراض ومقاصد
04.02 : تمہید
04.03 : خواجہ میر دردؔ کے حالاتِ زندگی
04.04 : خواجہ میر دردؔ کی شاعرانہ خصوصیات
04.05 : خواجہ میر دردؔ کی پہلی غزل
04.06 : خواجہ میر دردؔ کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
04.07 : خواجہ میر دردؔ کی دوسری غزل
04.08 : خواجہ میر دردؔ کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
04.09 : خلاصہ
04.10 : فرہنگ
04.11 : نمونہ امتحانی سوالات
04.12 : حوالہ جاتی کتب
04.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

04.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں خواجہ میر دردؔ کی شخصیت اوران کی شاعری کا اجمالی جائزہ پیش کیا جائے گا۔خواجہ میر دردؔ کی دوغزلیں اس اکائی میں شامل کی جائیں گی اوران دوغزلوں کا مجموعی تاثر اورتشریح بھی پیش کی جائے گی۔مشکل الفاظ کے معانی بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں۔اس اکائی کے مطالعے کے بعدتوقع کی جاتی ہے کہ آپ میر دردؔ کی شاعری کی خصوصیات اوران کی زندگی کی مختلف جہات سے واقف ہو جائیں گے۔

04.02 تمہید

اٹھارہویں صدی میں جن شعرانے شہرت ونام وَری حاصل کی ان میں خواجہ میر دردؔ کا نام سرِفہرست ہے۔ان کی مقبولت کی وجہ ان کا عارفانہ کلام اورتصوّف ومعرفت سے لبریز شعری تخلیقات ہیں۔ان کی شاعری اپنے زمانے کی روایتی شاعری سے یکسر مختلف ڈگر پررواں دواں نظر آتی ہے۔جہاں کائنات کی حقیقتیں اورمتصوّفانہ جہتیں بخوبی نظر آتی ہیں۔ان کا تعلّق کسی خاص گروہ یا ادبی حلقے سے نہیں تھا بلکہ انہوں نے اپنی شاعری کو ایک الگ نہج پراورایک نئے تیور کے ساتھ پیش کرکے اہلِ ادب کو معترف ہونے پر مجبور کیا۔

04.03 خواجہ میر دردؔ کے حالاتِ زندگی

خواجہ میر دردؔ ۱۷۲۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ تھا جو اپنے دَور کے مشہور صوفی شاعر تھے۔ دردؔ کو تصوّف کی بنیادی تعلیمات ان کے والد کے توسل سے حاصل ہوئیں۔ چوں کہ خاندان میں تصوّف و معرفت کا چرچا تھا اور اسی ماحول میں دردؔ کی پرورش ہوئی تو ظاہری بات ہے اس کا اثر دردؔ کی شاعری اور ان کی زندگی پر پڑنا لازمی تھا۔ دردؔ نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کی۔ والد کے اصرار پر انہوں نے وسطِ جوانی میں علومِ رسمیہ کی تحصیل کی۔ عقائد، معقولات اور اصولِ تصوّف وغیرہ پر دست رَس حاصل کی۔ علاوہ ازیں دیگر علوم ضرورت کے مطابق حاصل کیے۔ دردؔ کی تصانیف اس بات کی غمّازی کرتی ہیں کہ دردؔ کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر کامل عبور تھا۔

دردؔ کو اپنے والد کی طرح اکتسابی علوم کے بجائے وہبی علوم کی دولت میسّر تھی۔ انہوں نے درسی علوم سے بے نیازی اختیار کر لی تھی اور یہ روایت انہیں وراثت میں ملی تھی۔ دردؔ نے عہدِ جوانی میں ہی تصوّف کے مسلک کو اختیار کر لیا تھا۔ وہ ایک بزرگ عالم اور ذہین شخص تھے۔ انہوں نے فارسی میں کئی کتابیں لکھیں۔ دردؔ کو فنِ موسیقی سے خاصا شغف تھا اور شاعری میں تو کامل شمار ہوتے تھے۔ جب دلّی کی حالت بہت خراب ہوگئی اور سبھی اسے چھوڑ کر باہر جانے لگے۔ اس وقت بھی دردؔ نے اپنی چوکھٹ نہیں چھوڑی۔ ان کا ایک مختصر سا دیوان ملتا ہے۔ جس میں اردو اور فارسی کی غزلیں ہیں لیکن ان کی شاعری میں تصوّر کے عناصر بھرپور انداز میں ملتے ہیں۔

خواجہ میر دردؔ نے اپنے زمانے کے دو استادوں سے فارسی زبان و ادب کا سبق لیا۔ یہ دو استاد مفتی دولت اور سراج الدّین خاں آرزوؔ تھے۔ سراج الدّین خاں آرزوؔ اس زمانے کے بہت بڑے عالم تھے اور میر تقی میرؔ کے ماموں تھے۔ اس زمانے میں کوئی شخص اس وقت تک ماہر نہ سمجھا جاتا تھا۔ جب تک اس نے خان آرزوؔ سے نہ پڑھا ہو۔ علاوہ ازیں دردؔ نے اپنے والد خواجہ ناصر عندلیب سے اپنی تعلیم مکمّل کی۔ مذہبی علوم، قرآن، علمِ حدیث، تفسیر، فقہ اور تصوّف میں مہارت حاصل کی۔ موسیقی سے لگاؤ اور اس میں مہارت ہونے کی وجہ سے اس زمانے کے بڑے بڑے موسیقاران سے فنِ موسیقی کی تعلیم لینے آتے تھے۔ ان کے گھر پر ہر ماہ کی دوسری اور چوبیس تاریخ کو سماع کی محفل منعقد ہوتی تھی۔ جس میں بڑے بڑے موسیقار اور قوّال اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان محفلوں میں بڑے بڑے امیر، وزیر، اور بادشاہانِ وقت بھی شریک ہوتے تھے۔

دردؔ غیر معمولی خوبیوں کے حامل تھے۔ سیّدوں کے ایک اعلیٰ گھرانے سے دردؔ کا تعلّق تھا۔ جن کے ماحول میں مذہب سے دل چسپی اور خدا کی محبت بسی ہوئی تھی۔ ان کے آبا و اجداد مغل دربار میں اونچے عہدوں پر فائز رہے تھے۔ اس کے باوجود دردؔ کی طبیعت میں خدا کا خوف، مذہب کی پابندی، بے نیازی، رحم، ہم دردی کا جذبہ اور درویشی کی صفت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ دردؔ کی شخصیت کی بلندی اور خوش اخلاقی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس زمانے کے جتنے بھی تذکرے لکھنے والے ہیں۔ سب نے دردؔ کا ذِکر بڑے خوب صورت اور مثبت انداز میں کیا ہے۔ سارے تذکرہ نگاروں کی گردن دردؔ کی بزرگی کے آگے جھکی رہی اور لوگوں نے دردؔ کی برائی کے متعلّق ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ میر تقی میرؔ اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''نکات الشعرا'' میں دردؔ کا خاکہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

’’وہ (دردؔ) بزرگ ہیں اور بزرگ کے بیٹے ہیں۔ جوانِ صالح ہیں۔ درویشی میں انہیں بڑادرجہ حاصل ہے۔مجھ فقیرکوان کا خاص قرب اورعقیدت حاصل ہے۔ ویسے ان کا حُسنِ سلوک ہرایک کے لئے عام ہے۔انہوں نے دنیاوی عزّت کی خواہش کودل سے نکال دیا ہے۔‘‘

(خواجہ میر دردؔ،احمد ظہیر صدّیقی ص.۱۹)

میرؔحسنؔ نے’’تذکرہ شعرائے اردو‘‘میں انہیں عالمِ خوش دل،درویش،نکوصفات اورآسمانِ سخن کا آفتاب کہا ہے۔
غلام ہمدانی مصحفیؔ جواس زمانے کےمشہورشاعراورتذکرہ نگار ہیں۔اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:

’’سبھی عجیب وغریب فنون کے ماہر،فقر،توکّل اور بے نیازی میں بے مثال ہیں۔‘‘

خواجہ میر دردؔاپنے اُصولوں کےسخت پابند تھےاوران کی خاطر بڑی سے بڑی شخصیت کوبھی خاطر میں نہیں لاتے تھےاور نہ ہی اس سے مرعوب ہوتے تھے۔ان کی محفل میں امیر وغریب کی کوئی تخصیص نہیں تھی اور دونوں کے لئے اُن کا سلوک یکساں تھا۔ وہ ایک خوددار انسان تھے۔انہوں نے نہ کسی امیراوروزیرکی خوشامد کی اور نہ ہی کسی دربار سے وابستہ رہے۔دردؔایک سچّے اور پکّے مسلمان تھےاورخدا کے سوا کسی کے آگےاپنی ضرورت اوراحتیاج کےتعلّق سےسوال کرنے کوباعثِ عارمحسوس کرتے تھے۔کسی بھی انسان سے مدد مانگناان کی خودداری اورعزّت کےخلاف تھا۔

دردؔنے ابتدا میں شاہ عالم بادشاہ کی فوج میں ملازمت کی اورسپاہی کا پیشہ اختیار کیالیکن یہ ملازمت ان کےمزاج کےمطابق نہیں تھی اور کچھ عرصے بعداس نوکری سے دست بردار ہوگئے اور۲۹/سال کی عمرمیں دنیاداری سے الگ ہوکر درویشی کی زندگی اختیار کرلی۔ دنیاوی شان وشوکت اور جاہ ومنصب کا خیال ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا اور بقیہ زندگی راہِ خدا میں اور یادِ خدا میں گزار دی۔ میرؔ دردؔ کی اس درویشانہ وضع اورصوفیانہ مزاج کی تعمیر میں بظاہر جوعوامل کارفرما تھے۔ان میں سب سے زیادی مستحکم عنصرخودخواجہ ناصر کی تعلیمات اوران کے روحانی فیوض تھے۔شاہ سعداللہ گلشن اورشاہ زبیر سے بھی دردؔنے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ان دونوں میں سعداللہ گلشن سے دردؔکونسبتاً زیادہ مناسبت تھی۔شاہ گلشن کا شعری ذوق اورموسیقی کی طرف ان کا رجحان دردؔکےمزاج سے زیادہ ہم آہنگ تھا۔

موسیقی اورراگ کا شغف بھی دردؔکو بڑی حدتک وراثت میں ملاتھا۔حالاں کہ دردؔکا میلانِ طبع،غنااورموسیقی کی طرف تھااوران کے والداورمرشدخواجہ ناصرعندلیبؔ بھی موسیقی کے بڑے دل دادہ تھے۔ان کے روحانی پیشواشاہ سعداللہ گلشن فنِ موسیقی میں کمال کےسبب دہلی میں خسروِثانی کےلقب سے معروف تھے۔’’نالۂ عندلیب‘‘میں جگہ جگہ موسیقی کی اصطلاحوں اورمختلف راگوں کے حوالے،موسیقی پرخواجہ ناصر کی دست رَس اوراس علم کی فنّی باریکیوں سےان کی واقفیت کا پتہ دیتے ہیں۔قاضی جمال حسین،دردؔکی موسیقی سے متعلّق لکھتے ہیں:

’’خواجہ میر دردؔموسیقی سے اپنی دل چسپی کے متعلّق خود کہا کرتے تھے کہ نغمہ وسرودکو میں نہ تو فاسقوں، فاجروں کی طرح سنتا ہوں، جومجازی مجبوریوں کےتصوّرمیں دیوانے ہوتے ہیں اور کانوں کی لذّت پراکتفا کرتے ہیں۔اور نہ ہی ان مغلوب الحال صوفیا کی طرح جو چنگ ورباب کی فقط دل کش آوازوں پرسر دھنتے ہیں بلکہ جس طرح اہلِ علم مختلف طبعی علوم کو پڑھتے پڑھاتے ہیں اوراس کی باریکیوں کوخوب جانتے ہیں مگرعلما

کی طرح دل سے اس پر اعتقاد نہیں رکھتے۔اس طرح موسیقی کے ساتھ شغل کرتا ہوں کیوں کہ موسیقی ریاضی کی ایک پرمیوہ شاخ ہےاور طرفہ لطف واثر رکھتی ہے۔''

(خواجہ میر دردؔ،ص۔۳۷)

خواجہ میر دردؔ کا تعلّق خاندانی اور پیروں کے اعتبار سے نقشبندیہ سلسلے سے تھا۔انہوں نے اپنی کتاب ''نالۂ دردؔ'' میں صاف لکھا ہے کہ:

''میں اپنے بزرگوں کے طریقہ کو صحیح سمجھتا ہوں اور موسیقی کو عبادت یا اچّھی چیز خیال نہیں کرتا مگر میں اپنے شوق سے مجبور ہوں اور اس کو اللہ کی جانب سے سمجھتا ہوں۔خدا گواہ ہے کہ میں کبھی گانے والوں کو بلاتا نہیں۔وہ لوگ خود آتے ہیں اور جب تک جی چاہتا ہے،گاتے ہیں۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں موسیقی سے کس قدر دلچسپی تھی کہ اسے مذہباً اچّھا نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کے دل دادہ تھے۔ان کو صرف موسیقی سننے کا ہی شوق نہیں تھا بلکہ وہ خود بھی اس کے ماہر تھے اور بڑے بڑے موسیقار اور استادانِ موسیقی ان کے پاس اس لئے فن کا اظہار کرنے آتے تھے تاکہ ان کے مشورے سے اپنی غلطیاں درست کرلیں۔ان کے یہاں ہر مہینے سماع کی محفلیں سجتی تھیں۔محرّم میں سوز خوانی اور مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ خواجہ میر دردؔ کے والد کا کیا نام تھا؟

﴿۲﴾ خواجہ میر دردؔ نے کن دو استادوں سے فارسی کا درس حاصل کیا؟

﴿۳﴾ خواجہ میر دردؔ کا تعلّق کس سلسلے سے تھا؟

﴿۴﴾ 'نکات الشعرا' کس کی تصنیف ہے؟

04.04 خواجہ میر دردؔ کی شاعرانہ خصوصیات

دردؔ ایک مشہور صوفی شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔خواجہ میر دردؔ نہ صرف غزل کی روایت سے واقف تھے بلکہ اس روایت کا پورا احترام کرتے تھے۔دردؔ کا زیادہ تر کلام غزل کی شکل میں ملتا ہے۔جس پر تصوّف کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ان کے اشعار ان کے نام ہی کی طرح پُر درد اور پُر اثر ہیں۔ان کی زبان رواں اور لچک دار ہےجس میں دہلی کی بول چال کی مٹھاس بھی پائی جاتی ہے۔ہمیں یہ زبان میر تقی میرؔ کے بعد خواجہ میر دردؔ کے یہاں ملتی ہے۔جس طرح دردؔ کی زندگی سادہ تھی اسی طرح ان کی شاعری میں بھی کسی قسم کی بناوٹ اور تکلّف نہیں پایا جاتا۔خواہ وہ عشقیہ خیالات ہوں یا اخلاق اور تصوّف کے مضامین۔دردؔ کی شاعری ابتدا تا انتہا ایک ہی طرح کی سیدھی سادی اور دل میں اُتر جانے والی شاعری ہے۔کہیں الفاظ میں جھول نہیں پایا جاتا۔وہ شعر اسی وقت کہتے ہیں جب ان کے پاس کہنے کے لئے کوئی بات ہوتی ہے۔ان کا دیوان مختصر ضرور ہے لیکن اس میں بھرتی کے اشعار نہیں ہیں۔ان کی شاعری میں سادگی کی وجہ ان کا درویشانہ اور فقیرانہ مزاج ہے۔ ایک درویش کو کسی کی تعریف یا بُرائی کی فکر نہیں ہوتی ہے۔وہ ریاکاری اور دکھاوے سے بے نیاز رہتا ہے۔دردؔ کے یہاں کسی قسم کا تکلّف اور بناوٹ دیکھنے کو نہیں ملتی۔یہی بے تکلّفی ان کی شاعری کی اہم خوبی تصوّر کی جاتی ہے۔یہ اشعار دیکھیے:

جگ میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا   تُو ہی آیا نظر، جدھر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی   جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
اذیّت ، مصیبت ، ملامت ، بلائیں   ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے   تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے
نظر میرے دل کی پڑی دردؔ کس پر   جدھر دیکھتا ہوں، وہی روبرو ہے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے   ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ان اشعار میں اتنی سلاست اور روانی موجود ہے کہ ایک معمولی اردو جاننے والا انسان بھی اس سے محظوظ ہو سکتا ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ دردؔ کی شاعری متصوّفانہ رنگ سے لبریز ہے اور تصوّف کے رنگ میں رنگے ہوئے انسان کو عشقِ حقیقی کی بدولت ہر طرف خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔اس لئے دردؔ کہتے ہیں کہ دنیا میں جدھر بھی دیکھتا ہوں تیرا ہی جلوہ ہر شے میں نظر آتا ہے۔ان اشعار میں کس قدر دل کشی اور غنائیت ہے۔اس کا اندازہ آپ کو ان کے اشعار پڑھنے کے بعد بخوبی ہو گیا ہوگا۔اب ان اشعار کی روانی اور سادگی ملاحظہ فرمایئے:

تو بن کہے گھر سے کل گیا تھا   اپنا بھی تو جی نکل گیا تھا
اب دل کو سنبھالنا ہے مشکل   اگلے دنوں کچھ سنبھل گیا تھا
میں سامنے سے جو مسکرایا   ہونٹ اس کا بھی دردؔ دہل گیا تھا
نالہ ، فریاد ، آہ اور زاری   آپ سے ہو سکا جو کر دیکھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی   ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آسکے   آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

قاضی جمال حسین، دردؔ کی شاعری، علم و فضل اور شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو شاعری کی تاریخ میں دردؔ کا نام ان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کے سبب نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔ان کے معاصرین اور بعد کے لوگوں نے بھی ان کے علم و فضل، روحانی کمالات اور پُرکشش شخصیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اردو، فارسی اشعار کے علاوہ سیر و سلوک سے متعلّق ان کی متعدّد تصانیف، تصوّف کے نہایت لطیف اور دقیق مسائل پر خواجہ میر دردؔ کی کامل دست گاہ کا اشاریہ ہیں۔ایک طویل مدّت تک ان کا قیام دہلی کے خواص اور عوام سبھی کے لئے سرچشمۂ فیضان رہا۔بڑے بڑے موسیقار، ادیب، شاعر اور روحانی ترقّیات کے جُویا سبھی نہایت ارادت سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور حسبِ توفیق و استعداد کسبِ فیض کرتے۔اردو شعرا میں دردؔ کا امتیاز یہ ہے کہ ان کا ایک منضبط فکری نظام ہے جو ان کی شاعری اور نثری تحریروں کو ایک وحدت عطا کرتا ہے۔صوفیانہ تجربات کو تخلیقی اظہار کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا اور پھر غزل کی مخصوص روایت اور رسومات کا پاس و لحاظ رکھنا دردؔ کا اہم کارنامہ ہے۔'' (خواجہ میر دردؔ، ص.۱۲۵)

دردؔ کے کلام کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آجائے گی کہ ان کہ شاعری میں کوئی بھی بات اخلاق کے معیار کے منافی نظر نہیں آتی اور نہ ہی کوئی چیز خلافِ تہذیب نظر آتی ہے۔ دردؔ کی محبت کا معیار بہت اونچا اور پاکیزہ ہے۔ ہم اگر صوفیانہ کلام اور صوفی شعرا کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ جن شعرا نے اللہ کی محبت کو اپنے دل میں بسایا تھا۔ ان کے اشعار میں بھی ایک درد، اثر، پاکیزگی اور بلندی پائی جاتی ہے۔ یہی بات ہمیں دردؔ کے یہاں نظر آتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کی بڑی عزّت کرتے ہیں اور اس سے مخاطب ہونے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اسی لئے ان کے کلام میں بے باکی اور شوخی دکھائی نہیں دیتی:

مزاج نازک دل سے اگر مکدّر رہو   یہ آئینہ ہم ابھی پاش پاش کرتے ہیں
نزع میں تو ہوں ولے تیرا گلہ کرتا نہیں   جی میں ہے وہی وفا، پر جی وفا کرتا نہیں
نہ ملیں گے اگر کہے گا تو   تیری خاطر ہمیں مقدّم ہے

دردؔ کے نزدیک پروانے کی شمع سے محبت مثالی محبت ہے۔ وہ شمع سے محبت کرتا ہے اس لئے اس سے دور نہیں جاتا اور آخر کار اس پر جان نثار کر دیتا ہے۔ دردؔ کے نزدیک اصل محبت کا مفہوم یہی ہے اور کمالِ محبت کی یہی دلیل ہے:

ایک ہی جست میں لی منزلِ مقصود اُس نے
راہ رَو رشک کی جا ہے سفرِ پروانہ
شمع کے صدقے تو ہوتے ابھی دیکھا تھا اُسے
پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثرِ پروانہ

شاعر کا خیال یہ ہے کہ پروانہ کے اس سفر پر رشک آتا ہے کہ اس نے شمع کی لَو پر ایک جست لگائی اور اپنے آپ کو فنا کر دیا۔ ایسی محبت پر کون نہ قربان ہو جائے۔ لوگوں نے پروانے کو شمع پر قربان ہوتے ہوئے تو دیکھا تھا مگر اس کے بعد اس کی خاک کا نشان تک نہ ملا۔ یعنی پروانے نے کس طرح اپنے وجود کو فنا کر دیا اور آناً فاناً خود کو شمع پر قربان کر دیا۔

محبت میں انسان کی کیا حالت ہوتی ہے اس کا اندازہ اگر لگانا ہو تو دردؔ کا یہ شعر دیکھیں جس میں دردؔ نے محبت کی بنیادی شرط کی تشریح کی ہے اور درد کی تصویر کشی دردؔ نے کس انداز سے کی ہے۔ اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کبھی ہنسنا، کبھو رونا، کبھی حیران ہو رہنا
محبت کیا بھلے چنگے کو دیوانہ بناتی ہے

میر دردؔ کے یہاں ہمیں زبان و بیان کی چاشنی بھرپور ملتی ہے اور الفاظ کے انتخاب میں وہ نہایت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ ان کے یہاں ندرتِ بیان اور جدّتِ طبع کی دل کشی ملتی ہے۔ وہ عام سی بات کو اس طرح ادا کر دیتے ہیں کہ بے اختیار قاری کی زبان سے داد و تحسین کے کلمات نکل جاتے ہیں۔ مثلاً دردؔ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں کہ اگر چہ ہم سیاہ کار و گناہ گار ہیں مگر پھر بھی ہمارا درجہ اتنا بلند ہے کہ فرشتوں کو بھی ہماری بزرگی اور ہماری منزلت پر رشک ہوتا ہے:

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

زاہد اپنی عبادت اور زہد وتقویٰ پر مغرور ہوتا ہے اور وہ اپنے سے بہتر اور خدا رسیدہ کسی اور انسان کو تصوّر نہیں کرتا ہے۔ دردؔ ان زاہدوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ انسان کے گناہ کو حقیر خیال مت کرو۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام جنّت میں شجرِ ممنوعہ (گندم) کے پاس نہ جاتے تو انہیں دنیا میں نہ بھیجا جاتا اور اگر وہ دنیا میں نہ آتے تو انسانوں کا سلسلہ جاری نہ ہوتا اور نہ تمہیں عبادت کا موقع نصیب ہوتا۔ گویا تمہاری عبادت حضرت آدم علیہ السلام کے لغزشِ مستانہ کی احسان مند ہے۔ کتنا گہرا فلسفہ دردؔ نے پیش کیا ہے۔ دیکھیں اس فلسفے کو دردؔ نے کتنی سادگی سے اپنے ایک شعر میں پرو دیا ہے۔

مت عبادت پہ پھولیو زاہد
سب طفیلِ گناہِ آدم ہے

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۵﴾ دردؔ کا زیادہ تر کلام کس شکل میں ہے؟
﴿۶﴾ تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا، اس مصرع کو مکمّل کیجیے!
﴿۷﴾ 'تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو' یہاں 'تر دامنی' سے کیا مراد ہے؟

04.05 خواجہ میر دردؔ کی پہلی غزل

﴿ا﴾

﴿۱﴾ ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

﴿۲﴾ قاصد ! نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

﴿۳﴾ غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

﴿۴﴾ اطفائے رازِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

﴿۵﴾ مستِ شرابِ عشق وہ بے خود ہے جس کو حشر
اے دردؔ ! چاہے لائے بخود پھر نہ لا سکے

04.06 خواجہ میر درؔد کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ غزل کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پوری غزل تصوّف کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے کیوں کہ درؔد کی شاعری میں تصوّف کے عناصر بھرپور انداز میں ملتے ہیں۔ چنانچہ یہ غزل بھی تصوّف و معرفت اور عشقِ حقیقی کی پوری تصویر پیش کرتی ہے۔ یہ غزل درؔد کی بہت معروف و مقبول غزل ہے۔ اس غزل میں درؔد نے ایک ایسا فلسفہ پیش کیا ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم میں بھی موجود ہے۔ درؔد نے اللہ کی شان اور بندے کی بزرگی کا بیان اس غزل میں کیا ہے اور اپنے جذبات و احساسات کو بخوبی اس غزل میں سمو دیا ہے۔ وہ خدا سے بھی مخاطب ہیں اور کہتے ہیں کہ تیری وسعت تک پہنچنا نہ آسمان کے بس میں ہے اور نہ زمین کے پاس اتنی استعداد ہے کہ تجھے اپنے اندر سمو سکے۔ یہ تو انسان کی بزرگی اور وسعتِ قلبی ہے کہ اس نے تجھے اپنے اندر بسایا ہے اور تیری عظمت کو تسلیم کیا ہے۔

غزل کی تشریح:۔

شعر اوّل: درؔد کہتے ہیں کہ زمین و آسمان کے پاس اتنی استعداد ہی کہاں ہے کہ وہ تیری وسعت کو پا سکیں۔ یہ صلاحیت تو انسان کے پاس ہے کہ جس نے تجھے (خدا کو) پہچانا۔ تیری عظمت کو تسلیم کیا اور تجھے اپنے اندر جذب کر لیا۔ اس لئے درؔد کہتے ہیں کہ میرا ہی دل ہے کہ جہاں تو سما سکے۔ یہ حضرتِ انسان کی شرف و بزرگی کی ایک علامت ہے۔

دوسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ اے قاصد! اب تو ہمارے کام نہیں آ سکتا۔ اس لئے تو میرے پاس سے چلا جا۔ یہاں تیرا کوئی کام نہیں ہے۔ کیوں کہ میں ایسی جگہ سے پیام منگوانا چاہتا ہوں جہاں تک تیری رسائی ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لئے تو اپنی راہ اختیار کر! وہاں صرف میرا دل ہی ہے جو قاصد بن کر جا سکتا ہے اور اس کا پیام لا سکتا ہے۔

تیسرا شعر: اس شعر میں شاعر انسان کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ اے انسان تو اپنے دل سے خدا کی یاد ہرگز ہرگز نہ جانے دے اور ہر وقت اس کی یاد میں مصروف رہ اور اس کی یاد میں اگر تو خود کو بھول سکے تو بھلا دے۔

چوتھا شعر: عام قاعدہ یہ ہے کہ جب آگ لگتی ہے تو پانی سے اُسے بجھایا جاتا ہے لیکن اس شعر میں اس فلسفے کو بیان کیا گیا ہے کہ عشق کے راز کی آگ جب شعلہ زن ہوتی ہے تو اس آگ کو آنسوؤں سے نہیں بجھایا جا سکتا۔ یہ آگ اندرونی اور دلی جذبات و احساسات اور عشقِ حقیقی کی آگ ہے۔ یہ اس وقت تک نہیں بجھے گی جب تک حقیقی محبوب (خدا) تک رسائی نہ ہو جائے اور جب اس تک رسائی ہو جائے گی تو یہ آگ خود بخود بجھ جائے گی۔

پانچواں شعر: شاعر کہتا ہے کہ عشق کی شراب پی کر شرابی اس قدر مبہوت اور بے خود ہو جاتا ہے کہ وہ حشر کے میدان میں پہنچنے تک اسی شراب کے نشے میں رہتا ہے اور خود کو بھول کر صرف ایک ہی چیز اس کے حافظے میں محفوظ رہتی ہے اور وہ ہے عشقِ حقیقی کا منبع۔ یعنی وہ جس ذاتِ واحد سے عشق کرتا ہے اس کے سامنے صرف اسی کی تصویر حشر برپا ہونے تک قائم رہتی ہے اور اگر حشر کے میدان میں اس عشق کے متوالے کو بیدار کیا جائے تو بھی وہ بیدار نہیں ہو سکتا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۸﴾ اس غزل کے پہلے شعر میں شاعر نے کون سا فلسفہ پیش کیا ہے؟

﴿۹﴾ 'اطفائے رازِ عشق' سے کیا مراد ہے؟

﴿۱۰﴾ تیسرے شعر میں کس قاصد کی خصوصیت بیان کی گئی ہے؟

04.07 خواجہ میر دردؔ کی دوسری غزل

﴿۲﴾

﴿۱﴾ تہمتِ چند اپنے ذمّے دھر چلے
جس لئے ہم آئے تھے ، سو کر چلے

﴿۲﴾ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ؟
ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے

﴿۳﴾ شمع کی مانند ہم اِس بزم میں
چشمِ تر آئے تھے ، دامن تر چلے

﴿۴﴾ ساقیا ! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

﴿۵﴾ دردؔ ! کچھ معلوم ہے ؟ یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے ، کیدھر چلے

04.08 خواجہ میر دردؔ کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ اس غزل میں شاعر نے زندگی کا فلسفہ اور اس کا مقصد پیش کیا ہے۔ انسان اس دنیا میں ایک معیّن وقت کے لئے آتا ہے اور مختلف طرح کے کام کر کے چلا جاتا ہے یعنی وہ فوت ہو جاتا ہے اور اپنے ساتھ گناہوں کا بوجھ لے جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس پر تہمت لگاتے ہیں اور کچھ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ انسان اس دنیا میں ایک پروانے کی طرح اُمّید لے کر آتا ہے اور اس کے دل میں اُمّیدوں کے چراغ جلتے رہتے ہیں مگر جب جاتا ہے تو اس کی پلکیں بھیگی ہوتی ہیں۔ وہ دنیا سے جدا ہونے کے غم میں آہ وزاری کرتا ہوا دارِ بقا کی طرف کوچ کر جاتا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی لوگ آتے ہیں ان میں سے کسی کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کس لئے آئے تھے اور کس طرف گئے ہیں؟ زندگی کا یہی فلسفہ اس غزل میں پیش کیا گیا ہے۔

غزل کی تشریح:۔

شعر اوّل: شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا میں ہم جس لئے آئے تھے وہ کر چکے اور اپنے ذمّے تہمت کا داغ لے کر جا رہے ہیں یعنی اب ہم اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں لیکن بڑے افسوس کے ساتھ جا رہے ہیں کہ کاش تھوڑی عمر اور مل جاتی تو اچّھے کام کر لیتے مگر ایسا ممکن نہیں۔ اس لئے مرنے والا دنیا سے رخصت ہوتے وقت اسی افسوس کے ساتھ رخصت ہو رہا ہے۔

دوسرا شعر: اس شعر میں زندگی کو طوفان سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح کی بلا خیزی، اُتار، چڑھاؤ، مصائب، دکھ اور آفتیں برداشت کی ہیں، ایسا لگتا ہے کہ یہ زندگی نہیں بلکہ مصیبتوں کا طوفان ہے اور اس طوفان سے ہم اس قدر نبرد آزما ہوتے رہے کہ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم زندہ ہی نہیں ہیں بلکہ مر چکے ہیں۔ یعنی ہم نے زندگی میں اتنی مصیبتیں برداشت کی ہیں کہ اس زندگی میں ہمیں موت نظر آنے لگی ہے۔ صنعتِ تشبیہ کی خوب صورت مثال اس شعر میں پیش کی گئی ہے۔

تیسرا شعر: انسان کے بارے میں شاعر کا تصوّر ہے کہ انسان اس دنیا میں شمع کی طرح صاف، روشن اور اُمید کا سہارا لے کر آتا ہے لیکن جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو گناہوں کی آلودگی اُس کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ یہاں چشمِ تر سے مراد پاک صاف اور دامن تر سے مراد گناہوں کا بوجھ ہے۔ اس شعر میں شاعر نے اس زندگی کی سچّائی بیان کی ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

چوتھا شعر: دردؔ کا یہ کہنا ہے کہ اے ساقی! اب تم صرف ساغر پیش کرتے رہو اور میں شراب سے مستی حاصل کرتا رہوں۔ کیوں کہ اب ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میرے چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے اور میری زندگی کے صرف چند ایّام ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس قلیل مدّت میں شراب کا سہارا لوں اور زندگی کے آخری لمحوں کو خوشی و مسرّت سے گزاردوں۔ شراب کے نشے میں مجھے وہ خوشی حاصل ہوگی کہ میں پوری دنیا کو بھول جاؤں گا۔

پانچواں شعر: دردؔ کہتے ہیں کہ اے دردؔ! کیا تمہیں اس بات کی کچھ خبر ہے کہ اس دنیا میں جتنے لوگ آتے ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور پھر زندگی گزار کر کہاں چلے جاتے ہیں؟ دردؔ نے سوالیہ انداز میں شعر لکھ کر شعری حسن میں اضافہ کیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۱﴾ اس غزل کے پہلے مصرعے میں ''تہمتِ چند'' سے کیا مراد ہے؟

﴿۱۲﴾ 'زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے۔' اس مصرعے میں کون سی صنعت استعمال کی گئی ہے؟

﴿۱۳﴾ آخری شعر میں زندگی کا کون سا معمہ پیش کیا گیا ہے؟

04.09 خلاصہ

خواجہ میر دردؔ دہلی میں ۱۷۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ تھا جو اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور صوفی تھے۔ دردؔ نے بنیادی تعلیم اور تصوّف کا درس اپنے والد سے ہی حاصل کی اور شاعری کی جانب راغب ہو گئے۔ چوں کہ ان کے خانوادے میں تصوّف و معرفت کی روایت پہلے سے چلی آ رہی تھی چنانچہ دردؔ بھی اپنے کو معرفت کی وادی میں داخل ہونے سے نہ روک سکے اور شاعری میں تصوّف کے اسرار و رموز، علمِ معرفت کا بیان اور عارف کی حقیقت کا اظہار کرنے لگے۔ دردؔ کو عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا۔ موسیقی

میں بھی مہارت رکھتے تھے۔انہوں نے فارسی میں مختلف کتابیں لکھیں۔انہوں نے اپنے دَور کے دومشہور بزرگ استاد مفتی دولت اور سراج الدّین خاں آرزؔو سے فارسی پڑھی۔دردؔ ایک خوددار اور خداترس انسان تھے۔بڑے بڑے شاہانِ وقت سے بھی مرعوب نہیں ہوئے۔ان کے دل میں خوفِ خدا،مذہب کی پابندی،بے نیازی،استغنا،ہمدردی اور رحم دلی کا جذبہ موجود تھا۔دردؔ کے تذکرہ نگاروں میں ایسا کوئی تذکرہ نگار نہیں گزرا جس نے دردؔ کی خوبیاں اوران کے اوصاف بیان نہ کیے ہوں۔کسی تذکرہ نگار نے دردؔ کی خامیاں نہیں بیان کیں۔میرتقی میرؔ نے اپنے تذکرے ’نکات الشعراٗ‘ میں دردؔ کو بزرگ اور بزرگ کا بیٹا قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ درویشی میں دردؔ کو بڑا مرتبہ حاصل ہے اور انہوں نے دنیاوی عزّت کی خواہش کو دل سے نکال دیا تھا۔دردؔ نے ابتدا ہی میں سپاہی کا پیشہ اختیار کیا مگر مزاج کے خلاف ہونے کے باعث اس پیشے سے جلد ہی الگ ہوگئے۔دردؔ کا تعلّق سلسلۂ نقشبندیہ سے تھا۔انہوں نے ایک کتاب ’’نالۂ دردؔ‘‘ لکھی۔جس میں انہوں نے موسیقی میں اپنی دل چسپی کو جائز اس لئے قرار دیا کہ اس میں انہیں سکون ملتا تھا۔ان کے یہاں ہر ماہ سماع کی محفل منعقد ہوا کرتی تھیں۔ان کی شاعری ان کی ذات سے عبارت ہے۔وہ ایک درویش صفت اور صوفی شاعر تھے۔چنانچہ ان کی پوری شاعری اسی کی عکّاسی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ان کی شاعری میں قرآن کا فلسفہ،اخلاقیات،انسانی زندگی کی حقیقت،موت کی تلخ سچائی،عبرت انگیز نصائح،خوفِ خدا اور عشقِ حقیقی کے منازل کی پوری تصویر دکھائی دیتی ہے۔وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر انسان کا مرجع صرف خدا کی ذات ہے اور ہر شے میں اسی کا ظہور ہے۔

دردؔ کی شاعری میں سادگی،سلاست،روانی،موسیقیت،اور دیگر شعری خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ان کے اشعار میں دنیاداری میں دل چسپی رکھنے والے انسانوں کے لئے عبرت پوشیدہ ہے۔وہ عشقِ حقیقی کی بات کرتے ہیں اور عشقِ حقیقی کی بات کرنے والا صرف خدا کی ذات کی طرف لَو لگانے کی تلقین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دنیا میں اگر کسی ذات سے دل لگانا ہے تو خدا کی ذات سے دل لگاؤ کیوں کہ اس سے دل لگانے میں کوئی رسوائی نہیں ہوگی۔وہ کہتے ہیں کہ دنیا کی ہر شے میں خدا کی ذات موجود ہے۔جب ہر شے میں خدا موجود ہے تو کیوں نہ اس سے محبت کی جائے۔اور اسی کی یاد میں اپنی زندگی گزار دی جائے۔دردؔ کی شاعری میں احساسات وجذبات کی بلندی،خیالات کی رفعت اور تصوّف ومعرفت کے فلسفیانہ مسائل ملتے ہیں۔وہ اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں اور اردو شاعری میں ان کا ایک اہم مقام ہے۔

04.10 فرہنگ

ارض وسما	: گناہ گاری	سماع	: قوالی سننا،رقص وسرود
استعداد	: عشق کے راز کی آگ بجھانا	شانِ کبریائی	: صلاحیت،لیاقت،قابلیت
اطفائے رازِعشق	: خود سے بے خبر،ازخودرفتہ،،مدہوش،سرشار	شعلہ زن	: آگ کا شعلہ نکلنا،شعلہ مارنے والا
انحراف	: منہ پھیرنا،دور رہنا،الگ رہنا،پھر جانا، انکار،نافرمانی	صنعتِ تشبیہ	: علمِ بیان کی ایک قسم،جس سے کسی چیز کو تشبیہ دی جائے
بےخود	: پڑا ہوا،زمین پر قائم	طلسم	: جادو کا تماشہ
تردامنی	: تعریف کے کلمات،مدح سرائی	علومِ رسمیہ	: وہ علوم جو زمانۂ قدیم سے چلے آتے ہوں اور رائج ہوں
تصنّع	: شوقین،چاہنے والا		

تصوّف	: علمِ معرفت، دل کوخدا کی یاد میں ہر وقت مصروف رکھنا	عوامل	: عامل کی جمع، عمل کرنے ولا، اثرات
		فتادہ	: زمین وآسمان
توکّل	: خدا پر بھروسہ کرنا	مبہوت	: حیران، ہکّابکّا
جست	: پہلا، سابقہ، قدیم	مرعوب	: کسی سے ڈر جانا، رعب میں آیا ہوا
چنگ	: ستار کی قسم کا ایک باجا	معمّہ	: پوشیدہ، مبہم، پہیلی، پیچیدہ بات
دادوتحسین	: چھلانگ، پھاند، قلانچ، چوکڑی	مقدم	: گدلا، میلا، ناراض، غمگین
دل دادہ	: ایک قسم کی سارنگی	مکدر	: بناوٹ، دکھاوا
رباب	: ستار کی قسم کا ایک باجا	نالۂ عندلیب	: بلبل کی فریاد
سرود	: نغمہ، راگ، ایک قسم کا باجا	نشیب وفراز	: اتار چڑھاؤ، اونچ نیچ

04.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : خواجہ میر دردؔ کی صوفیانہ شاعری کو مثالوں سے واضح کیجیے؟

سوال نمبر۲ : خواجہ میر دردؔ کی موسیقی میں دل چسپی کے اسباب بیان کیجیے؟

سوال نمبر۳ : خواجہ میر دردؔ کی تعلیم اور ملازمت کے متعلق اظہارِ خیال کیجیے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : خواجہ میر دردؔ کی حیات پر روشنی ڈالیے؟

سوال نمبر۲ : خواجہ میر دردؔ کی شاعرانہ خصوصیات مع مثال پیش کیجیے؟

سوال نمبر۳ : خواجہ میر دردؔ کی شاعری میں تصوّف کے عناصر کے اسباب بیان کیجیے؟

سوال نمبر۴ : خواجہ میر دردؔ کے اہم کارناموں اور ان کے خانوادے کا ذکر تفصیل سے کیجیے؟

04.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ از سیّد احتشام حسین

۲۔ تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی

۳۔ خواجہ میر دردؔ از ظہیر صدّیقی

۴۔ خواجہ میر دردؔ از قاضی جمال حسین

04.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ خواجہ محمد ناصر

﴿۲﴾ مفتی دولت

﴿۳﴾ نقشبندیہ سلسلے سے

﴿۴﴾ میر تقی میر کی

﴿۵﴾ غزل کی شکل میں

﴿۶﴾ جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا

﴿۷﴾ گناہ گاری، سیاہ کاری

﴿۸﴾ اللہ نے اپنی امانتیں زمین و آسمان کو پیش کیں مگر وہ متحمل نہ ہوسکے اور انسان نے اسے قبول کرلیا۔

﴿۹﴾ عشق کے راز کی آگ بجھانا

﴿۱۰﴾ جو عشقِ حقیقی رکھنے والوں کا قاصد ہوتا ہے۔

﴿۱۱﴾ تہمتِ چند سے مراد گناہوں کا بوجھ ہے۔

﴿۱۲﴾ صنعتِ تشبیہ

﴿۱۳﴾ اس میں انسان کی لاعلمی دکھائی گئی ہے کہ اسے یہ نہیں معلوم کہ وہ دنیا میں کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔

اکائی 05 : میرؔ تقی میرؔ

ساخت

05.01 : اغراض ومقاصد
05.02 : تمہید
05.03 : میرؔ تقی میرؔ کے حالاتِ زندگی
05.04 : میرؔ تقی میرؔ کی شاعرانہ خصوصیات
05.05 : میرؔ تقی میرؔ کی پہلی غزل
05.06 : میرؔ تقی میرؔ کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
05.07 : میرؔ تقی میرؔ کی دوسری غزل
05.08 : میرؔ تقی میرؔ کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
05.09 : خلاصہ
05.10 : فرہنگ
05.11 : نمونہ امتحانی سوالات
05.12 : حوالہ جاتی کتب
05.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

05.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے سے آپ میرؔ تقی میرؔ کی حیات اور ان کی شاعری کے متعلّق پوری تفصیلات جانیں گے۔ان کی شاعری کی وجوہات اور زندگی کی کشمکش کو بھی آپ بخوبی محسوس کریں گے۔ساتھ ہی میرؔ کی شاعرانہ عظمت کی پوری تصویر بھی آپ کے سامنے آئے گی۔اس روشنی میں آپ محسوس کر سکیں گے کہ میرؔ تقی میرؔ کو خدائے سخن اور اردو کا سب سے بڑا شاعر کیوں تسلیم کیا گیا ہے۔اس اکائی میں آپ ان کی شاعری کی وہ تمام جہتیں دیکھیں گے جن کے باعث میرؔ کو انفرادیت اور شہرت حاصل ہوئی۔اس میں میرؔ کی دو غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں اور ان غزلوں کی سیاق وسباق کے ساتھ تشریح بھی پیش کی گئی ہے تا کہ آپ میرؔ کی شاعری کے اوصاف کو بخوبی سمجھ سکیں۔

05.02 تمہید

ہرزبان کی شاعری میں بڑی بڑی ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔شاعری کے ذریعے سماج اور معاشرے میں بہت سی تبدیلیاں لائی گئی ہیں۔ ادب سماج اورزندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔اس لئے ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تاکہ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھا جاسکے۔اردوشاعری میں بہت سے شعراو اُدبانے اردوزبان وادب کے ستونوں کو مضبوط کرنے میں نہایت اہم رول ادا کیے ہیں۔ان میں نثر ونظم دونوں شامل ہیں۔خصوصاً شاعری کے حوالے سے بات کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ شاعری میں زوداثر عناصر ہوتے ہیں جن کا سیدھا اور بہت جلد اثر قاری پر پڑتا ہے اور وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اردوشاعری میں بھی بہت سے شعرا کی خدمات کا ذِکر آتا ہے۔جن میں وؔلی دکنی،قلی قطب شاہ، دردؔ،میرؔ،فاؔنی،حسرتؔ اور غالبؔ واقباؔل کے نام نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ہم یہاں ان ہی شعرامیں سے ایک عظیم شاعر میر تقی میرؔ کی شاعری اوران کی زندگی کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔آیئے !دیکھیں کہ میرؔ کی شاعری اورزندگی کی کیا خصوصیات رہی ہیں جن کی وجہ سے میرؔ کواردو کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا گیا ہے۔

05.03 میر تقی میرؔ کے حالاتِ زندگی

میرؔ کا نام،محمد تقی اور تخلّص میرؔ تھا۔وہ آگرہ میں ۱۷۲۳ء میں پیدا ہوئے۔میرؔ کے دادا فوج میں ملازم تھے۔ان کے والد محمد علی ایک صوفی بزرگ تھے۔میرؔ بچپن سے صوفیوں اور عالموں کی صحبت میں اُٹھتے اور بیٹھتے تھے۔ان کی باتیں سنتے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ابھی میرؔ صرف دس سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔میرؔ نے اپنی کتاب ’’تذکرۂ میر‘‘ فارسی زبان میں لکھی۔جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔اس کتاب میں انہوں نے اپنے والد کے اوصاف کے متعلّق تفصیل سے لکھا ہے۔والد کے انتقال کے بعد انہوں نے سوتیلے بھائیوں کے رویّے سے پریشان ہوکر وطن اکبرآباد(آگرہ) چھوڑ دیا۔میرؔ ۱۷سال کی عمر میں دلّی چلے آئے۔دلّی میں میرؔ نے سراج الدّین علی خاں آرزؔو کی نگرانی میں پرورش پائی جو میرؔ کے رشتہ دار تھے۔میرؔ نے ریختہ گوئی کا آغاز آرزؔو کے کہنے پر ہی کیا۔میر تقی میرؔ کی زندگی کا زیادہ تر وقت دلّی میں ہی گزرا۔دلّی میں انہیں مختلف اُمرا اور رؤسا کی سرپرستی حاصل رہی۔دلّی کی تباہی کی وجہ سے میرؔ دلّی سے باہر نکل گئے اور اکبرآباد(آگرہ) ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔اس وقت میرؔ کو کافی شہرت حاصل ہوچکی تھی۔لکھنؤ میں آصف الدّولہ نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کے لئے تین سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرّر کیا لیکن نواب کے ساتھ ان کا نباہ نہ ہوسکا اور لکھنؤ میں ہی ان کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا۔

میرؔ کی زندگی میں والد کے انتقال کے بعد ہی پریشانیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو وہ بے سہارا ہوگئے۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔انہوں نے خود اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ وہ لوگ جو محمد تقی کے پیروں کی دھول کو سرمے کی طرح آنکھوں سے لگاتے تھے۔وہ ان کے سائے سے بھاگنے لگے۔میرؔ کا ہی یہ شعر ان کی ترجمانی کرتا ہے۔

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں

یا میرؔ کا یہ شعر جس میں انہوں نے اس دَور کی منظر کشی کی ہے

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھو سرو و گل کے سائے تھے

میرؔ کی ساری زندگی حسرتوں کی طویل داستان ہے۔ان حسرتوں سے خود میرؔ کو تکلیفوں کے سوا کچھ نہ ملا لیکن ان تکالیف کی وجہ سے میرؔ کی اردو شاعری کا ایسا انمول خزانہ ہاتھ آیا جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔میرؔ اپنی شاعری اور تصانیف کی وجہ سے پوری دنیائے شاعری میں مقبول رہے۔میر تقی میرؔ نے جب لکھنؤ کے سفر کا عہد کیا تو ان کے ساتھ کیا کیا مسائل پیش آئے،ان تمام کا ذِکر اپنی تصنیف میں کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن بے سامانی سے مجبور تھا۔میری عزّت و آبرو کی حفاظت کے خیال سے نواب وزیر الملک آصف الدّ ولہ بہادر آصف الملک نے چاہا کہ میرؔ میرے پاس آ جائے تو اچّھا ہو۔چنانچہ میری طلبی کے لئے نواب سالار جنگ پسر اسحاق موتمن الدّ ولہ جو وزیرِ اعظم کے خالو ہوتے تھے۔ان قدیم تعلّقات کی وجہ سے جو میرے خالو سے تھے کہا کہ اگر نواب صاحب از راہِ عنایت کچھ فرمائیں تو البتّہ میرؔ صاحب یہاں تک آ سکتے ہیں۔نواب صاحب نے حکم دیا اورانہوں نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے خط لکھا کہ نوابِ والا جناب آپ کو یاد کرتے ہیں۔جس طرح ہو سکے یہاں آ جائیے۔میں پہلے سے ہی دل برداشتہ بیٹھا تھا۔خط کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا۔چوں کہ خدا کی یہی مرضی تھی۔میں بے یارو مددگار بغیر قافلہ اور رہبر کے فرخ آباد کے رستے سے گزرا،وہاں کے رئیس مظفّر جنگ تھے۔انہوں نے ہر چند چاہا کہ کچھ روز وہاں ٹھہر جاؤں مگر میرے دل نے قبول نہیں کیا۔دو ایک روز بعد روانہ ہو کر منزلِ مقصود تک پہنچ گیا۔''

(بحوالہ تاریخ اردو ادب۔رام بابو سکسینہ:ص.۹۸)

میرؔ صاحب نے لکھنؤ میں زندگی آرام سے گزاری جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔نواب آصف الدّ ولہ جب شکار کے لئے بہرائچ گئے تو میرؔ صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔اس کی یادگار میں میرؔ نے ''شکارنامہ'' موزوں کیا۔دوسری دفعہ نواب آصف الدّ ولہ جب کوہِ شمال کے دامن تک گئے۔میرؔ نے دوسرا ''شکارنامہ'' تیار کیا اور اسے ان کے حضور پیش کیا۔اس شکارنامے کی دو غزلوں کی نواب آصف الدّ ولہ نے بطورِ خود تضمین کی۔

میر تقی میرؔ اس دَور کے متعلّق اور اپنی طبیعت کی بابت پوری صداقت سے تحریر فرماتے ہیں:

''اس زمانے میں میرا مزاج ناساز رہتا ہے۔یاروں کی ملاقات ترک کر دی ہے۔بڑھاپا آ پہنچا ہے۔اور عمرِ عزیز ساٹھ سال کی ہو گئی ہے۔اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں۔کچھ دنوں آنکھ کے درد کی تکلیف اُٹھائی۔ضعفِ بصری کی وجہ سے عینک لگائی۔دانتوں کے درد کا کیا ذِکر کروں۔آخر دل کڑا کر کے ایک ایک کو جڑ سے اُکھڑوا دیا۔غرض کہ ضعف وقویٰ،بے دماغی،ناتوانی،دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ زندہ نہ رہوں گا اور زمانہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا ہے۔بس آرزو اتنی ہے کہ خاتمہ بخیر ہو۔''

(ماخوذ از۔ذکرِ میر،مرتبہ:مولوی عبدالحق بحوالہ تاریخ ادب اردو،رام بابو سکسینہ،ص.۹۸)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات بخوبی معلوم ہوجاتی ہے کہ میرؔ کی زندگی مصائب وآزمائش سے عبارت تھی۔عمر کے آخری دنوں میں ان کی طبیعت خراب رہتی تھی اور آنکھ کی بصارت پر بھی اثر پڑ گیا تھا۔ساتھ ہی ان کے دانتوں میں درد رہنے لگا تھا اور زندگی سے مایوس ہو چلے تھے۔یہ تو حالات تھے جوان کی زندگی میں پیش آئے مگر ان کی پوری زندگی مختلف آزمائشوں اور معاشی مشکلات میں گزری۔کبھی بھی فارغ البالی نصیب نہ ہوئی۔

اگر میرؔ کی طبیعت اور مزاج کے متعلّق بات کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ابتدا ہی سے خوددار واقع ہوئے تھے اور حسّاس طبیعت کے مالک تھے۔وہ بڑے مشائخ اور اُمرا سے بھی ملاقات اور میل جول کو ناپسند کرتے تھے۔وہ ایک آزاد طبیعت کے مالک تھے۔حالاں کہ ان کی زندگی میں افلاس اور تنگ دستی نے بار بار پیچھا کیا لیکن میرؔ کبھی بھی ان سے اس حد تک متاثر نہ ہوئے کہ ان کی اعلیٰ ظرفی پر حرف آسکے۔وہ زود رنج اور تنک مزاج بھی واقع ہوئے تھے جس کی وجہ سے بعض مواقع پر انہیں بہت سے معترضین کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔اپنے ان غموں کی تشریح اس انداز میں کرتے ہیں جن سے وہ نبرد آزما ہوتے رہے:

دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ　　حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میرؔ بے دماغ　　سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ

میر تقی میرؔ کی حیات ابتدا سے انتہا تک عبرت آموز اور تاریخی اعتبار سے حوصلہ خیز ہے۔کیوں کہ جب کم عمری میں سایۂ پدری ان کے سر سے اُٹھ گیا تو ان کے سوتیلے بھائیوں نے انہیں پریشان کرنا شروع کر دیا اور پھر وہ تلاشِ معاش میں شہروں کا چکّر لگاتے رہے اور ان سفروں میں انہیں مختلف قسم کے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔تنگ دستی سے پالا پڑا۔معاصرین کی تنقید کا نشانہ بنے۔اپنوں نے ستایا اور دوسروں نے بھی انہیں تکلیف پہنچائی۔

عشق میں ناکامی ہوئی۔مزاج کی انانیت اور خودداری کی وجہ سے بادشاہانِ وقت کے عتاب کا شکار ہوئے اور اُمرائے وقت سے انہیں خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچ سکا۔لکھنؤ میں عمر کے آخری ایّام میں مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوئے اور آخر وقت تک ان کی خودداری، اعلیٰ ظرفی اور خود اعتمادی باقی رہی۔یہی میرؔ کی ثابت قدمی اور استحکامِ طبعی تھی۔جس کی وجہ سے وہ بڑے بڑوں سے بھی مرعوب نہ ہوئے اور امیرانِ وقت کو بھی خاطر میں نہ لائے۔اگر یہ تمام غم ان کی زندگی کا حصہ نہ ہوتے تو شاید ان کی شاعری میں اتنی دل کشی، معنویت، اثر، دل فریبی اور مقصدیت نہ ہوتی اور نہ ہی ان کے عشق کے درد کا احساس دوسروں کو ہو پاتا۔یہی تمام اسباب تھے جن کی وجہ سے ان کی شاعری میں زندگی کی رمق اور حیاتِ انسانی کی مکمّل تصویر نظر آتی ہے۔اور انہی موضوعات کی خوب صورت منظر کشی، اظہارِ بیان اور عام فہم انداز نے انہیں اردو کا سب سے بڑا شاعر ہونے کا اعزاز عطا کیا۔آج میرؔ کو عظیم ترین شاعر مانا جاتا ہے اور انہیں ''خدائے سخن'' کہا جاتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ میرؔ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
﴿۲﴾ 'تذکرۂ میر' کس زبان میں لکھی گئی؟
﴿۳﴾ میرؔ کا زیادہ تر وقت کہاں گزرا؟
﴿۴﴾ میرؔ کے والد کے انتقال کے بعد انہیں کن لوگوں نے پریشان کیا؟

05.04 میرؔ تقی میرؔ کی شاعرانہ خصوصیات

میرؔ کی زندگی مصیبت اور درد وغم سے عبارت تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں مختلف اُتار چڑھاؤ اور تلخ و شیریں تجربات کیے۔ ان تمام تجربات کا نچوڑ ان کی شاعری میں ہے۔ وہ شاعری میں زندگی کی عکّاسی کے قائل ہیں اور ان کی شاعری اردو ادب کے سرمائے میں ایک روشن باب کا درجہ رکھتی ہے۔ میر تقی میرؔ کو اردو شاعری کی تاریخ میں سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ میرؔ کی شاعری کی اہم خصوصیات یہ شمار کی جاتی ہیں کہ ان کے اشعار سیدھے دل میں اُتر جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ میرؔ کی شاعری آپ بیتی نہیں جگ بیتی ہے۔ ان کی شاعری بول چال کی زبان میں ایسی پُرکشش معلوم ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔ ان کے اشعار سیدھے تیر کی طرح دل میں اُتر جاتے ہیں۔ میرؔ کی زندگی اور شاعری کے متعلّق پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''میرؔ نے اپنی زندگی تکلیف اور بدحالی میں گزاری تھی اس لئے انہیں اُجڑی ہوئی دِلّی کی علامت کہنا غلط نہ ہوگا۔ صوفی منش باپ نے انہیں سکھایا تھا کہ دنیا میں محبت کے علاوہ کچھ نہیں، یہی زندگی ہے اور اس کے لوازم قناعت، بردباری، خودداری اور غم کوشی ہیں۔ یہ باتیں ان کے اندر رچ بس گئی تھیں اور انہی نے ان کی شاعری میں زندگی کی آگ پیدا کر دی تھی۔ جب مصائب نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور بدحالی آخری حد کو چھونے لگی تو میرؔ کی شخصیت میں ایک حیرت انگیز قسم کا بانکپن اور حُسن پیدا ہو گیا۔ انہوں نے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو انسانی توہین سے تعبیر کیا اور خدا سے بھی ناز سے پیش آئے۔ اس ذہن کے ساتھ نگاہِ محبت کا زخم بھی لگا جس نے شاعری کو آتش نوائی میں تبدیل کر دیا اور آپ بیتی بنی نوعِ انساں کے دکھ درد کی ترجمانی کرنے لگی۔''
> (اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ص ۷۰)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرؔ ایک قناعت پسند اور محتمل مزاج شاعر تھے۔ انہوں نے زندگی کی تلخیوں کو جھیلا اور اسی آگ میں جلتے ہوئے اپنی شاعری کو بھی دوآتشہ بنایا۔ انہوں نے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ حالاں کہ تنگ حالی اور غیر آسودگی نے انہیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری آپ بیتی نہیں جگ بیتی بن گئی ہے۔ اگر میر کی آپ بیتی کو جگ بیتی میں بدلتے دیکھنا ہے تو درج ذیل اشعار سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ جنہیں میرؔ نے کافی تجربے کے بعد صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ آپ یہ اشعار دیکھیں گے تو اندازہ ہو جائے گا کہ میرؔ اردو شاعری کے سب سے بڑے شاعر کیوں تسلیم کیے جاتے ہیں۔

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے — پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کر
راہِ دورِ عشق میں روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
ہستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے
قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار — تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہو گیا

میؔر کی سلاست اور سہل پسندی کا ہر شخص قائل ہے۔ کیوں کہ میؔر نے شاعری کو زبان کے لحاظ سے بوجھل نہیں بنایا ہے۔ ان کی سیدھی سادی بول چال کی زبان میں اتنا مزہ اور اتنی مٹھاس اور دلی جذبات کی اتنی نازک مصوّری اور اتنا جوش تخلیقِ شعر کا ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو شعر کی باریکیوں اور شعری حسن سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہو۔ میؔر کی عظمت کا اندازہ ان اشعار سے لگائیں:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے　　میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم　　سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
نہ مِل میؔر اب کے امیروں سے تو　　ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم
ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا　　گئی ہے فکرِ پریشاں کہاں کہاں میری
کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پُر پیچ وتاب　　شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

میؔر نے ایک ایسے وقت میں اپنی تخلیقات پیش کیں جب ان کی زندگی کی ساری خوشیاں، رعنائیاں اور حسین لمحات مکمّل طور مفقود ہو چکے تھے۔ اگر ان کے سامنے امّید کی کوئی کرن دکھائی دیتی تھی تو تھوڑی دیر بعد وہ سراب ثابت ہوتی اور کم وپیش یہی حالت ان کے سامنے باہری دنیا کی تھے جہاں مغلیہ سلطنت رو بہ زوال تھی اور مغلوں کی حیثیت ایک عام آدمی کی سی ہو کرہ گئی تھی۔ ایسے حالات میں میؔر نے شاعری کی۔ ظاہر سی بات ہے کہ شاعر جن حالات سے دوچار ہوتا ہے ان کا عکس اس کے دل پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ چنانچہ میؔر کی شاعری بھی انہی حالات وحادثات کی عکّاسی کرتی ہے جو ان کی زندگی میں پیش آئے اور جن سے ان کا واسطہ رہا۔ کہیں کہیں تو اس وقت کے واقعات کی طرف صاف اشارے بھی ان کی شاعری میں ملتے ہیں مگر زیادہ تر اس ماحول کی عکّاسی کی گئی ہے جو سماجی انحطاط کے نتیجے سے پیدا ہو رہا تھا۔

میؔر کی شاعری کی شہرت ان کی زندگی میں ہی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ میؔر نے اپنی شاعری کی بنیاد زندگی کے حقائق پر رکھی اور ان موضوعات کو اپنے لئے منتخب کیا جن کا براہِ راست تعلّق زندگی سے ہوتا ہے۔ میؔر نے زندگی کے انہی حقائق کو پیش کر کے اپنی شاعری میں مقصدیت کو جگہ دی اور شعر کو ایک نیا مزاج وآہنگ بخشا۔ انسانی جذبات کی جس خوب صورت انداز میں منظر کشی ہمیں میؔر کی شاعری میں ملتی ہے شاید ہی دوسرے شعرا کے یہاں یہ ترجمانی پائی جاتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ جیسا قد آور شاعر بھی میؔر کی عظمت کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکا:

ریختے کے تمہی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میؔر بھی تھا

غالبؔ کے علاوہ ذوقؔ نے بھی میؔر کی شعری خصوصیات اور میؔر کی شاعری کے محاسن کا اعتراف کیا ہے اور اپنے انداز میں بے باکانہ طور پر غزل میں میؔر کی برتری کو تسلیم کیا ہے:

نہ ہوا پر نہ ہوا میؔر کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میؔر نے اپنے دل میں پیدا ہونے والے فطری جذبات واحساسات کو شعری قالب میں ڈھالا جو عوام وخواص سب کی فکری اور حسی بساط ہوتی ہے۔ میؔر کی شاعری میں عبرت آمیز کلمات اور سبق آموز نصائح بھی ملتے ہیں جو زندگی کی حقیقتوں سے بالکل قریب ہوتے ہیں:

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا　　کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت　　اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

میر تقی میرؔ دراصل جذبات کے شاعر ہیں۔کوئی خیال ان کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے تو وہ فوراً اس خیال کو شعر کے قالب میں نہیں ڈھالتے بلکہ یہ خیال ان کے دل و دماغ میں گردش کرتا رہتا ہے۔یہاں تک کہ وہ جذبہ اور خیال جب احساس کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو وہی ان کی تاثیر سے لبریز شعر کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔مثلاً موت کا فلسفہ جسے بہت سے شعرا نے مختلف انداز سے پیش کیا ہے لیکن جب میرؔ موت کی حقیقت پیش کرنا چاہتے ہیں تو وہ کہتے ہیں:

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دَم لے کر

یا میرؔ کا یہ شعر جس میں انہوں نے اپنی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا اظہار کیا ہے:

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

پروفیسر نورالحسن نقوی نے میرؔ کی شاعری کو عام فہم انداز میں بات کہنے یا گفتگو کرنے سے تشبیہ دی ہے۔بول چال کی زبان میں جو شاعری کی جاتی ہے وہی تا دیر اثر قائم رکھتی ہے اور یہ کلّیہ بڑے بڑے ناقدین کا ہے۔

''میرؔ شعر نہیں کہتے، باتیں کرتے ہیں۔وہ باتیں جو سننے والے کو ایسی لگیں جیسے پہلے سے اس کے دل میں موجود تھیں۔انداز ایسا جیسے بے تکلّف دوست اپنے دوست سے راز و نیاز میں محو ہو۔لہجہ سرگوشی کا، زبان عام بول چال کی۔'' (اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ص۔۳۰)

اس نکتہ کو مختلف ناقدین نے مختلف انداز سے پیش کیا ہے اور میرؔ کی عظمت کے متعلق ان کی شاعری کے اوصاف گنوائے ہیں۔رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''میرؔ صاحب غزل گوئی میں مسلم الثّبوت استاد مانے گئے ہیں۔ان کے اشعار صاف سادہ، فصیح اور تیر ونشتر کا کام دینے والے درد واثر سے مملو ہیں۔ان میں دل کشی اور زور کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔اظہارِ جذبات، چستیِ بندش اور ترنّم میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ان کے اکثر اشعار میں وہ ایک خاص کیفیت ہے جو سحر یا طلسم سے تعبیر کی جاسکتی ہے اور جو تمام زبانوں کی حقیقی اور سچّی شاعری کا طرّہ امتیاز ہے۔زبان، صاف وشستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ اور دل آویز کہ جیسے بات کرتے ہیں۔وہ اردو کے شیخ سعدیؔ ہیں۔ان کا کلام اکسیرِ شاعری ہے۔علی الخصوص چھوٹی بحروں کے تو وہ بادشاہ ہیں اور ہمارے نزدیک تو بڑی بحروں میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ان کے کلام میں جو حزن وملال اور حسرت و مایوسی سے مملو ہے وہی ان کی شاعری کی جان ہے۔یہی نا اُمیدی اور یاس ان کی غزلوں کو زوردار اور موثّر بناتی ہے۔'' (تاریخ اردو ادب۔ص۔۱۰۷)

میرؔ کی شاعری عام بول چال کی زبان میں ضرور ہے مگر اس میں ایسا درد اور کرب پوشیدہ ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ میرؔ کی زندگی ناکامیوں اور نامرادیوں سے عبارت ہے اور یہی ناکامی اور حرماں نصیبی ان کی شاعری میں پیوست ہو کر غمِ زمانہ بن جاتی ہے اور جب ان کی شاعری غمِ زمانہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے تو ہمارے ضمیر کی آواز محسوس ہوتی ہے۔ چوں کہ میرؔ بچپن سے ہی بے یار و مددگار اور بے سہارا ہو گئے تھے۔ ایسا شخص جب بھی محبت کرتا ہے تو اس کی محبت کی انتہا نہیں ہوتی۔ اس انسان کی محبت کی ابتدا، انتہا کے نقطے سے شروع ہوتی ہے اور اسی لئے اکثر ناکام ہوتی ہے۔ میرؔ کی عشقیہ شاعری میں اس ناکامی و محرومی کا احساس موجود ہے لیکن جب اس پر تاریخی ماحول کی چھاپ پڑتی ہے تو اس سے زندگی کے عناصر چمک اُٹھتے ہیں۔ میرؔ جب اپنی خوں فشانی سے دامن پر گل کاریاں کرتے ہیں تو ان کا آرٹ بلند ترین مقام پر پہنچ جاتا ہے اور کائنات خود اس سے سرگوشیاں کرنے لگتی ہے۔

میرؔ کی شاعری دردانگیز ضرور ہے لیکن زہرناک اور مردم بے زار نہیں ہے۔ ان کو انسان کی عظمت پر پورا بھروسہ ہے اور وہ اسے آسان چیز تصوّر نہیں کرتے۔ یہ عرفان و ادراک انہیں تصوّف کے مختلف امّید افزا پہلوؤں سے حاصل ہوا ہے۔ میرؔ ناکام ہوتے ہیں لیکن ہمّت نہیں ہارتے اور یہی ان کی بزرگی ہے۔ ان کے یہاں مصیبت میں استقامت ہے اور محرومی میں غیرت و حمیّت۔ ان کے کلام میں درد کی لَو اور انسانیت کی شبنم کا پرتو ہے۔ میرؔ نے غمِ عشق کو مردانہ وار ٹھہرایا ہے اور غمِ آفاق کو ہمّتِ مردانہ کی آہنی ڈھال بتایا ہے۔ وہ ڈوب کر اُبھر سکتا ہے اور مرنے کے بعد بھی آگے چلنے کا عزمِ مصمّم رکھتا ہے۔ یہی انسانیت اور مردِ کامل کی خصوصیت تصوّر کی جاتی ہے۔ میرؔ اپنی ناکامیوں کا ذِکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میرؔ کی عظمت کا راز یوں ہی نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ ان کی شاعری کے خدوخال کو نہ سمجھا جائے۔ ان کی شاعری میں بہت ہی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے مزیّن ہو کر ان کی شاعری ایک آفاقی اور عالمی شاعری بنتی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ کون کون سے عناصر ہیں جن کے خمیر سے میرؔ کی شاعری کی تخلیق عمل میں آتی ہے۔ ان عناصر کے بارے میں معلوم کریں جن کی وجہ سے ان کی شاعری میں فکر کا عنصر غالب ہے جس میں جذبات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ ان کے یہاں زندگی کی حقیقتیں اپنے پورے وجود کے ساتھ دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں شاعر کے جذبات و احساسات بھی یقیناً معاون ثابت ہوتے ہیں۔ میرؔ نے اس فریضے کو بخوبی انجام دیا ہے۔ مثلاً اگر کسی شیشے کے کارخانے کو دیکھ کر انہیں محسوس ہوتا ہے کہ پھونک مارنے میں ذرا سی بے احتیاطی مصنوعات کی شکل بگاڑ سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ انہیں دنیا کے معاملات کا بھی احساس ہوتا ہے۔ جہاں ہر ہر قدم سنبھل کر رکھنا پڑتا ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

میرؔ کی دوسری خوبی یہ تصوّر کی جاتی ہے کہ وہ جو موضوع اپنی شاعری کے لئے منتخب کرتے ہیں اس میں ایک خاص قسم کی معنویت اور اہمیت پوشیدہ ہوتی ہے۔ میرؔ کسی خاص نظریے کے شاعر نہیں ہیں۔ زندگی میں پیش آنے والا ہر بڑا اور چھوٹا تجربہ ان کے دل پر اثر کرتا ہے اور وہ

ان کے شعر میں ڈھل جاتا ہے۔ان کی شاعری میں اکثر وبیشتر عشق کے تجربات نظر آتے ہیں اور یہ وہ تجربہ ہے جو ہر شخص کے دل پر کبھی نہ کبھی اثرانداز ہوتا ہے۔اسی لئے میؔر کی شاعری ہر دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔میؔر اپنی آپ بیتی سناتے ہیں تو وہ جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔.

میؔر کی زبان ایسی ہے جیسے ایک آدمی دوسرے سے باتیں کرتا ہے یعنی بول چال کی زبان میں ان کی شاعری بہت اثرانگیز ہوتی ہے۔ دیکھیے ایک شعر جس میں پھول کی بے ثباتی کا ذِکر کرتے ہیں:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسّم کیا

پیکر تراشی میں میؔر کمال رکھتے ہیں یعنی لفظوں کے ذریعے تصویر بنا کر حُسن وخوب صورتی سے پیش کرنا۔یہ ان کی فن کاری کی دلیل ہے۔ایک سنی ہوئی چیز کے بارے میں محسوس کرنے اور دیکھی ہوئی چیز کے محسوس کرنے میں فرق ہے۔میؔر پیکر تراشی کے ذریعے وہ منظر سامنے لا دیتے ہیں جسے قاری اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے:

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں،کم کم بادوباراں ہے

☆

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

اس کے علاوہ تشبیہ واستعارہ، مجازِ مرسل اور صنعتِ تلمیح وغیرہ کی بہت سی مثالیں ان کی شاعری میں موجود ہیں۔میؔر نے فارسی نثر میں دو کتابیں لکھیں ایک ''ذِکرِ میر''،جس میں ان کے حالاتِ زندگی کی تفصیل ہے اور دوسری مشہور کتاب ''نکات الشعرا''،جس میں شعرائے اردو کے حالات ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۵﴾ میؔر کی شاعری کس شہر کی زبان پر مبنی ہے؟

﴿۶﴾ ''ہستی اپنی حباب کی سی ہے''۔اس کا دوسرا مصرع لکھیے۔

﴿۷﴾ ریختہ کی شروعات میؔر نے کس کے کہنے پر کی تھی؟

﴿۸﴾ ''میؔر شعر نہیں کہتے باتیں کرتے ہیں''۔یہ قول کس کا ہے؟

﴿۹﴾ میؔر کی شاعری کو کس ناقد نے سحر یا طلسم سے تعبیر کیا ہے؟

﴿۱۰﴾ ''لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام'' کا مصرعِ ثانی لکھیے۔

05.05 میر تقی میرؔ کی پہلی غزل

﴿۱﴾

﴿۱﴾ جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

﴿۲﴾ واعظ نہیں کیفیتِ مے خانہ سے آگاہ
یک جرعہ بدل ورنہ یہ مندیل دھر آوے

﴿۳﴾ صناع ہیں سب خوار، ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

﴿۴﴾ اے وہ ! کہ تو بیٹھا ہے سرِ راہ پہ زنہار
کہیو ! جو کبھی میرؔ بلا کش ادھر آوے

﴿۵﴾ مت دشتِ محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے

05.06 میر تقی میرؔ کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔غزل کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میرؔ نے یہ غزل ایک خاص انداز اور مخصوص لہجے میں کہی ہے۔عشق کی آزمائش اور محبت میں گرفتار لوگوں کی روداد زندگی اس میں موجود ہے۔شراب کی مستی اور شراب نوشوں کی کیفیت کا اظہار بھی اس میں بخوبی نظر آتا ہے۔ساتھ ہی دنیا میں فن کاروں اور ہنر مندوں کی ناقدری کا شکوہ بھی موجود ہے۔یہ ایک عالمی حقیقت ہے کہ جس کے پاس کوئی ہنر یا فن ہوتا ہے لوگ اس کی برائی بھی زیادہ کرتے ہیں۔اس ہنر کو شاعر نے عیب سے تعبیر کیا ہے۔پھر اس نے اپنے تجربات کی روشنی میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ عشق کی وادی میں ہرگز ہرگز قدم مت رکھو۔کیوں کہ اس سفر کے لئے جو گھر سے نکلتا ہے اسے مختلف آزمائشوں اور مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے اور اس راہ میں قدم رکھنے سے حضرت خضر علیہ السلام بھی احتراز کرتے ہیں۔اس میں ایک خوب صورت تاریخی بیان اور بہترین پیرایۂ اظہار بھی موجود ہے۔علمِ بیان کی ایک صنعت بھی اس کے آخری شعر میں موجود ہے جسے علمِ بیان میں تلمیح کہتے ہیں۔یہ پوری

غزل نہایت آسان اور رواں ہے۔ الفاظ سلیس اور اندازِ بیان متاثر کن ہے۔ میرؔ کا یہی خاص رنگ و آہنگ ہے جس کی وجہ سے وہ پوری اردو شاعری کی تاریخ میں خدائے سخن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرؔ نے اس پوری غزل میں واعظ، صناع، بلاکش، عاشق اور حضرت خضر کا ذِکر کر کے ایک پوری معاشرتی زندگی کی عکّاسی کی ہے۔ جہاں یہ تمام افراد اپنی زندگی کا احساس اپنے اپنے انداز سے دلاتے ہیں۔

غزل کی تشریح:۔

شعر اوّل: جب عاشق اپنے محبوب کا نام لیتا ہے تو نام لیتے ہی اس کے عشق میں یا اس کی جدائی میں اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور جب اس طرح کی کیفیت سے عاشق دوچار ہوتا ہے تو پوری زندگی اسی حالت میں گزارنے کے لئے اس کے پاس کہاں سے حوصلہ آئے۔ یہاں شاعر نے حوصلہ اور ہمّت کے لئے لفظ جگر استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

دوسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ مے خانے کی کیفیت اور اس کی سرمستی سے واعظ کی واقفیت نہیں ہے اس سے پہلے کہ میں مے خانے کی مستی سے سرشار ہوں اور واعظ چلا آئے، اسے اے ساقی تو کم از کم شراب کا ایک گھونٹ پلا دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ عمامہ پوش اور جبّہ و دستار والا واعظ اس مے خانے میں چلا آئے اور شراب کے ایک گھونٹ سے بھی محروم ہو جاؤں۔ یہاں جرعہ کے معنی گھونٹ اور مندیل کا مطلب پگڑی یا عمامہ ہے جسے شاعر نے علامت کے طور پر واعظ کی نشان دہی کے لئے استعمال کیا ہے۔

تیسرا شعر: اس شعر میں میرؔ نے اپنی ناقدری کا شکوہ کرتے ہوئے تمام ہنرمندوں کی ذلّت و رسوائی اور ندامت و شرمندگی کے احساس کو پیش کیا ہے جو میرؔ کے دَور میں موجود تھے۔

چوتھا شعر: میرؔ کہتے ہیں کہ اے فن کار! تم جس راہ پر بیٹھے ہو اور تمہارے ساتھ جو لوگوں کے برتاؤ ہو رہے ہیں اس راہ پر میرؔ ہرگز نہیں جائے گا۔ کیوں کہ میرؔ بلاکش یعنی شراب نوش میرؔ کو اس بات کا علم ہے کہ کس جگہ اور کہاں جانا چاہیے۔ وہ ہرگز ہرگز اس راہ پر نہیں جائے گا۔ اس لئے کہ تم جس راہ پر بیٹھے ہو وہ راہ میرؔ کی راہ سے جداگانہ ہے۔

پانچواں شعر: شاعر کہتا ہے کہ تم محبت کی وادی میں قدم مت رکھو! یعنی محبت کے چکّر میں مت پڑو۔ کیوں کہ اس وادی میں سفر کرنے سے حضرت خضر علیہ السلام جیسی شخصیت کو بھی پرہیز ہے۔ یہاں شاعر نے صنعتِ تلمیح سے کام لیا ہے۔ جس میں کسی واقعے کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور یہاں حضرت خضر کا ذِکر بھی اسی تاریخی واقعے کی طرف ہے جس سے حضرت خضر کی ذات منسوب ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۱﴾ جرعہ اور مندیل لفظوں کے معنی بتائیے؟

﴿۱۲﴾ اس غزل کے پہلے شعر میں 'ترا نام' سے شاعر کا اشارہ کس جانب ہے؟

﴿۱۳﴾ غزل کے آخری شعر میں حضرت خضر کا استعمال کر کے کون سی صنعت استعمال کی گئی ہے؟

﴿۱۴﴾ ممیز کے کیا معنی ہیں؟

05.07 میر تقی میرؔ کی دوسری غزل

﴿۲﴾

﴿۱﴾ پتّا پتّا ، بوٹا بوٹا ، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے ، گل ہی نہ جانے ، باغ تو سارا جانے ہے

﴿۲﴾ عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے ، اپنا وارا جانے ہے

﴿۳﴾ چارہ گری بیماریِ دل کی ، رسمِ شہرِ حُسن نہیں
ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارہ جانے ہے

﴿۴﴾ مہر و وفا و لطف و عنایت ، ایک سے واقف ان میں نہیں
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ ، رمز و اشارہ جانے ہے

﴿۵﴾ تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا ، میرؔ بھی ناداں ، تلخی کش
دم دار آبِ تیغ کو اس کے ، آبِ گوارا جانے ہے

05.08 میر تقی میرؔ کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ اس پوری غزل میں شاعر نے عاشق کی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔شاعر کہنا چاہتا ہے کہ ہمارے دل کی جو کیفیت ہے اس سے باغ کے تمام پتّے بوٹے واقف ہیں مگر پھول کو اس کا علم نہیں یعنی ایک طرح سے طنز کا تیر چلا کر شاعر اپنے محبوب پر نشانہ سادھنا چاہتا ہے۔ اس غزل میں عاشق کی سادگی اور اس کا بھولا پن دکھایا گیا ہے۔ جو عشق میں سب کچھ ہار کر نفع کا سودا کرنا چاہتا ہے یعنی اس کی جان بھی اس راہ میں چلی جائے تو بھی اسے فائدہ ہی نظر آتا ہے۔ کیوں کہ اس کی نظر میں یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد کم از کم حاصل ہوگیا۔ اس میں عاشق اور معشوق کی کیفیت، ان دونوں کی ملاقات اور ملاقات کے بعد کی کیفیت، عاشق پر عشق کے اثرات، دلبروں کے ناز و ادا کو نہایت ہی خوب صورت پیرائے میں میرؔ نے پیش کیا ہے۔ یہ پوری غزل موسیقی سے لبریز ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں میرؔ نے استادانہ مہارت سے کام لیا ہے۔ یہ غزل ان کی مشہور ترین غزلوں میں سے ایک ہے جس کے کئی مصرعے ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پوری غزل شعری حُسن اور ادبی خوبیوں سے بھرپور ایک مکمّل داستانِ عاشق و معشوق ہے۔ جس میں عاشق نے اپنے محبوب کی کج ادائی، بے رخی اور سرد مہری کو بیان کر کے اپنے دلی جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔

غزل کی تشریح:۔

شعراوّل: میرؔ کہتے ہیں کہ میرے حالِ زار کے مطابق باغ کے پتّے، بوٹے اور ہر قسم کے چھوٹے چھوٹے درخت جو باغ میں موجود ہیں، آگاہ ہیں لیکن ایک پھول باغ کا ایسا ہے جو میری حالت سے بے خبر ہے۔شاعر نے باغ، پتّا پتّا بوٹا بوٹا کہہ کر یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ میں جہاں رہتا ہوں اس کے آس پاس کے بچّے، جوان اور بوڑھے سبھی میرے عشق کی کیفیت سے آگاہ ہیں۔اور میری عشق میں کیا بُری حالت ہو رہی ہے، اس سے بھی سبھی لوگ واقف ہیں لیکن جس شخص کو میری اس کیفیت کا احساس ہونا چاہیے وہ میری حالت سے بے خبر ہے۔ یعنی میرا محبوب میری محبت کی تڑپ اور عشق کی ٹیس سے بے خبر ہے۔شاعر نے یہاں پتّا بوٹا اور باغ کہہ کر اپنے آس پاس کے افراد کو مراد لیا ہے اور ''پھول'' کہہ کر اپنا محبوب مراد لیا ہے جس سے وہ عشق کرتا ہے۔

دوسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ عاشق جیسا سادہ لوح اور بھولا بھالا انسان تو شاید ہی کوئی دنیا میں ہو جو نقصان کا سودا کر کے خوشی و مسرّت محسوس کرتا ہے۔اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عاشق ایک ایسا حیوانِ ناطق ہے جو عشق میں سب کچھ قربان کر دیتا ہے، یہاں تک کہ اپنی جان قربان کر دینے کو بھی تیار رہتا ہے اور اپنی اس قربانی کو وہ نفع سے تعبیر کرتا ہے اپنے جی کے نقصان کو وہ فائدہ تصوّر کرتا ہے۔

تیسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ میں جس شہر میں رہتا ہوں اس شہر کے لوگوں میں بیماروں کی عیادت اور مزاج پُرسی کی رسم نہیں ہے۔سبھی اپنے آپ میں مگن ہیں۔دل کے بیمار کی چارہ گری کرنے والا یہاں کوئی نہیں ہے۔اگر درد کا احساس یہاں کے لوگوں کو ہوتا تو اسی شہر میں میرا محبوب بھی رہتا ہے، وہ بھی اس درد کی چارہ گری کو جانتا مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس شہرِ نامراد میں ہر شخص بے حس اور بے درد ہے۔اس شہر سے مراد دنیا ہے اور اس دنیا میں رہنے والے عشق کی رسم میں یقین نہیں رکھتے۔وہ عشق کی کیفیات سے محروم ہیں۔

چوتھا شعر: یہاں کے لوگ یعنی اس شہر کے لوگ انسانی اقدار سے محروم ہیں نہ ان کے پاس وفاداری ہے اور نہ مروّت اور نہ ہی لطف وعنایت ہے اور نہ مہربانی کی صفت سے متّصف ہیں۔ہاں ان لوگوں کو ایک ہنر ضرور آتا ہے اور وہ یہ کہ عاشق پر طنز کرنا بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔جب عاشق عشق کی آگ میں جلتا ہے اور عشق کی داخلی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے تو یہ لوگ مذاق اُڑاتے ہیں اور عاشقِ صادق پر طنز کے تیر برساتے ہیں۔کوئی طنز کرتا ہے، کوئی کنایہ اور رمز و اشارہ کے ذریعے سیدھا اس پر نشانہ سادھتا ہے۔

پانچواں شعر: شاعر کہتا ہے کہ محبوب کتنا ظالم ہے اس کی انتہا نہیں۔وہ کہتا ہے کہ محبوب ہمارے خون کا کتنا پیاسا ہے۔وہ اپنے محبوب کی تیز تلوار کی دھار کو ایک آبِ گوارہ تصوّر کرتا ہے۔یعنی اس تلوار میں جو تیز دھار ہے اسے آبِ گوارہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔یعنی اسے قبول کر لینے کو آبِ گوارہ بتایا گیا ہے۔میرؔ اس کے تیغِ ظلم کی دھار کو بخوشی گوارہ کرنے کو تیار ہے کیوں کہ اس کی نظر میں عشق کی آگ میں جلنے سے بہتر ہے کہ وہ محبوب کے تلوار کا نشانہ بن جائے۔یہی عاشق کے عشق کی معراج ہے۔اس شعر میں تلخی کش کا مطلب مصائب اُٹھانے والا، دَم دار کا مطلب تیز ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۵﴾ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے۔لفظ ''گل'' سے کس جانب اشارہ کیا گیا ہے؟

﴿۱۶﴾ غزل کے چوتھے شعر میں رمز و اشارہ کس معنی میں استعمال ہوئے ہیں؟

05.09 خلاصہ

میر تقی میر کا نام محمد تقی اور تخلص میر تھا۔ ۱۷۲۳ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا فوج میں ملازم تھے لیکن والد جن کا نام محمد علی تھا ایک اللہ والے بزرگ تھے۔ محمد علی خود صوفی تھے اور صوفیوں سے دوستی رکھتے تھے۔ ابھی میر کی عمر صرف گیارہ ۱۱ سال تھی کہ ان کے والد محمد علی کا انتقال ہوگیا۔ ان کے سوتیلے بھائیوں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ ان کی زندگی دشوار بنا دی۔ وہ آگرہ سے روزی کی تلاش میں نکل پڑے اور دہلی کو سکونت بنایا۔ دلّی میں میر نے سراج الدّین خاں آرزو کے یہاں پرورش پائی۔ آرزو، میر کے رشتہ دار تھے۔ انہی کے کہنے پر میر نے ریختہ کے طرز پر غزل کہنے کا آغاز کیا۔ دلّی کی تباہی کے بعد میر بھی دوسرے شعرا کی طرح لکھنؤ کوچ کر گئے اور وہاں نواب آصف الدّولہ کے دربار سے منسلک ہوگئے۔ جہاں انہیں ماہانہ تین سو روپیہ وظیفہ بھی ملنے لگا لیکن نواب کے ساتھ ان کی زیادہ دنوں تک نہیں نبھی اور وہ نواب سے دُور ہوگئے۔ ان کی پوری زندگی غم و حزن و ملال و مصائب کا مجموعہ تھی۔ ان کی شاعری میں یہ تمام موضوعات غیر دانستہ طور پر داخل ہوگئے۔ ان کی شاعری میں دنیا کی حقیقت، عشق کی بالادستی اور انسانی اقدار کی بلندی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری درد کی شاعری ہے۔ میر کو اردو شاعری میں خدائے سخن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور انہیں اردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ میر نے اپنی شاعری میں واعظوں کی ریاکاری، محبوب کی جفا پسندی اور بے وفائی کی بالادستی ہر جگہ دکھائی ہے۔

میر کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ان کی صداقت بیانی ہے جو زندگی کا حصہ ہے۔ وہ بول چال کی زبان میں شاعری کرتے تھے جو سیدھے دل میں اُتر جاتی تھی۔ وہ ایک قناعت پسند، خوددار اور نیک دل انسان تھے۔ انہوں نے زندگی کی تلخیوں کو جھیلا اور اس سے ہمہ وقت مقابلہ کرتے رہے اور اپنے مشن سے کبھی بھی دور نہ ہوئے۔ بڑے بڑے شاہانِ وقت اور اُمرائے زمانہ سے بھی مرعوب نہ ہوئے اور ان کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا مناسب نہ سمجھا۔ حالاں کہ ان کی زندگی میں کتنے ایسے مواقع آئے جب وہ معاشی طور پر پریشان نظر آئے لیکن انہوں نے فاقہ کشی کو ہاتھ پھیلانے پر ترجیح دی۔ ان کی شاعری میں تشبیہ و استعارہ، کنایہ اور صنعت تلمیح کی پوری جلوہ گری نظر آتی ہے۔ انہوں نے دو مشہور کتابیں نثر میں لکھیں۔ ایک ''ذِکرِ میر'' اور دوسری ''نکات الشعرا'' یہ دونوں کتابیں فارسی زبان میں ہیں۔ ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

05.10 فرہنگ

آبِ تیغ	: تلوار کی دھار	زیاں	: نقصان، گھاٹا
اوصاف	: وصف کی جمع، خوبیاں، اچّھائیاں	سوزشِ درونی	: اندرونی جلن، دل کی سوزش
بصارت	: قوّتِ بینائی، دیکھنے کی طاقت	صنّاع	: کاری گر، ہنرمند
بلاکش	: آفت جھیلنے والا، مصیبت برداشت کرنے والا	ضعفِ بصری	: دیکھنے کی قوّت میں کمی، قوّتِ بینائی کی کمزوری
بے تاب و تواں	: کمزور، نحیف، جو بوجھ نہ اٹھا سکے	فارغ البالی	: آسودگی، اطمینانی کیفیت
تلخی کش	: مصائب برداشت کرنے والا	فراغ	: فرصت، نجات، سکھ
تلمیح	: ایسی صنعت جس میں کسی تاریخی واقعہ کا ذکر ہو	مبہوت	: بے خود، حیران، ہکا بکا

جرعہ	:	گھونٹ	مخمّس	:	وہ نظم جس میں ہر بند پانچ مصرعوں کا ہو
چارہ گری	:	کام بنانے والا، کام کرنے والا، معالج	معترضین	:	اعتراض کرنے والے، روک ٹوک کرنے والے
داخلی کیفیات	:	دلی جذبات واحساسات			
دل شکستگی	:	افسردگی، مایوسی	مضمحل	:	کمزور، لاغر، اداس، رنجیدہ
دنیا و مافیہا	:	دنیا، اور دنیا میں جو کچھ ہے	ممیّز	:	تمیز کیا گیا، پہچانا گیا
رمز واشارہ	:	آنکھوں، بھوؤں سے اشارہ کرنا	مندیل	:	پگڑی، عمامہ، طلائی پٹکا، رومال
رمق	:	تھوڑی سی جان، اخیر سانس، ذراسا، چاشنی کا کچھ اثر	وارا	:	بچت، کفایت، فائدہ، نفع، بیماری سے افاقہ

05.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : میرؔ کی غزل کی خصوصیات مختصراً تحریر کیجیے؟

سوال نمبر۲ : میرؔ کی تعلیم اور ان کے کردار کے اوصاف بیان کیجیے؟

سوال نمبر۳ : میرؔ نے آگرہ سے نکل کر کہاں کا سفر کیا۔ اس سفر کی داستان لکھیے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : میر تقی میرؔ کی حیات پر روشنی ڈالیے؟

سوال نمبر۲ : میر تقی میرؔ کی شاعری پر سیر حاصل بحث کیجیے؟

05.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ از سیّد احتشام حسین

۲۔ اردو ادب کی تاریخ از عظیم الحق جنیدی

۳۔ اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ از سنبل نگار

۴۔ انتخابِ کلامِ میر از مولوی عبدالحق

05.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ میر تقی میرؔ کی پیدائش ۱۷۲۳ء کو آگرہ میں ہوئی۔

﴿۲﴾ فارسی زبان میں

﴿۳﴾ دہلی میں

﴿۴﴾ ان کے سوتیلے بھائیوں نے۔

﴿۵﴾ دہلی کی بول چال کی زبان میں۔

﴿۶﴾ یہ نمائش سراب کی سی ہے

﴿۷﴾ خان آرزو کے کہنے پر۔

﴿۸﴾ پروفیسر نورالحسن نقوی کا۔

﴿۹﴾ رام بابو سکسینہ

﴿۱۰﴾ آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

﴿۱۱﴾ جرعہ کا معنی گھونٹ اور مندیل کا مطلب پگڑی اور عمامہ ہے۔

﴿۱۲﴾ اپنے محبوب کی جانب۔

﴿۱۳﴾ صنعتِ تلمیح

﴿۱۴﴾ تمیز کیا ہوا، پہچانا گیا

﴿۱۵﴾ محبوب کی جانب۔

﴿۱۶﴾ آنکھوں یا بھوؤں سے اشارہ کرنے کے معنی میں۔

٭

اکائی 06 : مرزا غالبؔ

ساخت

06.01 : اغراض و مقاصد
06.02 : تمہید
06.03 : مرزا غالبؔ کے حالاتِ زندگی
06.04 : مرزا غالبؔ کی شاعرانہ خصوصیات
06.05 : مرزا غالبؔ کی پہلی غزل
06.06 : مرزا غالبؔ کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
06.07 : مرزا غالبؔ کی دوسری غزل
06.08 : مرزا غالبؔ کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
06.09 : خلاصہ
06.10 : فرہنگ
06.11 : نمونہ امتحانی سوالات
06.12 : حوالہ جاتی کتب
06.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

06.01 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی حیات پر مختصراً روشنی ڈالی جائے گی اور ان کی شاعرانہ خصوصیات کو بطورِ خاص اُجاگر کیا جائے گا تاکہ آپ ان کی تخلیقی بصیرت اور شاعرانہ صلاحیت دونوں سے آگاہ ہوسکیں۔ اکائی میں آپ کے مطالعے کے لئے غالبؔ کی دو معروف و مقبول غزلوں کے منتخب اشعار بھی پیش کیے جائیں گے اور ان منتخب اشعار کی تشریح بھی مختصر طور پر کی جائے گی نیز ان کا مجموعی تاثر بھی پیش کیا جائے گا۔ آخر میں پوری اکائی کا خلاصہ بھی پیش کیا جائے گا جس سے مرزا غالبؔ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

06.02 تمہید

مرزا غالبؔ اردو شاعری کا اہم اور بڑا نام ہے۔ انہوں نے اردو غزل کو ایک نئے جہانِ معنی سے آشنا کیا اور آبرو بخشی۔ ان کی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ ان کے قدردان ہر نسل اور ہر زمانے میں رہے ہیں اور ان کی تعداد میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے کہا تھا کہ ہندوستان میں دو ہی الہامی کتابیں ہیں، ایک وید مقدس اور دوسری دیوانِ غالبؔ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غالبؔ کی شاعری میں ہر عہد اور ہر زمانے کی تسکین کا سامان موجود ہے۔

06.03 مرزا غالبؔ کے حالاتِ زندگی

مرزا غالبؔ ۲۷/دسمبر ۱۷۹۷ء مطابق ۸/رجب ۱۲۱۲ھ کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام مرزا اسد اللہ خاں تھا۔ جب کہ عرفیت مرزا نوشہ اور خطاب ’نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ‘ تھا۔ ان کے خاندان کا شمار متمول گھرانوں میں ہوتا تھا۔ ان کے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ اور والدہ کا نام عزت النسا بیگم تھا۔ اُنہی کے بطن سے مرزا غالبؔ پیدا ہوئے۔ ابھی غالبؔ صرف پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد ایک جنگ میں مارے گئے۔ والد کے گزر جانے کے بعد مرزا کی پرورش و پرداخت ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے کی لیکن جب ان کی عمر نو برس کی ہوئی تو چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد نانا نے مرزا غالبؔ کی دیکھ ریکھ کی۔ پھر نواب احمد بخش خاں نے مرزا کے خاندان کے لئے انگریز حکومت سے وظیفہ دلوایا۔ اس طرح مرزا کی زندگی کسی طرح پٹری پر آئی۔

مرزا غالبؔ نے اپنی ابتدائی تعلیم آگرے میں مولوی محمد معظم سے حاصل کی۔ مولوی معظم نے انہیں عربی اور فارسی کی تعلیم دی۔ جب مرزا کی عمر چودہ برس کی تھی تو اس وقت ایک ایرانی عالم مُلّا عبدالصمد بغرضِ سیر و سیاحت آگرہ وارد ہوئے۔ انہوں نے دو برس تک اس ایرانی عالم سے درس لیا لیکن اس ایرانی عالم سے متعلق جو کچھ بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ محض افسانہ طرازی معلوم ہوتی ہیں۔ مرزا کی تحریروں سے اس بات کی تردید ہوتی ہے۔ شاید انہوں نے یہ نام اس لئے لیا ہوگا کہ وہ بے استادنہ کہے جائیں۔ مرزا کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ انہوں نے اپنی ایک فارسی غزل اپنے استاد مولوی معظم کو اصلاح کے لئے اس وقت دی جب ان کی عمر مشکل سے دَس برس ہوگی۔

تیرہ برس کی عمر میں مرزا کی شادی نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ غالب شادی کے دو برس بعد یعنی ۱۸۱۲ء میں اپنے آبائی وطن کو خیر آباد کہہ کر دہلی آ گئے۔ بیوی عبادت گزار تھی جب کہ مرزا رندِ بلانوش تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میاں اور بیوی کا مزاج مختلف تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ غالبؔ کے اپنی بیوی سے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے۔ مرزا کی سات اولادیں ہوئیں لیکن ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں رہی۔ بعد میں مرزا نے امراؤ بیگم کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کو گود لے لیا۔

غالبؔ کے آباو اجداد سنی تھے لیکن غالبؔ نے ایک دو خطوں میں اپنے اثنا عشری ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس بات پر بعض محققین کو بھروسہ نہیں۔ ان کے مطابق مرزا ہمیشہ مخاطب کو خوش کرنے کے لئے دل چسپ بیان دے دیتے تھے۔ دراصل وہ اعتدال پسند تھے اور کھلا ذہن رکھتے تھے۔ انسانیت کے قدر دان تھے۔ ان کو کسی بھی مسلک اور عقیدے سے اختلاف نہیں تھا۔ ان کے حلقے میں شیعہ، سنی، ہندو، مسلمان اور عیسائی سبھی شامل تھے۔

غالبؔ ہمیشہ مالی دشواریوں میں گھرے رہے۔ مختصر آمدنی سے زندگی کا گزارا مشکل تھا اس لئے وہ سودی قرض میں دبے رہے۔ پنشن بند ہونے کے بعد وہ قرض دار ہو گئے۔ مالی حالت سدھارنے کی غرض سے انہوں نے دُور دراز کے سفر بھی کیے۔ پنشن میں اضافے کے مقصد سے انہوں نے کلکتہ کا سفر کیا۔ وہ دو بار رام پور بھی گئے مگر انہیں کامیابی نہیں ملی۔ ایک دفعہ قمار بازی کے الزام میں پکڑے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ غالبؔ کے مکان میں امیر زادے شرط لگا کر چوسر اور شطرنج کھیلتے تھے۔ اس سے غالبؔ کو کچھ آمدنی ہو جاتی تھی لیکن اس الزام میں غالبؔ گرفتار ہوئے اور اُنہیں سزا بھی ہوئی۔ یہ ایسا داغ تھا جس نے زندگی بھر انہیں شرم سار کیے رکھا۔ ایک دَور ایسا بھی آیا کہ انہوں نے جسم کے کپڑے بیچ کر گزر بسر کی۔ تاہم غالبؔ کا یہ کمال تھا کہ انہوں نے تمام مشکلات کو ہنس کر برداشت کیا۔

غدر ۱۸۵۷ء میں دہلی میں تباہی کا طوفان مچا۔ غالبؔ بھی اس کا شکار ہوئے۔ ان کا مال و اسباب لٹ گیا اور ذہنی سکون بھی چلا گیا۔ دہلی کی تباہی و بربادی کا غم غالبؔ کو زندگی بھر رہا۔ انہوں نے اپنے بہت سارے خطوط میں دہلی کی تباہی کا ذکر کیا ہے۔ غالبؔ اس زمانہ میں بلی ماران میں رہتے تھے۔ اس ہنگامے میں منشی ہرگوپال تفتہ اور لالہ مہیش داس نے ان کی مالی امداد کی۔

مرزا کی صحت ۱۸۸۶ء سے خراب رہنے لگی تھی۔ ان کی زندگی کے آخری ایام بہت صبر آزما تھے۔ غربت، تنگ دستی اور بیماری نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان پر قولنج کے دَورے پڑتے تھے۔ بڑھاپے میں بینائی بھی کمزور ہوگئی تھی۔ کان سے ایک طرح سے بہرے ہو چکے تھے۔ حافظہ خراب اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا۔ شراب نوشی کے شدید اثرات بڑھاپے میں دیکھنے کو ملے۔ انہیں بھوک نہیں لگتی تھی اور جسم پر پھوڑے بھی نکل آئے تھے، اُٹھنا بیٹھنا مشکل تھا۔ گویا زندگی کے آخری دنوں میں انہیں سخت آزمائش سے گزرنا پڑا۔ انتقال سے چند روز پہلے ان پر بے ہوشی طاری ہوگئی تھی، دماغ پر فالج گرا تھا۔ دواؤں سے حالت بہتر نہ ہوئی اور اسی بے ہوشی میں ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو اس عظیم شاعر کا انتقال ہو گیا۔ انہیں درگاہِ حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خاندانِ لوہارو کے قبرستان میں دفن کیا گیا جو اس وقت غالب اکیڈمی سے متصل ہے۔

مرزا نے فارسی اور اردو نظم و نثر میں درجنوں تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جو انہیں شہرتِ دوام بخشتی ہیں۔ یہ تصانیف فارسی اور اردو دونوں کے بیش بہا خزانے ہیں۔ فارسی نثر میں ''پنج آہنگ، مہرِ نیم روز، دستنبو، قاطعِ برہان، درفشِ کاویانی'' اور فارسی شاعری میں ''دیوانِ فارسی، سبد چین، سبد باغ دودَر، دعائے صباح، متفرقاتِ غالب، مآثرِ غالب'' جیسی تصانیف قابلِ ذکر ہیں۔ جب کہ اردو شاعری میں 'دیوانِ اردو' اور اردو نثر میں ''عودِ ہندی، اردوئے معلّٰی، مکاتیبِ غالب، نادراتِ غالب، رقعاتِ غالب، قادر نامہ، انتخابِ غالب، نامۂ غالب اور تیغ وتیز'' جیسی تصانیف گنجِ گراں مایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ صرف غالبؔ کے اردو دیوان سے متعلق یہ اطلاعات ملتی ہیں کہ ان کا اردو دیوان ان کی زندگی میں پانچ بار چھپا۔ پہلی بار ۱۸۴۱ء میں سید المطابع دہلی سے، دوسری بار ۱۸۴۷ء میں مطبع دارالسلام دہلی سے، تیسری بار ۱۸۶۱ء میں مطبع احمدی دہلی سے، چوتھی بار ۱۸۶۲ء میں مطبع نظامی کان پور سے، پانچویں بار ۱۸۶۳ء میں مطبع شیونرائن آگرہ سے شائع ہوا۔ جب کہ غالبؔ کی وفات کے بعد ان کے اردو دیوان کے کئی ایڈیشن چھپے جن میں نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ عرشی، گُلِ رعنا، مرقعِ چغتائی، نقشِ چغتائی، دیوانِ مصوّر از صادقین اور نسخۂ عرشی زادہ قابلِ ذکر ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ مرزا غالبؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے اور ان کی وفات کب اور کہاں ہوئی؟

﴿۲﴾ غالبؔ کا اردو دیوان ان کی زندگی میں کتنی بار چھپا؟

﴿۳﴾ غالبؔ کی وفات کے بعد ان کے اردو دیوان کے جو قابلِ ذکر ایڈیشن شائع ہوئے ان کے نام بتائیے؟

06.04 مرزا غالبؔ کی شاعرانہ خصوصیات

اردو شاعری میں غالبؔ کا کوئی ثانی نہیں۔ غالبؔ جیسے شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس عظیم شاعر کی بدولت اردو شاعری معراج کو پہنچی ہے۔ انہوں نے فارسی میں بھی شاعری کی۔ غزلیں، قصائد، قطعات اور رباعیات کہیں لیکن انہیں اردو غزلوں سے شہرتِ دوام نصیب ہوئی۔ البتہ ان کے خطوط سے ان کی مقبولیت میں ضرور چار چاند لگے۔ زمانے کی ستم ظریفی یہ ہے کہ غالبؔ کو ان کی زندگی میں وہ مقام

ومرتبہ نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ اسی لئے انہیں ساری عمر یہ شکایت رہی کہ مدح کا صلہ نہ ملا۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا۔ غزل کی داد کو وہ ترستے رہے۔ قدر ناشناسی سے ان کا مزاج تلخ ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ ان کے کلام میں مشکل پسندی کے سبب ہوا لیکن رفتہ رفتہ جب انہوں نے سہل اور آسان شعر کہنا شروع کیا تو ان کی شاعری سمجھنے والوں کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ غالبؔ اور ذوقؔ کی معرکہ آرائی سے بھلا کون واقف نہیں۔ غالبؔ جو ایک نابغۂ روزگار، یکتائے فن اور پیغمبرِ سخن تھے، ان کے آگے ذوقؔ کے مداحوں کی ایک نہ چلی اور غالبؔ ہمیشہ ملکِ سخن کے بے تاج بادشاہ رہے۔

غالبؔ کی زندگی کا ایک بڑا حصہ مشکلات میں گزرا۔ اس لئے ان کی شاعری میں مایوسی اور افسردگی کا رنگ پیدا ہوا لیکن انہوں نے تمام مصائب کا مقابلہ بڑی دلیری کے ساتھ کیا۔ شاید اسی لئے ان کا کلام قنوطیت سے پاک ہے۔ وہ بہت ذہین فن کار تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے فنی نقائص اور عیوب پر غور فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ، مولانا فضلِ حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہؔ جیسے ماہرینِ فن سے مشورہ لے کر اس پر عمل کرتے رہے۔ نتیجتاً ان کی شاعری میں وہ تمام خوبیاں پیدا ہو گئیں جو ایک عہد آفریں شاعر میں ہوتی ہیں۔ اگر ان کے کلام پر غور وفکر کیا جائے تو چار قسم کے اشعار ان کے یہاں کثرت سے مل جاتے ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ ان کے بہت سے اشعار اتنے مشکل اور پیچیدہ ہیں کہ انہیں سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ ان کے بہت سے اشعار میں لفظوں کا طلسم نظر آتا ہے۔ تیسری قسم یہ ہے کہ ان کے بہت سے اشعار میں اندازِ بیان دل کش اور مضمون آفرینی ملتی ہے جو انہی کا حصہ ہے۔ چوتھی قسم ان کے اشعار کی یہ ہے کہ وہ اپنے شعروں سے تیر و نشتر کا کام لیتے ہیں۔ ایسے اشعار میں بندش کی دل کشی، خیالات میں تازگی اور رنگارنگی ملتی ہے۔

غالبؔ نے اپنی فارسی شاعری میں بیدلؔ، ظہوریؔ، عرفیؔ اور نظیریؔ وغیرہ کی تقلید کی۔ جب کہ اردو میں ناسخؔ کی پیروی کی لیکن ہمیشہ انہوں نے اپنی انفرادیت کی راہ الگ نکالی۔ شیخ محمد اکرام نے غالبؔ کی شاعری کے پانچ ادوار قرار دیے ہیں۔ ان کے مطابق پہلا دَور ابتدا تا ۱۸۲۱ء ہے جس میں انہوں نے فارسی الفاظ اور فارسی تراکیب کا استعمال کثرت سے کیا اور شعر کو مشکل و پیچیدہ بنا کر پیش کیا۔ اس دَور کے اکثر وبیشتر اشعار شعریت سے خالی نظر آتے ہیں۔ آمد کے اشعار کم اور آورد کے اشعار زیادہ ملتے ہیں۔ دوسرا دَور ۱۸۲۱ء سے ۱۸۲۷ء تک ہے جس میں انہوں نے اردو شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ فارسی تراکیب اور ثقیل الفاظ کا استعمال کم کر دیا نیز بیدلؔ کے بجائے نظیریؔ کا تتبع کیا۔ شاعری میں عاشقانہ رنگ غالب آ گیا اور فطرتِ انسانی کی عکاسی خوب کی۔ خیالی مضامین سے دامن بچایا اور زندگی کے تلخ حقائق کو اپنے شعروں میں خوب برتا۔ تیسرا دَور ۱۸۲۷ء تا ۱۸۴۷ء ہے جس میں انہوں نے زیادہ توجہ تو فارسی شاعری پر دی لیکن اردو شاعری کو بھی جلا بخشتے رہے۔ ان کی بہت سی نمائندہ غزلیں اسی دَور کی ہیں۔ چوتھا دَور ۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۷ء ہے جس میں غالبؔ نے اردو شاعری پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ اس دَور میں جی کھول کر تواتر کے ساتھ غزلیں کہیں۔ اندازِ بیان پختہ ہو گیا۔ طنز، شوخی اور ظرافت کا رنگ نمایاں ہوا۔ لطفِ زبان ہر جگہ نظر آنے لگا۔ یہی وہ دَور ہے جس میں انہوں نے جذبے میں تخیل کو اس طرح سمو دیا کہ ان کی انفرادیت قائم ہو گئی اور وہ غالبؔ بن گئے۔ آخری دَور ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۸ء ہے جس میں غالبؔ نے عام فہم، سادہ اور سلیس شاعری کو خوب فروغ دیا۔ اس دَور کا ان کا کلام سادہ اور سلیس نظر آتا ہے۔ بندش کی چستی اور شوخی و ظرافت کی پختگی نمایاں ہو جاتی ہے اور کوئی بھی غزل مخصوص طرزِ ادا، حُسنِ بیان اور لطفِ زبان سے خالی نظر نہیں آتی۔

اب آیئے غالبؔ کی شاعرانہ خصوصیات پر نظر ڈالیں جن سے ان کی عظمت واضح ہوتی ہے۔ یوں تو بہت سے ناقدین اور ماہرینِ فکرو فن نے غالبؔ کی شاعری کی متعدد خوبیاں بیان کی ہیں لیکن ان میں مشکل پسندی، انفرادیت، ظرافت، رمزیہ اندازِ بیان، ایجاز و اختصار، تہ داری، دل نشینی، حقائق نگاری، انانیت، فلسفہ، حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کا استعمال، اور استفہامیہ اندازِ بیان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

﴿الف﴾ مشکل گوئی: ہر دور میں غالبؔ کی مشکل گوئی پر بحث ہوتی رہی ہے لیکن اگر آل احمد سرور کی اس بات پر غور کیا جائے کہ ''زندگی سادگی سے پیچیدگی کی طرف رُخ کرتی ہے'' تو غالبؔ کے کلام میں دشوار پسندی سے بھی بہت کچھ معنی نکالے جاسکتے ہیں۔ دراصل دشوار پسندی سے شاعری فوراً سمجھ میں نہیں آتی بلکہ اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے گہرے مطالعے اور غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ غالبؔ کی ابتدائی شاعری مشکل اور ناقابلِ فہم ہے جسے مہمل تک کہا گیا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ غالبؔ نے اپنی غزلوں میں معمولی مضامین کو بھی پیچیدہ بنا کر پیش کیا۔ معمولی اور آسان مضمون کو بھی انہوں نے استعاروں اور کنایوں میں اس طرح بیان کیا کہ اس کی مختلف صورتیں پیدا ہوگئیں۔ ان کے یہاں لفظوں کے طلسم سے بھی مشکل پسندی آگئی ہے۔ خود غالبؔ کو بھی اپنی دشوار پسندی کا بخوبی احساس تھا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے — خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ — بہ رنگِ خار مرے آئنے سے جوہر کھینچ

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ
بہ رنگِ خار مرے آئنے سے جوہر کھینچ

﴿ب﴾ انفرادیت: غالبؔ کی غزل گوئی کا اصل جوہر انفرادیت ہے۔ ان کا اندازِ بیان بہت مختلف ہے۔ انہوں نے قدیم شعری روایات کو من و عن قبول نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنی پسند و ناپسند کا خیال رکھا۔ جو چیزیں انہیں پسند تھیں ان کو قبول کیا اور جو ناپسند تھیں انہیں یکسر نظر انداز کر دیا اور اپنا الگ راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے حیات و کائنات کے اسرار و رُموز کو اپنے طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ غالبؔ کے شاگردِ خاص الطاف حسین حالیؔ نے بھی اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ انہوں نے عام روش پر چلنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ ان کی شاعرانہ عظمت کی عمارت جدّت طرازی پر ہی تعمیر ہوتی ہے جسے کسی نے مخصوص طرزِ ادا، کسی نے ادائے خاص تو کسی نے جدّتِ بیان اور طرفگیِ ادا وغیرہ سے تعبیر کیا ہے۔ شاعری کے تمام لوازمات مثلاً تشبیہات، استعارات، کنایات، تراکیب، زبان و بیان اور مکالمات وغیرہ کو غالبؔ نے بڑے سلیقے سے شاعری میں برتا ہے۔ انہوں نے معمولی خیال کو بھی اپنی جدت طرازی کی بدولت پر لطف بنا دیا ہے۔ ان کا اچھوتا اندازمحسوس کیجیے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا — صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

نئے الفاظ، نئی ترکیبیں، نئی بندشیں، نئی تشبیہات اور نئے استعارات وکنایات کو بھی انہوں نے وضع کیا جس سے ان کی شاعری تہ دار ہوگئی۔ الفاظ سازی کے فن میں بھی انہیں قدرت حاصل تھی۔ اس انفرادیت اور جدت طرازی کے شوق نے انہیں با کمال شاعر بنادیا۔

﴿ج﴾ ظرافت: غالبؔ کی شاعری کا ایک وصفِ خاص ظرافت ہے۔ ظرافت ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی تبھی انہیں 'حیوانِ ناطق' کے بجائے 'حیوانِ ظریف' کہا گیا۔ وہ چوں کہ ایک بذلہ سنج انسان تھے اس لئے انہوں نے اپنی شاعری میں طنز و مزاح اور شوخی وظرافت کو بڑی ذہانت وفطانت سے پیش کیا۔ ان کی ظرافت میں جو پاکیزگی ہے وہ سب کو متاثر کرتی ہے۔ سوداؔ اور انشاؔ کی طرح غالبؔ اپنی ظرافت ہجو گوئی میں صرف نہیں کرتے بلکہ سنجیدگی اور متانت کو برقرار رکھتے ہوئے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ظرافت، مزاح اور طنز وشوخی کی الگ الگ نشان دہی کی جاسکتی ہے جس سے شاعر کی ذہانت، پروازِ تخیل اور رسائی ذہن کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ظرافت دیکھیے:

دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ

مزاح ملاحظہ فرمائیے:

اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

شوخی کی مثال دیکھیے:

وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالبؔ نہ صرف دوسروں پر ہنستے ہیں بلکہ خود اپنا بھی مذاق اُڑاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایسی بہت سی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں جن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ صرف ایک شعر ملاحظہ فرمائیے:

چاہتے ہیں خُوب رُویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

﴿د﴾ رمزیہ اندازِ بیان: غالبؔ کی شاعری کی ایک خصوصیت رمزیہ اندازِ بیان ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو غالبؔ کی غزل گوئی کا ایک کمال ان کے رمزیہ اندازِ بیان میں چھپا ہوا ہے۔ جس کا اعتراف ہمارے بہت سے صفِ اوّل کے ناقدین نے کیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ڈاکٹر عبادت بریلوی جیسے قدآور ناقدین نے غالبؔ کی شاعری میں رمزیت اور ایمائیت کی نشان دہی کی ہے۔ اگر غزل رمزیت اور ایمائیت سے خالی ہو تو معنوی تہ داری اور فکری بلندی کبھی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ غالبؔ کو اس بات کا احساس تھا اسی لئے انہوں نے اپنے کلام میں رمز و کنایہ سے خوب کام لیا۔ اس وصف سے ان کی شاعری میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ رمز و ایما کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

موت کا ایک دن معیّن ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

﴿ہ﴾ ایجاز و اختصار: غالبؔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کے ہنر سے خوب واقف ہیں۔ ان کی شاعری میں ایجاز و اختصار کی خوبیاں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ وہ دوسروں کی طرح اشعار میں طول کلامی سے پرہیز کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بہت کم الفاظ میں معنی کی ایک دنیا آباد ہے۔ غالبؔ کو اس بات کا احساس تھا تبھی وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے

جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

غالبؔ اپنے اشعار میں بہت ہنر مندی سے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس سے ایجاز و اختصار کی خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ اشعار:

کیوں کر اُس بت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم! میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

﴿و﴾ تہ داری: غالب کی غزل گوئی کی ایک نمایاں خصوصیت تہ داری ہے۔ یہ بھی غالبؔ کا کرشمہ ہے کہ ان کے ایک ہی شعر میں معنی کی کئی تہیں مل جاتی ہیں۔ ان کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں بظاہر تو ایک معنی نظر آتا ہے لیکن جب ان پر غور کیا جاتا ہے تو دوسرے دل چسپ اور لطیف معنی بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کا ایک مقبول شعر ہے:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر کا ایک معنی یہ ہوا کہ دشت کی ویرانی دیکھ کر شاعر کو اپنا گھر یاد آیا کہ اس کا گھر بھی ایسا ہی ویران تھا۔ دوسرا معنی یہ ہوا کہ عشق کی وجہ سے شاعر کو دشت کی خاک چھاننی پڑی یعنی عشق نے دشت پیمائی کرائی اور اسے یہ ویرانی دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ آخر اس نے عشق کیا ہی کیوں، نہ وہ عشق کرتا اور نہ اسے گھر چھوڑ کر ویرانے میں آنا پڑتا۔ جب کہ اس کا تیسرا معنی استفہامیہ اندازِ بیان سے واضح ہوتا ہے یعنی دشت کی ویرانی بھی کوئی ویرانی ہے۔ اس سے زیادہ ویرانی تو اس کے گھر میں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر ویرانی ہی دیکھنی ہو تو اس کے گھر کی ویرانی کو دیکھو۔ غالبؔ کے دیوان میں ایسے بے شمار اشعار موجود ہیں جن سے ایسی تہ داری ظاہر ہوتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

ترے سر و قامت سے اک قدِ آدم قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

﴿ز﴾ دل نشینی: جذبے اور تخیل کی آمیزش سے کلامِ غالبؔ میں غیر معمولی دل کشی اور دل نشینی پیدا ہو جاتی ہے۔ حکیمانہ تفکر اور شاعرانہ تخیل کی خوبیاں ایک ساتھ یکجا کر کے اشعار میں گہرائی اور معنویت پیدا کرنے کا ہنر غالبؔ کو خوب آتا ہے۔ تفکر میں تغزل کے فقدان سے اور تخیل میں شعریت کی کمی سے اشعار میں دل نشینی اور دل کشی کا لطف آ ہی نہیں سکتا۔ لیکن غالبؔ ان خوبیوں سے خوب واقف ہیں۔ چند اشعار:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ہے تجلی تری سامانِ وجود — ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

﴿ح﴾ **حقائق نگاری:** غالبؔ کی شاعری کی ایک خصوصیت حقائق نگاری بھی ہے۔ غالبؔ کو انسانی فطرت کا گہرا مشاہدہ ہے۔ اس لئے انہوں نے انسان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات وحادثات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر شخص کو غالبؔ کے کلام میں اپنی آپ بیتی نظر آتی ہے۔ حقائق نگاری کی اس خوبی کے سبب ہی کلامِ غالبؔ کو بہت زیادہ حوالے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ تحریر اور تقریر میں غالبؔ کے جتنے اشعار حوالوں میں استعمال کیے جاتے ہیں اتنا شاید ہی کسی اور شاعر کے اشعار۔ یہ حقیقت ہے کہ غالبؔ کے اشعار سے لوگوں کو اپنے جذبات و خیالات کے اظہار میں زیادہ مدد ملتی ہے۔ چند مثالیں دیکھیں:

نکلنا خُلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن — بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

﴿ط﴾ **انانیت:** ہمارے بہت سے نقادوں نے غالبؔ کو انا کا محافظ بھی کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالبؔ کی شاعری میں انا کا پہلو غالب ہے۔ بہت سے فن کار ایسے ہوتے ہیں جو حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور انہیں زندگی جس شکل میں ملتی ہے وہ اسی طرح اسے گوارا کر لیتے ہیں لیکن غالبؔ کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ انہوں نے ہزار مشکلوں کے باوجود خود کو برتر ہی محسوس کیا۔ حالات سے آنکھیں ملائیں اور دنیا کو اپنے طور پر محسوس کیا اور اسے شعری قالب میں ڈھالا۔ ان کے بہت سے اشعار میں خودستائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ غالبؔ کو نثر و نظم دونوں میں کمال حاصل تھا شاید اسی لئے انہوں نے کسی کو اپنا ہم سر نہیں سمجھا۔ چند مثالیں دیکھیں:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیے — ہے زباں میری تیغِ جوہردار

﴿ی﴾ **فلسفہ:** غالبؔ کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ انہوں نے اردو غزل میں فلسفیانہ مسائل کا اظہار کیا۔ وہ فلسفی تو نہیں تھے لیکن ان کا مزاج فلسفیانہ ضرور تھا۔ اسی لئے وہ اپنی شاعری میں ہر جگہ کچھ نہ کچھ سوال کرتے ہیں اور ان کا یہ عمل ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ غالبؔ نے تفکر کو تغزّل کے سانچے میں ڈھال کر اردو غزل کو جو نئی راہ دکھائی وہ ان کے فلسفیانہ مزاج کی بدولت ہی ممکن ہو سکا۔ اس اعتبار سے غالبؔ کو فلسفی شاعر بھی کہنا غلط نہ ہوگا۔ چند اشعار بطورِ مثال دیکھیں:

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ؟ ہوا کیا ہے؟

﴿ک﴾ **حسن وعشق:** غالبؔ کی غزل گوئی کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے عشق ومحبت کی مختلف کیفیات اور پہلوؤں کو بڑی خوش اُسلوبی سے پیش کیا ہے۔انہوں نے عشق کے جذبات وخیالات اور معشوق کی حالت کو بہت گہرائی سے محسوس کیا اور اسے نظم کیا۔ حُسن وعشق کی جتنی بھی کیفیات ہوسکتی ہیں وہ سب غالبؔ کے یہاں نظر آتی ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ غالبؔ کی شاعری عشق ومحبت کی کیفیات کا ایک نگارخانہ ہے جو ہم سب کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔مثلاً چند اشعار دیکھیں:

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ   ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
کہتے ہو نہ دیں گے ہم ، دل اگر پڑا پایا   دل کہاں کہ گم کیجیے ، ہم نے مدعا پایا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا   اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا

﴿ل﴾ **استفہامیہ اندازِ بیان:** غالبؔ کے کلام میں استفہامیہ اندازِ بیان بھی خوب ملتا ہے۔اس نوع کے اندازِ بیان سے ان کی غزلوں میں دل کشی اور رعنائی نیز موضوعات میں رنگارنگی پیدا ہوجاتی ہے۔اشعار میں سوالیہ طرزِ ادا کو بڑی خوب صورتی سے غالبؔ نے پیش کیا ہے جس سے تہ داری واضح ہوتی ہے۔ایک دو شعر دیکھیں:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے   تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا ، کوئی غمگسار ہوتا

مذکورہ شاعرانہ خصوصیات کے علاوہ بھی کلامِ غالبؔ میں بہت سی خوبیاں موجود ہیں۔سہلِ ممتنع،تجنیس،روزمرّہ،لطفِ زبان،حُسنِ تقابل، استدلالی اندازِ بیان اور سوز وگداز وغیرہ کی مثالیں بھی غالبؔ کے یہاں بھری پڑی ہیں۔ غالبؔ کو آئینہ، جوہرِ آئینہ، رنگ، موجِ سیلاب، وجود، ہستی، برق اور وجود جیسے الفاظ بہت پسند تھے۔اس لئے انہوں نے اس قسم کے اپنے محبوب الفاظ کو اپنی شاعری میں بار بار استعمال کیا ہے۔

غالبؔ کی شاعری کے حوالے سے سب سے بڑی بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ مشکل پسندی اور سہلِ ممتنع کے درمیان جو لکیر ہے وہی اصل لکیر ہے جس سے غالبؔ کی شناخت قائم ہوتی ہے۔حُسن وعشق، واردات، محاکات کی شاعری ہو یا فلسفیانہ مسائل، انانیت، ظرافت، حقائق نگاری یا رمزیہ شاعری ہو ہر جگہ غالبؔ اپنی فکری بالیدگی اور فنی پختگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔قافیہ اور ردیف کے دائرے میں رہ کر بھی انہوں نے کوئی جبر قبول کرنا پسند نہیں کیا۔یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو غزل کی تمام خصوصیات غالبؔ کی شاعری میں موجود ہیں اور غالبؔ کی بدولت ہی اردو شاعری معراج کو پہنچی ہے نیز غالبؔ جیسے شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ غالبؔ کی معرکہ آرائی کس شاعر کے ساتھ مشہور ہے؟
﴿۵﴾ غالبؔ کن ماہرینِ فن سے اپنے کلام پر مشورے لیتے تھے؟
﴿۶﴾ غالبؔ نے کن اردو اور فارسی شعرا کی تقلید کی؟

06.05 مرزا غالبؔ کی پہلی غزل

﴿۱﴾

﴿۱﴾ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وِصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے ، یہی انتظار ہوتا

﴿۲﴾ ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان، جُھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

﴿۳﴾ یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا ، کوئی غم گسار ہوتا

﴿۴﴾ ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا ، نہ کہیں مزار ہوتا

﴿۵﴾ یہ مسائلِ تصوف ، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

06.06 مرزا غالبؔ کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ یہ غزل غالبؔ کی مقبول ترین غزلوں میں سے ایک ہے جو ان کی شعری بصیرت کو پوری طرح عیاں کرتی ہے۔اس غزل سے غالبؔ کا منفرد اندازِ بیان بھی نمایاں ہوتا ہے۔ان کی اس غزل میں اندازِ بیان کی جو ندرت، معنی آفرینی، جدّت اور انوکھا پن ہے وہ محسوس کرنے کی چیز ہے۔غالبؔ نے اپنی اس غزل میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان کی حیثیت گنجینۂ معنی کے طلسم سے کچھ کم نہیں۔غزل میں وصلِ یار کا انتظار کرنے اور معشوق کو عہد شکنی کے الزام سے بچا کر دل کو تسلی دینے کی بات اپنی معنی خیزی کو واضح کرتی ہے۔معشوق کے تیرِ نیم کش کی تعریف بھی بہت عمدہ انداز ہ میں کی گئی ہے اور دردِ عشق کا علاج وصلِ محبوب بتا کر شاعر نے دوست ناصح کا فرض نبھایا ہے۔زندگی میں عشق کی بدولت رُسوائی اور مرنے کے بعد بھی جگ ہنسائی کا سبب عشق ہے۔اس خیال کو غالبؔ نے بہت ہی خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔تصوّف کے دقیق مسائل کو بھی بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔مجموعی اعتبار سے یہ غزل عشق، رُسوائی، تیرِ نیم کش کی تعریف، انتظار کا لطف یا معشوق کے وعدۂ وصل اور مسائلِ تصوّف سے عبارت ہے۔غزل کے یہ وہ موضوعات ہیں جنہیں غالبؔ نے بڑی سنجیدگی اور تفکر آمیز لہجے میں بیان کیا ہے۔جو خاص انہی کا حصہ ہے۔ان کے شعری اظہار کا رویہ اس ایک غزل سے بھی واضح ہو جاتا ہے اور یہی اس غزل کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

غزل کی تشریح:۔

شعراوّل: ہماری قسمت میں وصالِ یار سے لطف اندوز ہونا نہیں لکھا تھا۔اس لئے اگر فراق کی حالت میں ہی موت ہوگئی تو اچھا ہوا کیوں کہ اگر اور زندہ رہتے تو یار کے انتظار کے کرب سے ہی گزرنا پڑتا۔یعنی اچھا ہی ہوا کہ ہم مرگئے اور وصالِ یار کے انتظار کی تکلیف سے نجات پاگئے۔

دوسراشعر: شاعر کہتا ہے کہ اگر ہم اپنے محبوب کے وعدۂ وصل کے بعد بھی زندہ رہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں محبوب کے وعدے پر اعتبار نہیں رہا کیوں کہ اگر اعتبار ہوتا تو خوشی سے مرجانا یقینی تھا۔یعنی وعدۂ وصل کے باوجود اگر عاشق زندہ ہے تو کہا جائے گا کہ اسے اعتبارِ وعدہ نہیں رہا ورنہ وہ محبوب سے ملنے کی خوشی میں کب کا مرگیا ہوتا۔

تیسراشعر: شاعر کہتا ہے کہ عشق میں دوست چارہ سازی اور غم گساری کے بجائے نصیحت آمیز باتیں کرتے ہیں تو دل دکھتا ہے۔ دوستی کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ وہ ترکِ محبت کا مشورہ دیں اور دکھ کا کوئی مداوا نہ کریں۔دوست وہ ہوتے ہیں جو وصالِ یار کی تدبیریں نکالتے ہیں نہ کہ نصیحت پر نصیحت کرتے ہیں۔

چوتھاشعر: شاعر کہتا ہے کہ زندگی میں تو عشق کی وجہ سے ہم بدنام تھے ہی،مرنے کے بعد بھی خوب رسوائی ہوئی کیوں کہ ہمارا جنازہ بھی اُٹھایا گیا اور مزار بھی بنایا گیا اور رسوائی کے سامان میں بھی کوئی کمی نہیں کی گئی۔اگر ہم دریا میں غرق ہوجاتے تو ہماری موت کی خبر کسی کو نہیں ہوتی۔نہ ہمارا جنازہ اُٹھتا اور نہ ہی کہیں پر مزار بنتا۔

پانچواں شعر: اے غالبؔ تو نے تصوّف کے مسائل کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے ہمارے ذہن و دل کے دروازے کھل جاتے ہیں۔چنانچہ اگر تو بادہ خوار نہ ہوتا تو ہم لوگ تجھے ولی سمجھتے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ غالبؔ کی پہلی غزل کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟

﴿۸﴾ ’’چارہ ساز‘‘ کسے کہتے ہیں؟

06.07 مرزاغالبؔ کی دوسری غزل

﴿ا﴾

﴿ا﴾ مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

﴿۲﴾ پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

﴿۳﴾ چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

﴿۴﴾ جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

﴿۵﴾ غالبؔ! ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

06.08 مرزا غالبؔ کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ غالبؔ کی یہ غزل بھی بے حد مقبول ہے۔شاعر نے بڑی سادگی اور انکسار کے ساتھ دل کی آرزو کو بیان کر دیا ہے۔اس غزل کے رنگ و آہنگ سے غالبؔ کی شناخت ہوتی ہے۔ان کا لہجہ اس غزل سے پوری طرح عیاں ہوتا ہے۔اس غزل میں تشبیہ اور استعارے کا استعمال بھی بڑی خوب صورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔جوشِ قدح کو چراغاں سے تشبیہ دے کر شاعر نے مطلع کو تہ دار بنا دیا ہے۔نیز اس غزل میں عشق کرنے کی آرزو، محبوب کے ساتھ شراب پینے کی یاد، محبوب کے تصوّر میں ہمیشہ کھوئے رہنے اور رو رو کر طوفان برپا کرنے کی بات ٹھان لینے کے خیال کو بھی بڑی خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔شاعر کی یہ بھی خواہش ہے کہ اس کا محبوب اپنی آنکھوں میں سرمہ لگا کر اس کے سامنے بیٹھے تا کہ اسے لذت ملے۔کیا ہی اچھوتی خواہش ہے۔مرزا غالبؔ نے عشق کی مختلف کیفیات کو شعری جامہ پہنا کر بڑی شاعری کا نمونہ پیش کیا ہے۔

غزل کی تشریح:۔

شعر اوّل: شاعر کہتا ہے کہ محبوب کو گھر بلائے ہوئے مدت گزر گئی۔جب کبھی وہ گھر آتا تھا تو اس کی آمد سے دَر و دیوار روشن ہو جاتے تھے۔ہم اس کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتے تھے مگر اب تو زمانہ گزر گیا ہے کہ وہ مہمان نہیں آیا اور اس کے نہ آنے کے سبب ہی ہم نے ساغر سے بزم کو روشن نہیں کیا۔مطلب یہ کہ یار آئے تو پھر بزم کو جوشِ قدح سے چراغاں کروں۔شاعر نے جوشِ قدح کو چراغاں سے تشبیہ دی ہے اور یہی اس شعر کی خوبی بھی ہے۔

دوسرا شعر: اس شعر میں شاعر معشوق کا طلب گار ہے۔شاعر نے اپنی عقل و دل و جان کی دولت کو پھر سے سجایا ہے تا کہ کوئی خریدار (معشوق) آئے اور ان چیزوں کو خرید کر اپنے ساتھ لے جائے۔یعنی عشق کو پھر کسی خریدار کی ضرورت ہے۔مطلب یہ کہ غالبؔ پھر کسی معشوق کو اپنا دل دینا چاہتے ہیں۔اس شعر کا بنیادی تصوّر آرزوئے عشق ہے۔

تیسرا شعر: شاعر اس بات کا خواہش مند ہے کہ اس کا معشوق اس کے سامنے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگا کر بیٹھے تا کہ اس کی پلکوں سے اس کا دل زخمی ہو جائے۔ یعنی شاعر سرگیں چشمِ معشوق سے اپنے دل کو زخمی ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ شاعر کی آرزو بہت دل کش ہے جس سے کوئی بھی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

چوتھا شعر: شاعر کہتا ہے کہ کاش! ایسی فرصت مل جائے کہ رات دن وہ تصوّرِ جاناں ہی میں غرق رہے۔ اس سے پہلے شاعر کو کبھی ایسی فرصت ملی تھی جب وہ رات دن معشوق کے زلف و رُخ کے تصور میں رہتا تھا۔ ایک بار پھر وہ اسی فرصت کا متمنی ہے۔ تصوّرِ جاناں میں غرق رہنے کی آرزو ایک عجیب کیفیت کو ظاہر کرتی ہے۔

پانچواں شعر: غالبؔ کو مت چھیڑ! ورنہ طوفانِ اشک برپا ہو جائے گا۔ شاعر نے پہلے ہی سے جوشِ اشک سے طوفان برپا کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ اسے مت چھیڑ! کیوں کہ وہ رونے پر تلا ہوا ہے اور اگر رویا تو طوفان برپا ہو جائے گا۔ یعنی رو رو کر طوفان برپا کرنے کے ارادے کو غالبؔ نے نہایت عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۹﴾ غالبؔ نے اس غزل کے مطلع کو کس طرح تہ دار بنایا ہے؟

﴿۱۰﴾ پانچویں شعر میں شاعر کس خواہش کا اظہار کرتا ہے؟

06.09 خلاصہ

مرزا غالبؔ ۲۷؍دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ پانچ برس کے ہی تھے کہ ان کے والد ایک جنگ میں مارے گئے۔ پھر ان کی پرورش ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے کی۔ انہیں انگریزی حکومت سے وظیفہ بھی ملا۔ تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ غالبؔ اعتدال پسند تھے۔ وہ زندگی بھر مالی مشکلات میں گھرے رہے۔ اپنی مالی حالت بہتر بنانے کے مقصد سے انہوں نے دُور دراز کا سفر بھی کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں دہلی میں تباہی مچی تو ان کا مال و اسباب بھی لٹ گیا۔ دہلی کی تباہی کا غم انہیں زندگی بھر رہا۔ ۱۵؍فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ فارسی اور اردو میں ان کی بیش بہا کتابیں موجود ہیں۔ ان کی زندگی میں صرف اردو دیوان ہی پانچ بار چھپا اور ان کے انتقال کے بعد اردو دیوان کے کئی قابلِ تحسین ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔

اس اکائی میں مرزا غالبؔ کی غزلیہ شاعری کی متعدد اہم خصوصیات پر بھی گفتگو کی گئی ہے جن میں مشکل گوئی، انفرادیت، ظرافت، رمزیہ اندازِ بیان، ایجاز و اختصار، تہ داری، دل نشینی، حقائق نگاری، انانیت، فلسفۂ حُسن و عشق اور استفہامیہ اندازِ بیان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ غالبؔ کی شاعری کے مختلف ادوار کا ذکر بھی اس اکائی میں کیا گیا ہے۔ ان کی نثری اور شعری تصنیفات سے متعلق مزید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس اکائی میں غالبؔ کے شعری امتیازات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ غالبؔ کے محبوب الفاظ کی نشان دہی بھی کی گئی ہے تا کہ ان کی انفرادیت واضح ہو سکے۔ غالبؔ نے نئے الفاظ، نئی ترکیبیں، نئی بندشیں، نئی تشبیہات و استعارات اور کنایات کو وضع کر کے اردو غزل کو ایک نیا جہانِ معنی عطا کیا۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اکائی میں غالبؔ کی مختصر سوانحِ حیات کا مطالعہ کیا گیا۔ اکائی میں غالبؔ کی دو مقبول غزلیں بطورِ نمونہ پیش کی گئیں اور اُن غزلوں کے اشعار کی تشریحات بھی پیش کی گئیں نیز اُن کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا۔

06.10 فرہنگ

اثناعشری	:	شیعہ،امامیہ	صیقل	:	دھار،چمک،آب
استفہام	:	سوال کی علامت، دریافت کرنا	طلسم	:	جادو،منتر،ٹونا
بازیچہ	:	بچوں کا کھیل تماشہ	عشوہ	:	نازفریب،ادائے معشوقانہ،کرشمہ
تتبع	:	تقلید، پیروی	غمزہ	:	اشارہ،ناز نخرہ
تیرِ نیم کش	:	آدھی کمان کھینچ کر چھوڑا ہوا تیر	فسون	:	جادو،ٹونا منتر
جامِ سفال	:	مٹی کا پیالہ	قماربازی	:	جُوا کھیلنا،جُوا
جوشِ قدح	:	شراب کا پیالہ	قنوطیت	:	ناامیدی، یاسیت
چارہ ساز	:	علاج کرنے والا	قولنج	:	وہ درد جو پسلی کے نیچے ہوتا ہے
چراغاں	:	روشنی، دیپ مالا	گنجینۂ معنی	:	معنی کا خزینہ
حیوانِ ظریف	:	بزلہ سنج،خوش طبع	متمول	:	دولت مند، مال دار
حیوانِ ناطق	:	آدمی،انسان	مژگاں	:	مژہ کی جمع، پلکیں
خلش	:	چبھن	مدعا	:	مقصد،غرض
خودستائی	:	اپنی تعریف آپ	مے نوش	:	شرابی، بادہ خوار
دشنہ	:	خنجر، کٹاری	نخشب	:	کنویں سے نکالا گیا چاند
رزم	:	لڑائی، جنگ	نشاط	:	خوشی،شادمانی
زود پشیماں	:	جلد شرمندہ ہونے والا، جلد پچھتانے والا	نیم واچشم	:	ادھ کھلی آنکھ
ساغرِ جم	:	جمشید کا پیالہ			

06.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰۔۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : مرزا غالبؔ کی تعلیم کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

سوال نمبر۲ : مرزا غالبؔ کی مالی دشواریوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

سوال نمبر۳ : مرزا غالبؔ کی ولادت اور خاندان کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰۔۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : مرزا غالبؔ کی سوانح حیات پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : مرزا غالبؔ کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ : مرزا غالبؔ کی کسی ایک غزل کے پانچ اشعار لکھ کر اُن کی تشریح کیجیے۔

06.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ دیوانِ غالب	از	اسداللہ خاں غالبؔ
۲۔ ذکرغالبؔ	از	مالک رام
۳۔ شرحِ دیوانِ غالب	از	یوسف سلیم چشتی
۴۔ یادگارغالب	از	الطاف حسین حالیؔ

06.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ مرزا غالبؔ ۲۷/دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۵/فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں ان کی وفات ہوئی۔

﴿۲﴾ غالبؔ کا اردو دیوان اُن کی زندگی میں پانچ بار چھپا۔

﴿۳﴾ غالبؔ کی وفات کے بعد ان کے اردو دیوان کے کئی ایڈیشن چھپے جن میں نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ عرشی، گُلِ رعنا، مرقعِ چغتائی، نقشِ چغتائی، دیوانِ مصور از صادقین اور نسخۂ عرشی زادہ قابلِ ذکر ہیں۔

﴿۴﴾ ذوقؔ کے ساتھ۔

﴿۵﴾ مولانا فضلِ حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہؔ سے مشورے لیتے تھے۔

﴿۶﴾ غالب نے اردو میں ناسخؔ کی اور فارسی میں بیدلؔ، ظہوریؔ، عرفیؔ اور نظیریؔ وغیرہ کی تقلید کی۔

﴿۷﴾ اندازِ بیان کی ندرت، شعری بصیرت اور معنی آفرینی وغیرہ اہم خصوصیات ہیں۔

﴿۸﴾ معالج، ڈاکٹر، طبیب، حکیم یا مدد کرنے والے کو۔

﴿۹﴾ غالبؔ نے جوشِ قدح کو چراغاں سے تشبیہ دے کر اس مطلع کو تہ دار بنا دیا ہے۔

﴿۱۰﴾ پانچویں شعر میں شاعر فرصت کے لئے ایسے اوقات کی تمنا کرتا ہے جب وہ رات دن تصوّرِ جاناں میں ڈوبا رہے۔

✵

بلاک نمبر 03

اکائی 07 آرزوؔلکھنوی

اکائی 08 حسرتؔموہانی

اکائی 09 عزیزؔلکھنوی

اکائی 07 : آرزوؔ لکھنوی

ساخت

07.01 : اغراض ومقاصد

07.02 : تمہید

07.03 : آرزوؔ لکھنوی کے حالاتِ زندگی

07.04 : آرزوؔ لکھنوی کی شاعرانہ خصوصیات

07.05 : آرزوؔ لکھنوی کی پہلی غزل

07.06 : آرزوؔ لکھنوی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

07.07 : آرزوؔ لکھنوی کی دوسری غزل

07.08 : آرزوؔ لکھنوی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

07.09 : خلاصہ

07.10 : فرہنگ

07.11 : نمونہ امتحانی سوالات

07.12 : حوالہ جاتی کتب

07.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

07.01 اغراض ومقاصد

اردو شاعری کی تاریخ میں دبستانِ لکھنؤ کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔شاعری کی تمام اصناف میں اس دبستان نے اُردو زبان کی جوگراں قدر خدمات انجام دی ہیں، اس کا اعتراف تمام اہلِ اردو کرتے ہیں۔آرزوؔ لکھنوی کا تعلّق اسی لکھنوی دبستان سے ہے۔اس اکائی کا مقصد آپ کو آرزوؔ لکھنوی کے حالاتِ زندگی، شخصیت اور شاعری میں ان کی انفرادیت سے متعارف کرانا ہے۔ساتھ ہی ساتھ فنِ عروض، قواعد اور اصلاحِ زبان سے متعلق آرزوؔ کی خدمات سے بھی واقف کرانا ہے۔

07.02 تمہید

اردو شاعری کی ابتدا سے دورِ حاضر تک غزل ہمیشہ شاعروں کی پسندیدہ صنف رہی ہے۔ترقّی پسند تحریک کے دور میں کئی ادیبوں نے غزل کی گردن زدنی کا اعلان کیا۔لیکن اس دور میں بھی اصغرؔ گونڈوی، فانیؔ بدایونی، حسرتؔ موہانی اور جگرؔ مرادآبادی وغیرہ نے یہ ثابت کر دیا کہ غزل ہمیشہ وقت کے ساتھ رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ غزل ہمیشہ سے اردو کی تمام اصنافِ شاعری میں سب سے زیادہ مقبول صنف رہی ہے۔

شاید غزل کے اسی کس بل کو دیکھتے ہوئے اسے اردو شاعری کی آبرو کہا گیا ہے۔ اردو شاعری کی اسی مقبول ترین صنف کو حضرتِ آرزؔو نے اپنی طبع آزمائی کے لئے منتخب کیا۔ ویسے تو انہوں نے طبع رسا کا جوہر دکھانے کے لئے قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مرثیہ اور سلام بھی بہ کثرت کہے ہیں جن کو دیکھنے سے ان کی پُرگوئی اور زبان پر بے پناہ قدرت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن جو چیز ان کی ناموری کا سبب بنی وہ غزل ہی ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد امید ہے کہ آپ آرزؔو کی حیات، شاعری اور ان کی خدمات سے واقف ہو جائیں گے۔

07.03 آرزؔو لکھنوی کے حالاتِ زندگی

آرزؔو کا نام سیّد انوار حسین اور عرفیت منجھو صاحب ہے۔ ان کی ولادت ۱۸۷۲ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے والد میر ذاکر حسین یاسؔ لکھنوی بھی شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کی ولادت پر مادّۂ تاریخ یوں رقم کیا:

بارِ دیگر شکر کردم از زبان

پانچ سال کی عمر سے سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں حکیم میر قاسم علی صاحب سے پڑھیں۔ اس کے بعد جو کچھ تعلیم حاصل کی وہ مولانا سیّد آقا حسین صاحب سے حاصل کی۔ علمِ عروض حکیم میر ضامن علی جلالؔ لکھنوی سے سیکھا اور انہی سے اصلاحِ سخن بھی لی۔ چوں کہ گھر میں شعر وشاعری کا ماحول تھا یعنی والد اور بڑے بھائی میر یوسف حسین قیاسؔ لکھنوی شاعر تھے۔ لہٰذا سیّد انوار حسین آرزؔو لکھنوی نے بارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ استاد کی توجّہ اور محنت سے لکھنؤ کے باکمال شاعروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ تھوڑے ہی عرصے میں انہیں شاعری میں اتنی مہارت حاصل ہوگئی کہ استاد نے اپنے دوسرے شاگردوں کو اُنہی کے پاس بھیج دیا۔ جلالؔ لکھنوی کی وفات کے بعد آرزؔو کو ان کی گدّی ملی۔

آرزؔو نے تقریباً پندرہ برس کی عمر میں اپنی پہلی غزل نواب منجھلے آقا صاحب معیںؔ کے مشاعرے میں پڑھی۔ یہ مشاعرہ طرحی تھا اور طرح تھی: ''انجمن میں نہیں، چمن میں نہیں''۔ آرزؔو لکھنوی کی غزل کا مطلع تھا:

ہمارا ذِکر جو ظالم کی انجمن میں نہیں
جبھی تو درد کا پہلو کسی سخن میں نہیں

ایک اور شعر یوں تھا کہ:

شہیدِ ناز کی محشر میں دے گواہی کون
کوئی لہو کا بھی دھبّا مرے کفن میں نہیں

ان اشعار سے شاعر کی طبعِ رسا کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے جو پندرہ برس کے سن میں اس بلند پایہ تخیّل کا شعر کہہ رہا ہو۔ کم سنی میں اس طرح کی زبان و بیان، لطف اور نکھرا ہوا شعری ذوق دیکھ کر اہلِ زبان واہ واہ کہہ اٹھے۔ پھر کیا تھا، آرزؔو کا چرچا ہونے لگا اور ان کی مشق نے آگے آنے والے دنوں میں یہ ثابت کر دیا کہ یہ بچّہ ایک ہونہار طالبِ علم ہے۔ آرزؔو کے زمانے میں لکھنؤ آج کا لکھنؤ نہیں تھا۔ اس زمانے میں لوگ جب کسی ہونہار بچّے کو جان لیتے تھے تو اس کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ تاکہ بچّہ اپنی مشق جاری رکھے اور آگے چل کر نام پیدا کرے۔ ایسے ہی ایک بزرگ میرن صاحب تھے جنہوں نے آرزؔو کو یہ مصرع دیا:

''اُڑ گئی سونے کی چڑیا، رہ گئے پَر ہاتھ میں''

مصرع دے کر بزرگوار نے کہا کہ صاحب زادے! تم اس پر ایک سال میں مصرع لگا دو تو میں تمھیں شاعر مان لوں گا۔ انہوں نے کہا میں ابھی کوشش کر کے دیکھتا ہوں کیوں کہ ایک سال زندہ رہنے کا کیا اعتبار ہے۔ یہاں تو ایک سانس کے بعد دوسری کا بھروسہ نہیں۔ تھوڑی دیر کے غور وفکر کے بعد اس پر یہ مصرع لگا دیا کہ:

دامن اُس یوسف کا آیا پرزے ہو کر ہاتھ میں
''اڑ گئی سونے کی چڑیا، رہ گئے پَر ہاتھ میں''

ان اشعار کو دیکھ کر آرزوؔ کی موزونیِ طبع کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ شروع شروع میں اپنے استاد کی شاعری کا رنگ اختیار کیا۔ یہ ان کی شاعری کا دورِ اوّل ہے جس میں جذبات کا دریا بے اختیار ہو کر بہتا چلا جاتا ہے۔ آرزوؔ کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے لکھنؤ کی زبان کو سنوارنے کا کام کیا۔ انہوں نے زبان و قوعد اور عروض پر کافی کام کیا اور اس سلسلے میں ان کا رسالہ ''نظامِ اردو'' ایک اہم تصنیف سمجھا جاتا ہے۔

آرزوؔ لکھنوی اردو کے ان چند باکمال شعرا میں سے ہیں جن کا قلم نثر کے میدان میں بھی بڑی روانی سے چلتا ہے۔ چنانچہ کئی قابلِ قدر ڈرامے مثلاً ''متوالی جوگن''، ''دل جلی بیراگن'' اور ''شرارۂ حسن'' وغیرہ ان کی نثری تصنیفات ہیں۔ انہوں نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی پہچان ان کی غزلوں سے ہی ہے۔ ان کی شاعری کے چار مجموعے ''فغانِ آرزوؔ''، ''جہانِ آرزوؔ''، ''بیانِ آرزوؔ'' اور ''سریلی بانسری'' شائع ہوئے ہیں۔ زبان و بیان پر ایسی قدرت تھی کہ ان کا کچھ کلام ایسا بھی ہے جس میں فارسی و عربی کا ایک لفظ بھی شامل نہیں ہے۔

گاندھی جی اسی زمانے میں ہندوستانی زبان کے فروغ کی کوششیں کر رہے تھے۔ لہٰذا آرزوؔ نے ہندوستانی میں بھی اپنی دھاک جمائی۔ ممبئی اور کولکاتہ کے تھیٹروں کے لئے ڈرامے لکھے اور فلموں کے لئے نغمہ نگاری بھی کی۔ جہاں ہندوستانی کو خاص طور پر پسند کیا جاتا ہے۔ ان کی اس رنگ کی شاعری کو ''سریلی بانسری'' میں دیکھا جا سکتا ہے کہ آسان زبان میں لکھنے کے باوجود وہ اپنے خیالات و جذبات کا اظہار بڑے سلیقے سے کر لیتے تھے۔ لکھنوی زبان کے ماہر اس شاعر کا انتقال ۱۹۵۱ء میں کراچی میں ہوا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ آرزوؔ لکھنوی کا پورا نام کیا تھا؟

﴿۲﴾ آرزوؔ کے اس مجموعۂ کلام کا نام بتایئے جس میں خاص طور پر انہوں نے ہندوستانی میں شاعری کی؟

﴿۳﴾ آرزوؔ کے دو ڈراموں کے نام لکھیے؟

07.04 آرزوؔ لکھنوی کی شاعرانہ خصوصیات

آرزوؔ کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

﴿۱﴾ پہلا دور

پہلا دور جو کہ ابتدائی زمانہ ہے۔ اس میں حضرتِ جلالؔ لکھنوی کا اثر خاص طور پر نمایاں ہے۔ اس دور کی شاعری سے ان کی محنت شاقہ اور کثرتِ ریاض کا پتہ چلتا ہے۔ لہٰذا اس دور کا رنگ ذیل کے اشعار سے دیکھا جا سکتا ہے:

اُس دل سے خدا سمجھے جس نے ہمیں مارا ہے
جو دشمنِ جانی ہے وہ جان سے پیارا ہے
راحت ہو کہ بے چینی دونوں میں ہے اک لذّت
جو تم کو گوارا ہے وہ ہم کو گوارا ہے
خودکشی کا آپ پر الزام دھرتے جائیں گے
ہم تو مرتے ہیں مگر بدنام کرتے جائیں گے

☆☆☆☆☆

مجھ کو میری روش مٹاتی ہے پاؤں کی خاک سر پہ آتی ہے
چارہ گر سے چھپا رہا ہوں درد بات کی کد میں جان پڑتی ہے

☆☆☆☆☆

اپنے کیے کا رونا کیا ہے؟ رونے سے آخر ہونا کیا ہے؟
سنگِ در اُس کا، خاک گلی کی تکیہ کیا ہے؟ بچھونا کیا ہے؟
پھل نہیں اچھا عشق کا اے دل! ایسے شجر کا بونا کیا ہے؟

ان اشعار سے ان کے ابتدائی رنگ کی شاعری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آرزؔو کی لگن، مشقِ سخن اور عروض پر ان کی گرفت کو دیکھتے ہوئے استاد جلالؔ لکھنوی نے اپنے کچھ شاگردوں کو ان کے سپرد کر دیا کہ ان سے کلام کی اصلاح لیا کریں۔ یہیں سے آرزؔو کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ان کی شاعری میں پہلے کے مقابلے زیادہ تبدیلی رونما ہونے لگتی ہے اور شاعری پر میرؔ اور مومنؔ کا رنگ غالب آنے لگتا ہے۔

﴿۲﴾ دوسرا دَور

آرزؔو کی شاعری کا یہ وہ دور ہے جس میں ان کی شاعری میں سوز و گداز، رنج اور درد انگیزی کی فضا شروع ہوتی ہے۔ ان کی غزلوں میں متانت و سنجیدگی کے باوجود شوخیِ ادا اور چھیڑ چھاڑ کی ادا بھی پائی جاتی ہے۔ شگفتہ بحور، لفظوں کا موزوں انتخاب اور دل کش ترکیبوں کے ساتھ سوز و گداز کا عنصر کافی مؤثر ہو جاتا ہے۔ اس دور کی کیفیت کا اندازہ درج ذیل اشعار سے کیجیے:

پھر مرے زُہد کے ساماں پہ تباہی آئی
قصد توبہ کا کیا تھا کہ جماہی آئی
یوں آگ لگاتے پھرتے ہو کیوں، جب گرم ہوا سے ڈرتے ہو
دل پہلے جلا کر خاک کیا اب ٹھنڈی آہیں بھرتے ہو
جاتے کہاں ہیں آپ نظر دل سے موڑ کر

تصویر نکلی پڑتی ہے آئینہ توڑ کر
کیا جانے ٹپکے آنکھ سے کس وقت خونِ دل
آنسو گرا رہا ہوں جگہ چھوڑ چھوڑ کر
ہم آنکھیں کھولے بیٹھے تھے جب سارا عالم سوتا تھا
مانندِ چراغ اک سوختہ تن گہ ہنستا تھا گہ روتا تھا
پردہ اُٹھ کر گر گیا ، ہم پھر بھی ہیں محرومِ دید
آنکھ میں آنسو تھے کیوں کر آنکھ بھر کر دیکھتے
آرزؔو ہشیار تھے جو ہوش کھو بیٹھے کلیم
خیر آنکھوں کی نہ تھی گر آنکھ بھر کر دیکھتے

﴿۳﴾ تیسرا دَور

آرزؔو کی شاعری کا تیسرا دَور وہ ہے جب ان کی شاعری میں ادا بندی، تصوّف اور فلسفیانہ مضامین شامل ہوئے۔ یہ وہ دَور ہے جب انہیں ہر صنف میں طبع آزمائی پر پوری قدرت حاصل ہو چکی تھی۔ ان کی قادرالکلامی کا اندازہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ غزل کے علاوہ قصیدہ، مرثیہ اور رباعی وغیرہ میں انہوں نے اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے جن کے دیکھنے سے ان کی پُرگوئی اور زبان پر مکمّل قدرت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان سب کے باوجود زبان اور محاورے میں انہوں نے میرؔ کی روش اختیار کی۔ حالاں کہ اس دور میں فلسفے نے ان کی شاعری پر غالبؔ کا رنگ بھی پیدا کر دیا تھا۔ مشکل سے مشکل صوفیانہ اور فلسفیانہ مضامین کو ایسی صفائی اور روانی سے ادا کر جاتے ہیں کہ قاری کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ کیسا مضمون اتنی خوبی کے ساتھ شاعر ادا کر گیا ہے۔ غالبؔ کی اکثر زمینوں میں آرزؔو نے غزلیں کہی ہیں لیکن زبان و بیان اور طرزِ ادا میرؔ کا ہی اختیار کیے رکھا۔ اس دَور کی شاعری کی مثالیں ملاحظہ کیجیے:

دوست نے دل کو توڑ کر نقشِ وفا مٹا دیا
سمجھے تھے ہم جسے خلیل کعبہ اُسی نے ڈھا دیا
بیٹھا ہوں اپنے قتل کا ساماں کیے ہوئے
یعنی خیالِ نازکِ مژگاں کیے ہوئے
یوں پھر رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں
آلودہ میرے خون سے داماں کیے ہوئے
نہ تھا جس میں کوئی اس آنکھ میں اب اک تمہی تم ہو
یہ گھر سنسان ہو کر بچ گیا سنسان ہونے سے
بے کل ہے اِدھر جی ، تو اُدھر آنکھ ہے چنچل

دونوں میں پہل دیکھیے ہوتی ہے کدھر سے
گھر یہ تیرا سدا نہ میرا ہے
رات دو رات کا بسیرا ہے
کھینچ کر لوگ ترے در سے لیے جاتے ہیں
کیا محبت کے صلے یوں ہی دیے جاتے ہیں
یہی جینا ہے تو مرنے کو برا کیوں کہیے
کوئی اُمّید نہیں پھر بھی جیے جاتے ہیں

﴿۴﴾ آرزو کی خالص اردو

شاعرانہ خصوصیات کا ذِکر تب تک مکمّل نہیں ہوگا جب تک کہ آرزو کی خالص اردو کا ذِکر نہ کیا جائے۔ ایسی غزلیں بہت سی ہیں اور خاص طور سے ان کا مجموعۂ کلام ’’سریلی بانسری‘‘ جس میں انہوں نے عربی، فارسی الفاظ کا استعمال ہی نہیں کیا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنی آسان زبان میں اپنے تاثرات ومحسوسات نہایت خوبی اور روانی کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ ان کی زبان کی خوبی ایسی ہے کہ زمین کیسی ہی مشکل کیوں نہ ہو مگر ان کی آب دار طبیعت اپنی زبان دانی کے جوہر دکھا کر رہتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سہلِ ممتنع پر جو قدرت آرزو کو حاصل تھی اردو شاعری میں بہت کم لوگوں کو ایسی قدرت حاصل تھی۔ فارسی، عربی الفاظ سے مبرا اشعار کی مثالیں دیکھیے:

اندھیرے گھر میں کبھی چاندنی نہیں آتی
ہنسی کی بات پہ بھی اب ہنسی نہیں آتی
کر ہی کیا سکتا تھا آنکھوں کا ذرا سا پانی
جب لگی بجھ نہ سکی کھول کے اُبلا پانی
کوئی متوالی گھٹا تھی کہ جوانی کی اُمنگ
جی بہا لے گیا برسات کا پہلا پانی
نہیں کچھ اس کا پچھتاوا کہ جی کی رہ گئی جی میں
یہ جانے کون گھبراہٹ میں کیا مُنہ سے نکل جاتا
جہاں لے کے پہنچی ہے جی کی اداسی
وہ کیسی جگہ ہے نہ گھر ہے نہ بن ہے
مَلی آنکھ ، ماتھے سے ٹپکا پسینا
یہ چاہت کے ساون کی پہلی جھڑی ہے
ہے ایک ہی ہونا تو یہ اَن بَن نہیں اچھی
میرا سا نہ بن تو مجھے اپنا سا بنا دے

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ آرزوؔ کے دوسرے دور کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے؟

﴿۵﴾ ’’سریلی بانسری‘‘ مجموعے کی کیا خوبی ہے؟

﴿۶﴾ تیسرے دور کی شاعری پر کن شعرا کا اثر دکھائی دیتا ہے؟

07.05 آرزوؔ لکھنوی کی پہلی غزل

﴿۱﴾

﴿۱﴾ اوّلِ شب وہ بزم کی رونق ، شمع بھی تھی ، پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ، ختم تھا یہ افسانہ بھی

﴿۲﴾ خون ہی کی شرکت وہ نہ کیوں ہو،شرکت چیز ہے جھگڑے کی
اپنوں سے وہ دیکھا رہا ہوں ، جو نہ کرے بے گانہ بھی

﴿۳﴾ ایک لگی کے دو ہیں اثر ، اور دونوں حسبِ مراتب ہیں
لو جو لگائے شمع کھڑی ہے رقص میں ہے پروانہ بھی

﴿۴﴾ وحدت میں کی کثرت پیدا ، جلووں کی پاشانی نے
ایک ہی جا تھا کچھ دن پہلے ، کعبہ بھی بت خانہ بھی

﴿۵﴾ دورِ مسرّت آرزوؔ اپنا ، کیسا زلزلہ آگیں تھا
ہاتھ سے مُنہ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

07.06 آرزوؔ لکھنوی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ یہ غزل آرزوؔ کے مجموعۂ کلام ’’جہانِ آرزو‘‘ سے منتخب کی گئی ہے۔اس غزل کے مطالعے سے طلبا کو آرزوؔ کی زبان اوران کے تخیّل و تجربات سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ ان کا ذوق کتنا سلجھا ہوا تھا۔ یہ غزل تصوّف اور تجربات و مشاہدات دونوں طرح کے مشاہدات سے مزیّن ہے۔شاعر جہاں عاشق و معشوق کی باتیں کرتا ہے وہیں معاملات کیسے ہی نازک مرحلے کے کیوں نہ ہوں، اپنی انانیت کے جذبے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ آرزوؔ کو تصوّف اور فلسفے سے خاصا لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بھی کچھ کچھ جھلکیاں اس غزل میں نظر آتی ہیں۔ایک بات اور خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ پوری غزل سہلِ ممتنع میں ہے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: پہلے شعر میں ایک بھی ایسا لفظ نہیں ہے جس کا معنی آپ کو نہ معلوم ہو۔اس قدر آسان شعر کو سہلِ ممتنع کی مثال کہا جا سکتا ہے۔بظاہر شعر آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں شاعر نے جس مضمون کو باندھنے کی کوشش کی ہے وہ فلسفیانہ ہے۔آرزوؔ کہتے ہیں کہ رات کے پہلے پہر، شمع اور پروانہ یعنی عاشق ومعشوق جب ایک ہی محفل میں ہوں تو پھر اس محفل کی رونق، چہل پہل اور خوشی کے سماں کا کیا بیان ہو سکتا ہے۔لیکن اگلے مصرعے میں افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ ایسی خوشی کی محفل ایسی رونق والی بزم، رات کے ختم ہوتے ہوتے ختم ہو جائے گی۔ اس شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر اس شعر میں دنیا اور زندگی کا فلسفہ بیان کر رہا ہو کہ اس چند روزہ زندگی کے دن آپ چاہے جتنے عالی شان ڈھنگ سے کیوں نہ گزاریں مگر اس کی کہانی بھی رات ہی کی طرح ختم ہونے والی ہے۔اب اس شعر کا مفہوم یہ ٹھہرا کہ اس چند روزہ زندگی کا اعتبار کیا کرنا اور اس کے لئے اتنا اہتمام کیوں، جب کہ یہ ختم ہونے والی ہے۔میرؔ نے کہا کہ

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

غالبؔ نے بھی اس سے ملتے جلتے مضمون کو اپنی طرز میں یوں باندھا ہے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

دوسرا شعر: دوسرے شعر میں شاعر سماج کی تلخ حقیقت بیان کر رہا ہے جو کہ ہمارے اپنے سماج کی سچائی ہے۔یعنی شرکت، ساجھا اور مشترکہ کوئی بھی چیز ہو، حتی کہ خون کی شرکت ہی کیوں نہ ہو مگر وہ ایک نہ ایک دن جھگڑے کا سبب بنے گی۔دوسرے مصرعے میں شاعر نے جو کہنے کی کوشش کی ہے اس کے بارے میں کہاوت ہے کہ نہ بھائی ایسا دوست اور نہ بھائی ایسا دشمن۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی کو جو نقصان، جو دکھ اور جو مصیبتیں اپنوں سے ملتی ہیں وہ غیروں سے کبھی بھی نہیں مل سکتیں۔اس شعر میں صنعتِ تضاد ہے۔یعنی جب کلام میں دو متضاد الفاظ آجائیں تو اسے تضاد کہتے ہیں۔جیسے رات اور دن، صبح اور شام، اپنا اور بے گانہ وغیرہ۔

تیسرا شعر: ایک لگی یعنی لگاؤ، انسیت، محبت کے دو اثر ہیں اور دونوں ہی اپنے اپنے مرتبے کے لحاظ سے ہیں۔لو کا مطلب ہے آرزو یعنی شمع جس آرزو میں کھڑی ہے اس لحاظ سے پروانہ بھی رقص کر رہا ہے۔شمع کا لو لگائے کھڑے رہنا، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شمع جب روشن ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو جلاتی ہے۔اس کے اس عمل پر پروانہ بھی شمع کے اردگرد رقص کرتے ہوئے اپنی جان نثار کر دیتا ہے۔مجموعی طور پر اس شعر کا مطلب یہ نکلا کہ اگر کوئی آپ سے محبت کرتا ہے تو آپ بھی اس لحاظ سے اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کیجیے۔یہی انسانیت کا تقاضہ ہے اور یہی آدمیت ہے۔

چوتھا شعر: چوتھے شعر کو پڑھتے ہی غالبؔ کا یہ شعر ذہن میں آتا ہے کہ:

ہم مؤحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزاے ایماں ہوگئیں

یہ تصوّف کا شعر ہے۔ شاعر کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے ماننے کے طریقے الگ الگ ہیں ورنہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب کعبہ اور بت خانہ دونوں ایک ہی تھے۔ اس شعر میں آرزؔو ہندو مسلم ایکتا اور قومی یک جہتی کے جذبوں سے سرشار نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی کثرت میں وحدت کے قائل بھی۔ دنیا میں آئے دن اور ہندوستان میں بالخصوص جو مذہبی لڑائیاں ہوا کرتی ہیں اس کے پیشِ نظر یہ شعر بہت ہی خوب تر ہے کہ حضرتِ انسان نے خود طرح طرح کی چیزیں پیدا کی ہیں ورنہ کعبہ و بت خانہ جب ایک جگہ تھا تب بھی سب اس کی عبادت کرتے تھے۔

پانچواں شعر: اس شعر میں شاعر خود اپنی ذات سے مخاطب ہوا ہے اور کہتا ہے کہ اے آرزؔو! اپنا خوشیوں کا زمانہ بھی کیسا زلزلہ آگیں تھا کہ جس میں ہم ایک پیمانہ بھی لب تک نہ لا سکے یعنی شاعر کی زندگی میں خوشیوں کے لمحات بہت ہی کم آئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ تشنہ ہی رہا۔ اپنے اُنہی لمحات کو یاد کرتے ہوئے آرزؔو سوال کر رہے ہیں کہ اتنی دیر کے لئے بھی خوشی حاصل نہ ہوسکی کہ جس میں ایک پیمانہ پی لیتے یا ایک محفل سجا لیتے۔

07.07 آرزؔو لکھنوی کی دوسری غزل

﴿۱﴾

﴿۱﴾ رس اُن آنکھوں کا ہے کہنے کو ذرا سا پانی
سیکڑوں ڈوب مرے پھر بھی ہے اتنا پانی

﴿۲﴾ کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

﴿۳﴾ پھیلتی دھوپ کا ہے روپ لڑکپن کی اٹھان
دوپہر ڈھلتے ہی اترے گا یہ چڑھتا پانی

﴿۴﴾ رس ہی رس جن میں ہے اور سیل ذرا سی بھی نہیں
مانگتا ہے کہیں اُن آنکھوں کا مارا پانی

﴿۵﴾ رو لیا پھوٹ کے چھاتی میں جلن اب کیوں ہو
آگ پگھلا کے نکالا ہے یہ جلتا پانی

07.08　آرزوؔ لکھنوی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ یہ غزل آرزو لکھنوی کے مجموعے ''سریلی بانسری'' سے منتخب کی گئی ہے۔ اس بات کا ذکر پہلے آ چکا ہے کہ ''سریلی بانسری'' میں آرزوؔ کے اس کلام کو شامل کیا گیا ہے جس میں خالص ہندوستانی زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں عربی و فارسی کا ایک بھی لفظ شامل نہیں ہے۔ اس غزل کے مطالعے سے آپ کو اس بات کا اندازہ تو ہوگا ہی ساتھ ہی ساتھ پانی کے استعمال میں آرزوؔ نے جو ہر دکھائے ہیں اس سے بھی آپ لطف اندوز ہو سکیں گے۔ پانی سے جڑے ہوئے جتنے محاورے ہیں ان سے بھی شاعر نے جو کمال دکھائے ہیں اور رنگارنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ بھی خاص توجّہ کی مستحق ہے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: شاعر کہتا ہے کہ ویسے تو آنکھوں میں ذرا سا ہی پانی ہوتا ہے لیکن اس ذرا سے پانی کا کیا کرشمہ ہے کہ اس میں نہ جانے کتنے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں پھر بھی ان میں اتنا پانی باقی ہے۔ اس شعر میں کلیدی لفظ پانی ہے جس کا استعمال شاعر نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ آنکھوں کا پانی ڈھلنا اور آنکھوں کا پانی مرجانا وغیرہ محاروں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس شعر پر غور کریں تو لفظِ پانی کا مسئلہ آسان ہوتا نظر آئے گا۔ پانی یعنی شرم، لحاظ، حیا اور ادا وغیرہ۔ سیکڑوں کے مرنے سے یہ مراد قطعی نہیں کہ حقیقتاً ان کا قتل ہو رہا ہے بلکہ وہ محبوب کی اداؤں، ناز اور دل فریبی پر اپنی جان قربان کرتے ہیں یا کر چکے ہیں۔

جیسا کہ ہم سبھی کو معلوم ہے کہ آنکھوں میں بہت تھوڑا سا پانی ہوتا ہے لیکن جب اس پانی سے مراد حیا اور ادا ہو تو پھر اس ''ذرا سا'' کا معاملہ بالکل ہی الگ ہو جاتا ہے۔ چوں کہ آنکھوں کا یہ پانی اصل پانی یا کسی جھیل کا پانی نہیں ہے۔ لہٰذا محبوب کی اداؤں پر نہ جانے کتنے قربان ہوں گے کیوں کہ اس میں ابھی بھی اتنا پانی باقی ہے۔

دوسرا شعر: اردو شاعری میں محبوب کی زلفوں کو اکثر گھٹا اور بادل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ زیرِ بحث شعر کے دوسرے مصرعے میں استعارہ ہے۔ آرزوؔ نے بھی اس شعر میں یہی کہنے کی کوشش کی ہے لیکن 'کس' سے مراد کوئی اور نہیں بلکہ معشوق ہی ہے۔ معشوق اپنی بھیگی ہوئی زلفوں سے جو پانی اپنے عاشق پر چھڑک رہا ہے وہ اس طرح مسلسل اور لگاتار چھڑکے جا رہا ہے کہ عاشق کو گمان ہونے لگا ہے کہ ''جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی''، یعنی جس طرح گھٹا جھوم کے برستی ہے اسی طرح کی یہ بارش بھی ہے جو معشوق کی طرف سے ہو رہی ہے۔ یہاں ایک بات اور قابلِ ذِکر ہے کہ جب گھٹا ٹوٹ کے برستی ہے تو چاروں طرف اندھیرا ہو جاتا ہے۔ ویسا ہی اندھیرا محبوب اپنی زلفوں سے کیے ہوئے ہے اور بالوں سے پانی برس رہا ہے۔

تیسرا شعر: آرزوؔ نے اس شعر میں ''چڑھتا پانی'' کے محاورے سے مضمون آفرینی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ یہاں لڑکپن کی اٹھان کو چڑھتے ہوئے سورج کی مانند قرار دیا ہے۔ جوانی میں آدمی ہوش کھو بیٹھتا ہے جو کہ چندروزہ ہے۔ ایسی چیز جو فانی ہے، چندروز کی ہے، انسان اس پر بھی گھمنڈ کرنے لگتا ہے۔ لیکن جیسے ہی جوانی کا سورج ڈھلتا ہے تو اس کا اور اس کے چڑھتے ہوئے پانی کا گھمنڈ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے ایسی چندروزہ جوانی اور ایسے چڑھتے سورج پر غرور کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا۔ لہٰذا انسان کو گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے۔

چوتھا شعر: رَس ہی رَس یعنی پانی ہی پانی آنکھوں میں ہے مگر سَیل یعنی بہاؤ اور سَیل بمعنی مروّت ان میں ذرا بھی نہیں۔ اس لئے ان آنکھوں کا مارا ہوا کہیں پانی نہیں مانگتا۔

پانچواں شعر: اس شعر میں آرزوؔ کہتے ہیں کہ جب پھوٹ کے رو لیے تو اب سینے میں جلن کیوں ہو رہی ہے؟ حقیقتِ حال بھی یہی ہے کہ جب آدمی دکھوں کو اپنے اندر ہی اندر لیے رہتا ہے تو اس کو اس کا درد ستاتا رہتا ہے یعنی خلش اور جلن ہوتی رہتی ہے اور جب آدمی پھوٹ کے رو دیتا ہے تو اس کا جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس شعر کا معاملہ یہ ہے کہ اندر کی آگ کو پگھلا کر نکال دیا ہے اس کے باوجود سینے میں جلن باقی ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اپنی وفا اور محبوب کی بے وفائی اور اس کی بے التفاتی کو یاد کر کے عاشق پھوٹ پھوٹ کے رویا ہے۔ اس کے باوجود سینے میں ابھی جلن باقی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ پہلی غزل کے تیسرے شعر میں ''ایک لگی'' سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

﴿۸﴾ دوسری غزل کے دوسرے شعر کا مفہوم اپنی زبان میں لکھیے۔

﴿۹﴾ ''جلتا پانی'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

07.09 خلاصہ

اب تک آپ نے اس باب میں آرزوؔ لکھنوی کی حیات، ان کی شعری کی خصوصیات اور دو غزلوں کا مطالعہ شرح کے ساتھ کیا۔ اس سے آپ کو آرزوؔ کی زندگی، کارنامے اور شاعری کی جملہ خوبیوں کا اندازہ بخوبی ہو گیا ہوگا۔ آرزوؔ لکھنوی زبان کے ان ماہرین میں سے ہیں جنہوں نے زبان کی نوک پلک سنوارنے میں بڑی کاوشیں کی ہیں۔ شاعری میں خالص ہندوستانی زبان استعمال کرنے کا سہرا ان کے سر ہے۔ حالاں کہ انشاء اللہ خاں کا نام بھی اس سلسلے میں لیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے ''رانی کیتکی'' دیسی زبان میں لکھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک نے شاعری میں کمال دکھایا تو دوسرے نے نثر میں۔ اس باب کے مطالعے کے بعد آپ سے توقع کی جا سکتی ہے کہ آرزوؔ کے کلام کو مزید پڑھنے کی کوشش کریں گے۔

07.10 فرہنگ

اصنافِ سخن	:	شاعری کی قسمیں، جیسے غزل، مرثیہ اور مثنوی وغیرہ	ریختی	:	وہ نظم جو عورتوں کی زبان میں کہی جائے
			طبعِ رسا	:	تیز طبیعت
انفرادیت	:	یکتائی، امتیاز	عرفیت	:	مشہور نام۔ وہ نام جو لوگ پیار سے بلانے کے لئے پکارتے ہیں
اولِ شب	:	رات کا پہلا پہر، پہلا حصّہ			
پاشانی	:	چھڑکاؤ، جلوہ	کس بل	:	قوّت، طاقت
پُرگوئی	:	بہت کہنے، زیادہ کہنے کی صفت	لگی	:	لگن، محبت، عشق
دبستان	:	اسکول، مکتب	وحدت	:	یگانہ ہونا، یہ ماننا کہ اللہ ایک ہے
رس	:	عرق، پانی			

07.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰۔۱۰/سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : آرزو لکھنوی کے دورِ اوّل کی شاعری کی خصوصیات لکھیے۔

سوال نمبر۲ : پہلی غزل کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے شعر کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰۔۳۰/سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : آرزو کی زندگی اور ابتدائی حالات قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۲ : آرزو کی غزل کی خصوصیات بیان کیجیے۔

سوال نمبر۳ : آرزو کی زبان کے بارے میں ایک نوٹ قلم بند کیجیے۔

07.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ بیانِ آرزو	از	آرزو لکھنوی
۲۔ جہانِ آرزو	از	آرزو لکھنوی
۳۔ سریلی بانسری	از	آرزو لکھنوی
۴۔ فغانِ آرزو	از	آرزو لکھنوی
۵۔ متفرّقاتِ آرزو	از	آرزو لکھنوی
۶۔ نشانِ آرزو	از	آرزو لکھنوی
۷۔ تاریخِ ادبِ اردو	از	سیّد اعجاز حسین

07.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ آرزو لکھنوی کا پورا نام سیّد انوار حسین آرزو تھا۔

﴿۲﴾ سریلی بانسری

﴿۳﴾ ''متوالی جوگن'' اور ''دل جلی بیراگن''

﴿۴﴾ آرزو کے دوسرے دور کی شاعری میں میر اور مومن کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ میر کی زبان کا اثر تو ان کی پوری شاعری پر ہے۔

﴿۵﴾ ''سریلی بانسری'' آرزو کا وہ مجموعۂ کلام ہے جس کو وہ خالص اردو کہتے ہیں۔ جس میں عربی فارسی کا کوئی بھی لفظ شامل نہیں ہے۔

﴿۶﴾ تیسرے دور کی شاعری میں وہ غالب سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس دور میں فلسفہ اور تصوّف کی طرف رجحان زیادہ ہو گیا تھا۔

﴿۷﴾ لگی یعنی محبت، لگن، عشق۔ آرزو نے شمع کی لو لگانے کا ذکر کر کے اور پہلے مصرعے میں ''لگی'' رکھ کر نئی بات پیدا کر دی ہے۔ کیوں کہ شمع کے شعلے کو اس کی ''لو'' کہتے ہیں اور ''لگی'' کا لفظ آگ کے لئے اور شوقِ دلی کے لئے بولا جاتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ ''میرے تو دل کو لگی ہے، تمھیں کیا پتا؟''

﴿۸﴾ آج معشوق کا برتاؤ پہلے کی بہ نسبت ذرا سا الگ ہے۔کون ہے جو اس طرح بھیگے ہوئے بالوں سے پانی چھڑک رہا ہے اور اس قدر چھڑک رہا ہے جیسے گھٹا ٹوٹ کر برس رہی ہے۔

﴿۹﴾ 'جلتا پانی' سے یہ مراد ہے کہ دل میں جو آگ لگی ہے اس کی وجہ سے جو پانی آنکھوں سے نکل رہا ہے وہ گرم ہے۔

اکائی 08 : حسرتؔ موہانی

ساخت

08.01 : اغراض ومقاصد
08.02 : تمہید
08.03 : حسرتؔ موہانی کے حالاتِ زندگی
08.04 : حسرتؔ موہانی کی غزل گوئی
08.05 : حسرتؔ موہانی کی پہلی غزل
08.06 : حسرتؔ موہانی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
08.07 : حسرتؔ موہانی کی دوسری غزل
08.08 : حسرتؔ موہانی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
08.09 : خلاصہ
08.10 : فرہنگ
08.11 : نمونہ امتحانی سوالات
08.12 : حوالہ جاتی کتب
08.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

08.01 : اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ حسرتؔ موہانی کی حیات، ان کے جذبۂ حُبُّ الوطنی اور ادبی خدمات سے آگہی حاصل کریں گے اور اس حصے کے مطالعے کے بعد آپ غزل گوئی میں حسرتؔ کے مخصوص رنگ اور ان کی شاعری کی بنیادی خصوصیات سے بھی واقف ہوجائیں گے۔ اکائی کی دونوں غزلوں کے تفصیلی مطالعے سے نہ صرف آپ کی زبان فہمی میں اضافہ ہوگا بلکہ آپ کا ذہن کسی قدر غزل کی فضا سے ہم آہنگ ہوجائے گا۔

08.02 تمہید

ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں حصہ لینے والے ایک پرعزم اور صاف گو مجاہد کا نام حسرتؔ موہانی تھا۔ حسرتؔ صرف ایک محبِّ وطن مجاہد ہی نہیں بلکہ ایک اچھے غزل گو شاعر بھی تھے۔ جنہوں نے غزل کی گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کیا۔ جب کہ ان کے عہد میں ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں کی وجہ سے لوگ لکھنؤ اور دہلوی طرز کی شاعری سے اکتا چکے تھے۔ انہوں نے دونوں دبستانوں کے اختلاط سے ایک نیا آمیزہ تیار کیا جس کو بجا طور پر رنگِ حسرتؔ کہا جاسکتا ہے۔

08.03 حسرتؔ موہانی کے حالاتِ زندگی

حسرتؔ موہانی کا نام سیّد فضل الحسن اور تخلّص حسرتؔ تھا۔ان کی پیدائش ضلع اُنّاؤ، اتر پردیش کے قصبہ موہان میں ۸۱-۱۸۸۰ء کے قریب اور وفات ۱۳؍مئی ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم قدیم وضع کے ایک مکتب میں ہوئی جہاں قرآن ختم کرنے کے بعد انہوں نے فارسی اور عربی کا درس لیا اور ۱۸۹۴ء میں اردو مڈل کا امتحان اس اعزاز و امتیاز کے ساتھ پاس کیا کہ پورے صوبے میں اوّل رہے۔مڈل اسکول میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے فتح پور چلے گئے۔فتح پور کے گورنمنٹ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے فکرِ سخن کی ابتدا کی۔۱۸۹۹ء میں انہوں نے گورنمنٹ اسکول سے ہی انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ان دنوں حسرتؔ کی عربی، فارسی اور ریاضی میں استعداد بہت نمایاں تھی۔یہ وہ زمانہ تھا جب ڈاکٹر سر ضیاء الدّین احمد محمڈن عربک اینگلو کالج (موجودہ علی گڑھ یونیورسٹی) میں ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے آ چکے تھے۔انٹرنس کا رزلٹ دیکھتے ہی موصوف نے حسرتؔ کو حصولِ تعلیم کے لئے علی گڑھ آنے کی دعوت دی۔حسرتؔ نے علی گڑھ میں داخلہ لے لیا۔یہاں پر انہوں نے پروفیسر جے.بی چکرورتی، ڈاکٹر ضیاء الدّین احمد اور صاحب زادہ آفتاب وغیرہ سے درس لیا۔علی گڑھ میں ان کے رفقا میں سیّد سجّاد حیدر یلدرم، مولانا شوکت علی، خان بہادر سیّد ابو محمد، پروفیسر ظریف دہروی اور محمد حیات وغیرہ تھے۔ان حضرات کے ساتھ شعر و سخن کی محفلیں اکثر گرم رہا کرتی تھیں۔شعر و ادب کی خدمت کے ساتھ ۱۹۰۳ء میں انہوں نے علی گڑھ سے عربی اور ریاضی اختیاری مضامین کے ساتھ بی.اے پاس کر لیا۔

قیامِ علی گڑھ کے دوران وہ سیاست اور آزادیِ وطن کے جذبے سے اس قدر سرشار ہو چکے تھے کہ نعرۂ حرّیت بلند کرنے کے جرم میں تین بار کالج سے نکالے گئے۔ان کے جذبۂ حرّیت، بے باکی اور حق گوئی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بی.اے کے امتحانات سے فرصت پاتے ہی نتیجے کا انتظار کئے بغیر علی گڑھ سے ’’اردوے معلّی‘‘ کا ڈکلریشن داخل کر دیا اور شہر میں منتقل ہونے کے بعد اُردوے معلّی کی ادارت میں مصروف ہو گئے۔اس ماہ نامے کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔اس جریدے نے نہ صرف اپنے عہد کے ادبی مذاق کو نکھارا بلکہ عوام میں سیاسی شعور بھی بیدار کیا۔اس لحاظ سے اردوے معلّی ہندوستان کا پہلا اردو جریدہ ہے جس نے ملک میں سیاسی شعور، بالخصوص مسلمانوں میں سیاسی فہم پیدا کرنے کی کوشش کی۔اردوے معلّی میں جہاں ’مسلمان اور پالیٹکس، مسلمان اور کانگریس اور ہندوستان کے پالیٹکل قیدی جیسے ہندوستانی سیاست سے متعلّق مضامین شائع ہوئے، وہیں بین الاقوامی سیاست سے متعلّق مضامین بھی اس رسالے کی زینت بنے۔بلکہ ایک مضمون بعنوان ’’مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی‘‘ شائع کرنے کے سبب حسرتؔ پر مقدمہ بھی چلا اور انہیں قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔قومی اور بین الاقوامی سیاست کی فہم پیدا کرنے کے علاوہ اس جریدے نے ایک بڑا کام، مسلمانانِ ہند کو تحریکِ آزادی سے جوڑنے کا بھی کیا۔وہ بھی ایسے ناسازگار ماحول میں جب مسلمانوں کے لئے آزادی اور کانگریس کی حمایت کفر کے مترادف تصوّر کی جاتی تھی۔لیکن مولانا موصوف نے اپنے زورِ قلم اور اس ماہ نامے کے توسّط سے مسلمانوں کے لئے تحریکِ آزادی اور کانگریس میں شمولیت کی راہ ہموار کر دی۔اسی وجہ سے علی گڑھ کے صاحبِ اقتدار لوگوں نے اردوے معلّی کی شدید مخالفت کی۔یہاں تک کہ طلباے علی گڑھ کے لئے یہ حکم جاری کر دیا گیا کہ نہ تو وہ اردوے معلّی کے خریدار بنیں اور نہ ہی حسرتؔ موہانی کی دکان پر جائیں۔

حسرتؔ موہانی ممتاز شاعر و ادیب اور بے باک صحافی کے علاوہ ایک محبِّ وطن سیاست داں بھی تھے۔ حب الوطنی سے سرشار ہوکر انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کی ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء تک وہ کانگریس کے باقاعدہ سرگرم رکن رہے۔ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۵ء تک کے کانگریس کے سالانہ اجلاس کی رپورٹ اردوے معلّٰی میں شائع کر کے انہوں نے ایک لحاظ سے اردوے معلّٰی کو کانگریس کا ترجمان بنا دیا۔ وطن کی محبت سے ہی مجبور ہوکر انہوں نے علی گڑھ میں ''موہانی سودیشی اسٹور'' اور بعد میں کان پور میں بھی سودیشی اسٹور کھولا۔ جب فرنگی جبر و استبداد کی بدولت انہیں جیل جانا پڑا تو اردوے معلّٰی کے ساتھ علی گڑھ کا یہ اسٹور بھی بند ہوگیا۔ ذریعۂ معاش چھن جانے اور قید خانے کی اذیّتوں کے باوجود ان کے پائے استقلال میں لرزش نہیں آئی۔ اسیری کے باوجود نہ ہی انہوں نے راست گوئی اور بے باکی کو خیر باد کہا اور نہ ہی دامنِ ادب سے کنارہ کشی اختیار کی، جیسا کہ ایک شعر میں کہتے ہیں کہ:

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

جیل کی اذیّتوں کے باوجود ان کے عزائم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بلکہ جیل جانے سے جذبۂ حبُّ الوطنی فزوں تر ہو گیا جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے گاندھی جی اور کانگریس کے بڑے بڑے عہدہ داروں کی مخالفت کے باوجود کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ''مکمل آزادی'' کی قرارداد پیش کر دی۔ واضح رہے کہ اس وقت کانگریس محض ''جزوی آزادی'' کے لئے کوشاں تھی۔ گویا مکمّل آزادی کی قرارداد پیش کرنے والے حسرتؔ پہلے مجاہدِ آزادی تھے۔ سزائے قید نے بے باکی اور راست گوئی میں اس قدر اضافہ کر دیا تھا کہ بوقتِ ضرورت کانگریس، گاندھی جی، محمد علی جناح اور سردار پٹیل کی برسرِ عام مخالفت سے باز نہیں آئے۔ ان کے فعال ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کی تقریباً تمام اصلاحی، سیاسی اور فکری تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خواہ وہ خلافت تحریک ہو، ترکِ موالات کی تحریک ہو، سائمن کمیشن کی مخالفت کی تحریک ہو، ۱۹۱۷ء کے روس کے انقلاب کی تحریک ہو، روس کے زیرِ اثر شروع ہونے والی ہندوستانی کمیونسٹ تحریک ہو، مزدوروں کی تحریک ہو۔ ترقّی پسند ادبی تحریک ہو یا علی گڑھ کالج کو مسلم یونی ورسٹی بنانے کی تحریک ہو۔ الغرض مولانا موصوف اپنے عہد کی تقریباً تمام تحریکات سے وابستہ رہے۔ حسرتؔ موہانی نے آزادیِ ہند کے بعد تشکیل پانے والی دستور ساز اسمبلی میں بھی بحیثیتِ ممبر پارلیمنٹ کے شرکت کی لیکن بعض اختلافات کی وجہ سے انہوں نے دستورِ ہند پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ مختصراً مولانا حسرتؔ موہانی گو ناگوں خصوصیات اور کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ حسرتؔ کا پورا نام کیا تھا؟

﴿۲﴾ حسرتؔ کہاں پیدا ہوئے تھے؟

﴿۳﴾ حسرتؔ علی گڑھ کالج سے کس جرم میں نکالے گئے تھے؟

﴿۴﴾ حسرتؔ کے جاری کردہ مجلّے کا نام لکھیے۔

﴿۵﴾ کان پور سے حسرتؔ نے کون سا روزنامہ جاری کیا تھا؟

﴿۶﴾ حسرتؔ کے رسالے سے ہندوستانی معاشرے بالخصوص مسلم معاشرے میں کون سی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

ادبی خدمات:۔ حسرتؔ موہانی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔اپنی زندگی میں انھوں نے دو رسالے ''اردوے معلّٰی اور ''تذکرۃ الشعرا'' علی گڑھ سے اور ایک روزنامہ اخبار ''مستقبل'' کان پور سے جاری کیا۔تذکرۃ الشعرا دراصل قدیم و جدید شعرا کے دواوین کا انتخابی سلسلہ تھا جو پندرہ برس اردوے معلّٰی کے ضمیمے کے طور پر شائع ہوتا رہا اور چند سال انفرادی حیثیت سے کتابی شکل میں۔اس ضمیمے یا کتابی سلسلے میں مستند شعرا کے دواوین کے انتخاب کے علاوہ شعرا کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر تنقید بھی شامل ہوتی تھی۔اس اعتبار سے تذکرۃ الشعرا اردو ادب کی تاریخ بھی ہے۔۱۹۱۴ء میں حکومتِ برطانیہ کے جبر و استبداد کا شکار ہو کر اردوے معلّٰی کی اشاعت موقوف ہوگئی۔لیکن جیل سے رہائی ملنے کے بعد ۱۹۲۵ء سے حسرتؔ موہانی نے اردوے معلّٰی کا سلسلہ کان پور سے دوبارہ شروع کیا، جو ۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔کان پور منتقل ہونے کے بعد مولانا نے تذکرۃ الشعرا کی تمام جلدوں کو یکجا کر کے ''انتخابِ سخن'' کے نام سے گیارہ جلدوں میں شائع کروایا۔جو بلاشبہ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

''نکاتِ سخن'' حسرتؔ موہانی کی عملی تنقید کا نمونہ ہے۔انھوں نے یہ کتاب نومشق شعرا کی رہنمائی کے لئے لکھی تھی۔یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔پہلا باب ''متروکاتِ سخن'' دوسرا باب ''معائبِ سخن'' تیسرا باب ''محاسنِ سخن'' اور چوتھا باب ''نوادرِ سخن'' کے نام سے شائع ہوا۔پانچویں باب کی اشاعت عمل میں نہیں آسکی۔ان میں متروکاتِ سخن، معائبِ سخن اور محاسنِ سخن بے حد مقبول ہوئے۔''مشاہداتِ زنداں'' ایک طرح سے حسرتؔ کی آپ بیتی ہے جس میں انھوں نے قیدِ فرنگ میں اپنی صعوبتوں اور انگریزوں کے مظالم کا ذکر بہت تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ان کتابوں کی تصنیف کے علاوہ انھوں نے مختلف شعرا کے دواوین مرتّب کیے اور دیوانِ غالب مع شرح مرتّب کی۔ان کی مستقل کتابوں سے قطعِ نظر مختلف رسائل و جرائد میں ان کے مضامین اور مقالے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ان تحریروں کے جائزے سے حسرتؔ کی شعر فہمی، زبان دانی، تنقیدی بصیرت اور فنِ تذکرہ نگاری کا اندازہ ہوتا ہے۔مختصراً حسرتؔ ایک بلند پایہ محقق، نثر نگار، صحافی اور شاعر تھے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ ''انتخابِ سخن'' کی سلسلے وار اشاعت کس رسالے میں عمل میں آئی؟

﴿۸﴾ مولانا حسرتؔ موہانی کے روزنامے کا کیا نام تھا اور انھوں نے اسے کہاں سے جاری کیا تھا؟

﴿۹﴾ ''مشاہداتِ زنداں'' کا مصنّف کون تھا؟

﴿۱۰﴾ ''مشاہداتِ زنداں'' کا موضوع کیا ہے؟

08.04 حسرتؔ موہانی کی غزل گوئی

اُنیسویں صدی کے ربعِ آخر میں یعنی حسرتؔ کے سنِ شعور تک پہنچنے کے زمانے میں اردو غزل میں دو میلانات نمایاں تھے۔ایک میلان لذّت کشی اور عیش پرستی پر منحصر واقعیت کے مقابلے میں تخیّل پسندی کے مرہونِ منّت تھا۔اس میلان کے نمائندہ غزل گو شاعر داغؔ دہلوی اور امیرؔ مینائی تھے۔غزل کا دوسرا مقبول رجحان جدیدیت کا تھا جس کی نمائندگی حالیؔ، اسماعیل میرٹھی اور وحید الدّین سلیم وغیرہ کر رہے تھے۔جدیدیت اور فطری شاعری کے اس رجحان نے بلاشبہ غزل کو باعتبارِ موضوع وسعت بخشی مگر اسلوب کے نقطۂ نظر سے اس قبیل کی بیش تر

غزلیں سپاٹ، تخیل اور رمزی کیفیت سے محروم تھیں۔ عہدِ حسرتؔ میں ان دونوں مقبول رجحانات کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا رنگ بھی بڑی ہی آہستگی سے سر اُبھار رہا تھا۔ یہ تیسرا رنگ تھا شادؔ عظیم آبادی کا، جن کی غزلوں میں بقولِ نیازؔ فتح پوری:

''بیان کی سادگی، نرم لب ولہجہ، سوز وگداز اور واقعیت، جنہیں تغزّل کی جان کہا جاتا ہے، ان کے یہاں اس قدر دل کش اور معتدل انداز میں پائی جاتی ہے کہ اس کی مثال اس دور کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔''

حسرتؔ نے اسی رنگِ تغزّل کو اپنایا اور بامِ عروج تک پہنچا دیا اور غزل کی گرتی ہوئی ساکھ کو نیا وقار عطا کیا۔ اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ حسرتؔ نے اردو غزل کا احیا کر دیا۔ بقولِ مجنوں گورکھ پوری:

''بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی اردو شاعری میں ایک نیا رجحان پیدا ہو گیا۔ آزاد خیال اور تربیت یافتہ نوجوانوں کی ایک جماعت یہ دیکھ کر کہ غزل کی ناؤ اب ڈوبنا چاہتی ہے، اس فکر میں ہوئی کہ اس کو بچا کر نئے اور صاف ستھرے دھارے پر لگا دیا جائے تاکہ وہ سلامتی کے کنارے پر پہنچ کر اپنی بقا اور ترقّی کے نئے سامان مہیّا کر سکے۔ اس جماعت کے امام حسرتؔ موہانی تھے۔ انہوں نے مرتی ہوئی غزل کو نہ صرف از سرِ نو زندہ کیا بلکہ اس کو نیا وقار اور نئی جہت دی۔''

حسرتؔ کو غزل کی صالح روایات، اس کی قوّتِ تسخیر اور اس کے بے شمار امکانات پر کامل یقین تھا۔ انہیں احساس تھا کہ غزل اس عہد میں بھی اپنے اشاروں کی بلاغت اور علامتوں کی معنی آفرینی کی وجہ سے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حسرتؔ نے اپنے تنقیدی خیالات کے ذریعے غزل کی افادیت اور اہمیت واضح کی۔ غزل میں انقلابی اصلاحات کر کے اسے ایک پُروقار لب ولہجہ عطا کیا اور اس کی ساکھ کو دوبارہ بحال کیا۔ ان کی غزلیں ان کے خیالات کا عملی ثبوت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسرتؔ کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس گھٹن اور اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا جو بہت سے قدیم شاعروں کو پڑھتے ہوئے ہوتا ہے۔

حسرتؔ نے غزل گوئی کے میدان کے متقدّمین کو یکسر نظر انداز نہیں کر دیا۔ تسلیمؔ کے شاگرد ہونے کے باوجود انہوں نے تمام قدیم شعرا کے کلام سے استفادہ کیا اور ان کے فن کی بہترین خوبیوں کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے حسرتؔ کہتے ہیں:

شیرینیِ تسلیمؔ ہے، سوز و گدازِ میرؔ — حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام
طبعِ حسرتؔ نے اٹھایا ہر اک استاد سے فیض — غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و تسلیمؔ و مومنؔ

حسرتؔ کا یہ اعتراف برحق ہے۔ ان کی غزلوں میں مصحفیؔ، مومنؔ اور میرؔ کے خیالات اور لب ولہجے کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر مصحفیؔ کی غزلوں کا احساس، رنگ اور نشاط آمیز کسک کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے لیکن اساتذۂ سخن سے استفادہ کرنے اور رنگِ سخن کا تتبع کرنے کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ حسرتؔ کی شاعری میں قدیم شعرا کی صدائے بازگشت ہے اور اس میں اپج اور انفرادیت مفقود

ہے۔ بلاشبہ حسرتؔ کی اپنی شاعری میں قدیم شعرا کی گونج سنائی دیتی ہے لیکن یہ گونج اس آواز کو دبانے میں کامیاب نہیں ہو پاتی جو کہ ان کی اپنی منفرد آواز ہے۔ مجنوںؔ گورکھپوری اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حسرتؔ کے اندر بڑی شدید اور واضح انفرادیت بھی ہے، یعنی استادوں سے جو کچھ لیا اس کو اپنے رنگ میں (جو خود بھی بہت تیز تھا) رنگ لیا۔''

ایک اور تحریر میں اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اصلی مزاج اور اندرونی کیفیت کے لحاظ سے حسرتؔ کا ہر شعر چاہے وہ میرؔ و دردؔ کی یاد دلائے، چاہے غالبؔ، و مومنؔ، چاہے جرأتؔ و مصحفیؔ کی، اپنے اندر ایک شدید انفرادیت رکھتا ہے جس کو ہم حسرتؔ سے منسوب کرسکتے ہیں۔''

بیش تر غزل گو شاعروں کے مانند اور غزل کی عام روایت کے مطابق حسرتؔ کی شاعری میں بھی مرکزیت، موضوعاتِ حسن و عشق کو حاصل ہے۔ لیکن ان کا تصوّرِ عشق قدیم غزل گو شعرا سے یکسر مختلف ہے۔ ان کا عشق رسمی یا کسی بیمار ذہن کا عشق نہیں ہے بلکہ ایک صحت مند ذہن کا عشق ہے، جس کا اظہار غزل کی قدیم روایات کو نبھانے کے لئے نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اسے زندگی کی ایک حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان کا عشق واضح طور پر ارضی اور مادّی ہے۔ جس میں جنس کی مہک اور جسم کی خوشبو ہے۔ لیکن ان کا عشق لکھنوی شعرا کی طرح جنسی تلذّذ اور ابتذال کی حدوں میں داخل نہیں ہوتا۔ حسرتؔ کی فطری شرافت اور مشرقیت ان کے عشق کو ایک نوع کی معصومیت و پاکیزگی عطا کرتی ہے۔ جس سے ان کے یہاں جسم کی پکار کے ساتھ روح کی آواز بھی ہم آہنگ ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے خارجی بیانات اور حسن کی مختلف کیفیات کی مصوّری ہمارے ذہن میں وہ گھٹن پیدا نہیں کرتی جیسا کہ جرأتؔ کے شعروں کو پڑھتے ہوئے ہوتی ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار جن میں عشق کی معصومیت، پاکیزہ محبت اور بھولے پن کی ایسی تصویریں پیش کی گئی ہیں جس کی مثال اردو غزل میں کم ہی نظر آتی ہیں:

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حُسن آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے ہم نے اس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

سوتے میں جو دیکھا تھا رُخِ یار کا عالم آنکھوں میں یہ خنکی ہے اُسی نور سحر کی

دلِ بے تاب کی بے تابیاں ہم سے یہ کہتی ہیں ذرا ہم بھی تو دیکھیں آپ کی شوخی کہاں تک ہے

یہ اشعار ہمیں اس لئے متاثر کرتے ہیں کہ ان میں نہ تو ماروائی عشق کا بیان ہے اور نہ ہی کسی ایسے معشوق کا تذکرہ ہے جو ہماری دنیا کے علاوہ کسی اور دنیا کی مخلوق ہو۔ مزید یہ کہ حسرتؔ حُسن و عشق کی نفسیات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ بھری محفل میں آہستہ سے ہاتھ دبا دینے یا راستے میں ملنے پر ہونٹ کاٹنے کا تذکرہ وہی شاعر کرسکتا ہے جو عشق کے تجربات سے خود گزرا ہو، جو حسن کے جلوۂ صد رنگ کو آنکھوں کے دریچوں سے دل کی وادی میں تاڑ لینے کا ہنر جانتا ہو اور جو عشق کی گرمی اور اس کی کسک کو زندگی سے لے کر شعری ڈھانچے میں ڈھالنے کے ہنر سے واقف ہو۔ جو زندگی کے معمولی تجربات کو اپنے فن میں ڈھالنے کی ایسی صلاحیت رکھتا ہو کہ اشعار میں ایک نوع کی ہمہ گیری اور دلوں میں اترنے اور گھلنے والی خوبیاں پیدا ہوسکیں۔ مثلاً یہ اشعار پڑھیے:

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جایئے — بندہ پرور! جایئے، اچھا خفا ہو جایئے

راہ میں ملیے کبھی مجھ سے تو از راہِ ستم — ہونٹ اپنا کاٹ کر مجھ سے جدا ہو جایئے

سر کہیں ، بال کہیں ، ہاتھ کہیں ، پاؤں کہیں — ان کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو

زلفِ شب رنگ پہ گُل نار لباسی کی بہار — آج حسرتؔ نے رُخِ یار میں کیا کیا دیکھا

رنگ سونے میں چمکتا ہے طرح داری کا — طرفہ عالم ہے ترے حُسن کی بیداری کا

حسرتؔ کی غزلوں میں غم کشی اور حرماں نصیبی کے بجائے ایک رجائیہ اورنشاطیہ لہر واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔دراصل حسرتؔ کو زندگی کے روشن امکانات پر اعتماد تھا۔اس لئے ان کی زندگی اور شاعری میں مایوسی کے بجائے ایک طربیہ اورنشاطیہ آہنگ اور زندگی کی راہ میں پیش آنے والی مصیبتوں پر اظہارِ رنج والم کے بجائے تبسّم کی چاندنی چھٹکی ہوئی نظر آتی ہے۔یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

شکرِ الطاف نہیں ، شکوۂ بے داد نہیں — کچھ ہمیں تیری تمنّا کے سوا یاد نہیں

اپنا سا شوق اَوروں میں لائیں کہاں سے ہم — گھبرا گئے ہیں بے دلیِ ہمرہاں سے ہم

میں ہوں وہ رضا جو کہ طبیعت مری حسرتؔ — ناکامیِ جاوید سے بھی شاد رہے گی

حسرتؔ کی عملی زندگی کے پس منظر میں ان کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کی غزلوں میں سیاسی افکار کی جھلک بہت کم نظر آتی ہے اور غمِ جاناں کے مقابلے غمِ دوراں کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔لیکن جہاں کہیں حسرتؔ نے اپنے سیاسی افکار پیش کرنے کی کوشش کی ہے، وہاں جذبات کی شدّت ،عزمِ محکم اور عشقِ غیر مصلحت آمیز کی کارفرمائیاں ہم پر ایک دیرپا تاثر چھوڑ جاتی ہے۔نیز جہاں کہیں انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے رموز وعلائم کا سہارا لیا ہے وہاں یہ اثر انگیزی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ حسرتؔ کے ان رموز وعلائم کے پسِ پشت ایک وسیع پس منظر موجود ہے۔درج ذیل اشعار دیکھیں:

کیا سمجھتا ہے اسیرانِ قفس کو صیّاد — دل ہلا دیں جو کبھی درد سے فریاد کریں

نظر میں پھر گئیں کیفیتیں سب عہدِ ساقی کی — بھر آئے اشکِ خوں نظارۂ مینائے خالی سے

انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار — ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں — پھیلے گی یوں ہی سوزشِ حُبِّ وطن تمام

حسرتؔ کی غزلوں کی کامیابی کا راز صرف ان کے موضوعات، جذبے کی صداقت اور خلوص وسادگی میں ہی مضمر نہیں بلکہ اس میں بڑی حد تک ان کے لب ولہجے کا بھی ہاتھ ہے۔جس میں ایک کلاسیکی رچاؤ اور ان قدیم شعرا کی آواز کی گونج موجود ہے۔قدیم شعرا سے استفادہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھنؤ اور دہلی دونوں دبستانوں کے شعرا کی فنّی خوبیوں کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے جیسا کہ وہ اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرتؔ نام روشن شاعری کا ہو گیا

حسرتؔ نے دہلی اور لکھنؤ شاعری کے صرف صحت مند عناصر کو اپنی غزلوں میں سمویا ہے۔ انہوں نے لکھنؤ کے شعرا سے زبان کا لوچ اور نرمی و لطافت لی۔ لفظی بازی گری اور بے جا تکلف و تصنع سے احتراز کیا۔ اسی طرح دبستانِ دہلی کے شعرا سے جذبے کی گرمی اور ان کے خلوص و صداقت کے اثرات قبول کیے۔ لیکن ان کے لہجے کی مایوسی سے اپنی غزلوں کو محفوظ رکھا۔ دونوں دبستانوں کے مثبت عناصر کے امتزاج سے ان کی غزلوں میں ایسا فنی رچاؤ، سادگی و پُرکاری، شادابی، نشاطیہ کیفیت اور طرزِ ادا کی ایسی حسن کاری آ گئی ہے جس نے ان کی غزلوں اور اسلوب کو منفرد بنا دیا ہے۔ اثرؔ لکھنوی کے لفظوں میں:

> ''حسرتؔ کی شاعری میں لکھنؤ کی زبان اور متقدمین و متوسطین شعراے دہلی کے تخیل کا بہترین امتزاج ہے۔''

اور بقولِ نیاز فتح پوری:

> ''حسرتؔ کی غزل کا نرم و لطیف اندازِ بیان، الفاظ کی شیرینی، فارسی ترکیبوں کی حلاوت اور متوازن خیالات سے پیدا ہونے والی ہم آہنگی، یہ سب مل کر کچھ ایسی چیزیں بن جاتی ہیں جو ہمیں اس وقت کسی اور کے کلام میں نہیں ملتیں۔''

کلاسیکی شعرا کے مطالعے کے ساتھ ساتھ حسرتؔ کے احساسِ جمال اور ان کی تخلیقی قوت نے انہیں قدیم الفاظ و تراکیب ہی پر اکتفا کرنے نہیں دیا بلکہ انہوں نے بہت سی ایسی ترکیبیں بھی تراشیں جو اردو شاعری میں رائج ہو گئیں اور بہت سی تراکیب استعارات و تشبیہات نئے انداز میں استعمال کیں کہ ان کی معنویت دو چند ہو گئی۔ حسرتؔ کی انتخابی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ان کی اس تخلیقی قوت نے ان کی غزلوں کو کلاسیکی حیثیت کے ساتھ ساتھ شاعری کے نئے رجحانات اور نئے زاویوں کا نقیب بنا دیا۔ آل احمد سرورؔ کے لفظوں میں:

> ''حسرتؔ نہ صرف ایک قدیم روایتِ عظمیٰ کی آخری یادگار ہیں بلکہ اردو غزل میں برائے نام جو کچھ نئی تحریک کے اثر پائے جاتے ہیں اس کے موجد یہی ہیں۔ اردو غزل کی نئی نسل کی ابتدا حسرتؔ سے ہی ہوتی ہے۔ حسرتؔ اردو غزل کی تاریخ کے درمیان ایک عبوری حیثیت رکھتے ہیں۔''

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۱﴾ حسرتؔ کی غزلوں کی فضا مایوسانہ ہے یا نشاطیہ؟

﴿۱۲﴾ حسرتؔ کے چند اشعار ایسے لکھیے جن میں محبوب کے ناز و انداز کا ذکر ہو۔

﴿۱۳﴾ حسرتؔ کے چند اشعار ایسے لکھیے جن سے ان کی وطن دوستی، اسیری، اور انگریزوں کے ظلم و ستم کا اندازہ ہوتا ہو۔

﴿۱۴﴾ حسرتؔ کی غزلوں میں مرکزیت کس موضوع کو حاصل ہے؟

﴿۱۵﴾ حسرتؔ شاعری میں کس کے شاگرد تھے؟

﴿۱۶﴾ حسرتؔ نے کس غزل گو شاعر کے رنگ کو اپنایا؟

08.05 حسرؔت موہانی کی پہلی غزل

﴿۱﴾

﴿۱﴾ نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے؟

﴿۲﴾ دلوں کو فکرِ دوعالم سے کردیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دارز کرے

﴿۳﴾ خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

﴿۴﴾ ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالبًا یوں بھی
مجھے تو شاملِ اربابِ امتیاز کرے

﴿۵﴾ ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرؔت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

08.06 حسرؔت موہانی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ اس غزل کی سلاست اور سادگی قابلِ ذکر ہے۔ باعتبارِ موضوع یہ غزل عشق اور عشق کی وجہ سے پیدا ہونے والی مختلف کیفیات ، احساسات اور افکار کا احاطہ کرتی ہے۔ واضح رہے کہ عشق کو صوفیانہ مسلک میں خاص مقام حاصل ہے اور حسرؔت ایک صوفی خانوادے سے بیعت تھے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: ناز بھری نگاہیں یعنی محبوب کی نگاہیں جسے اپنے راز سے آشنا کریں، ایسا شخص اپنی خوش بختی پر کیوں نہ ناز کرے۔ واضح رہے کہ آشنائے راز یا راز میں اسی کو شریک کیا جاتا ہے جس سے تعلّقِ خاطر ہو۔ گویا شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ جس پر اس کے محبوب کی نگاہِ التفات ہو، جس کو محبوب کے محرمِ راز ہونے کا شرف حاصل ہو اس کا اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہونا بجا ہے۔

دوسرا شعر: محبوب کی محبت (جو اپنی شدّت کی وجہ سے جنون کی حد میں داخل ہوگئی تھی) نے ہمیں دونوں جہان کی فکر سے آزاد کر دیا۔ خدا کرے کہ تیرے جنون کا یہ سلسلہ یعنی تیری محبت کی شدّت میں مزید اضافہ ہوتا چلا جائے اور محبت کی یہ شدّت تا دیر قائم رہے۔

تیسرا شعر: محبوب کے حسن کی کرشمہ سازی یعنی بے مثال حسن کی وجہ سے خرد یعنی دانائی اور عقل مندی کا نام جنون اور جنون کا نام خرد پڑ گیا ہے۔ یعنی محبوب کے بے مثال حسن کی وجہ سے میں جنونِ عشق میں مبتلا ہوگیا اور عشق کرنا عین دانائی اور عقل مندی ہے۔ جب کہ لوگ عشق کو جنون اور دیوانگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا لوگوں کی نظر میں عشق جنون اور دیوانگی ہے اور شاعر کے نزدیک عقل مندی ہے۔

چوتھا شعر: محبوب کے ظلم وستم سے میں اس لئے خوش ہوں کہ مسلسل ظلم وستم برداشت کرنے کی وجہ سے کسی روز تو محبوب کو میرے اُوپر ترس آجائے گا اور وہ مجھے بھی اربابِ امتیاز یعنی اپنے خاص لوگوں میں شامل کرلے گا۔

پانچواں شعر: گرچہ میں تیری نگاہِ کرم اور عنایتوں کا مستحق نہیں ہوں پھر بھی اگر تو چاہے تو مجھے کامیابی سے ہم کنار کردے۔ گویا یہ شعر ذاتِ باری تعالیٰ کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ اگر چہ اپنے گناہوں کی وجہ سے میں تیری نوازشوں کا مستحق نہیں ہوں لیکن چوں کہ تو معاف کرنے والا ہے لہٰذا تیری ذات سے امیدیں رکھنا غلط نہیں ہے۔ میری غلطیوں کے باوجود اگر تو چاہے تو میری کوتاہیوں سے درگزر کرکے کامیابی وکامرانی سے ہم کنار کرسکتا ہے۔ وہیں اس شعر میں لفظ ''تو'' کا مرجع محبوب بھی ہوسکتا ہے۔ واضح رہے کہ ایک ہی شعر میں متعدّد معانی کے امکانات شعر کا حُسن تصوّر کیے جاتے ہیں۔

08.07 حسرتؔ موہانی کی دوسری غزل

﴿۲﴾

﴿۱﴾ بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

﴿۲﴾ نہ چھیڑ اے ہم نشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

﴿۳﴾ رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی!
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکّر یاد آتے ہیں

﴿۴﴾ نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

﴿۵﴾ حقیقت کھل گئی حسرتؔ! ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

08.08 حسرتؔ موہانی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔اس غزل کی سادگی نہ صرف زبان کی سطح تک محدود ہے بلکہ فکر و خیال کی معصومیت بھی قابلِ ذِکر ہے۔ پچھلی غزل کی مانند یہاں بھی عشق اور اس سے گہری وابستگی شاعر کی فکر کا مرکز و محور ہے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: میں اپنے محبوب کو بھلانے کی کوشش کرتا ہوں پھر بھی اس کی یاد میرا دامن نہیں چھوڑتی۔ الٰہی! ترکِ محبت کے باوجود اس کی یاد میرے دل سے کیوں نہیں جاتی۔ یعنی محبت اور ترکِ محبت میں شعور کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ شاعر نے شعوری طور پر ترکِ محبت کا تہیّہ کر لیا لیکن جذبۂ محبت کی صداقت کی وجہ سے ترکِ محبت میں کامیاب نہیں ہوتا۔

دوسرا شعر: اے دوست! شرابِ صبح کی لذّت و کیفیت کے افسانے مت چھیڑ! کیوں کہ تیرے ان افسانوں کی وجہ سے میرے اندر وہ یادیں تازہ ہو جاتی ہیں جب میں شرابِ بے خودی سے مخمور تھا۔

تیسرا شعر: وائے حسرت، وائے ناکامی! آج کل ہم ہوش کی قید میں رہتے ہیں، یعنی ان دنوں ہمارے اوپر محبت کا جنون طاری نہیں ہے۔ ہوش و حواس کی حالت میں ہمیں وہ دشتِ خود فراموشی یعنی جنونِ عشق اور راہِ عشق کی سرمستی یاد آتی ہے۔

چوتھا شعر: جب محبوب کی یاد نہیں آتی تو برسوں نہیں آتی، لیکن جب کبھی ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے تو ان کی یاد اکثر آتی رہتی ہے۔

پانچواں شعر: اے حسرتؔ! تمہارے ترکِ محبت کی حقیقت کھل گئی اس لئے کہ ترکِ محبت کے بعد اس کی یاد اب پہلے سے کہیں زیادہ آتی ہے۔ یعنی جذبۂ محبت اس قدر بے لوث ہے کہ ترکِ محبت کی شعوری کوشش کے بعد محبوب اور بھی زیادہ یاد آنے لگا ہے۔

08.09 خلاصہ

ممتاز شاعر و ادیب، بے باک صحافی، محبِ وطن اور سیاست داں حسرتؔ موہانی کی پیدائش موہان میں ۱۸۸۱ء کے قریب ہوئی۔ انہوں نے ایک رسالہ ''اردوئے معلّٰی'' اور ایک روزنامہ اخبار ''مستقل'' کان پور سے جاری کیے۔ تحریکِ آزادی کی حمایت اور حُبُّ الوطنی کی وجہ سے انہیں جیل کی مشقّتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن سزائے قید کے باوجود نہ تو انہوں نے سیاست سے توبہ کی اور نہ ہی شعر و ادب سے کنارہ کشی اختیار کی۔ انہوں نے غزلوں کے علاوہ شعرا کے تذکرے مرتّب کیے۔ شاعری کے رموز و نکات پر ''نکاتِ سخن'' لکھی اور بہت سارے ادبی، سیاسی اور معاشرتی مضامین لکھے۔ اردو غزل کو ان کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے دبستانِ دہلی اور دبستان لکھنؤ کے مثبت عناصر کو باہم ملا کر اپنی غزلوں کا خمیر تیار کیا اور وہ غزل جس کو ناقابلِ اعتنا سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا تھا، اس کو پھر سے مقبول بنا دیا۔

08.10 فرہنگ

لفظ		معنی
ابتذال	:	اخلاقی پستی، ہلکا پن
احیا	:	دوبارہ زندہ کرنا
احتراز کرنا	:	بچنا
استقلال	:	استحکام، مضبوطی، مستقل مزاجی
اسیری	:	قید
اعتراف	:	اقرار
تبسّم	:	مسکراہٹ
تشکیل پانا	:	بننا
جبرواستبداد	:	ظلم وستم
جرعہ	:	گھونٹ
جزوی آزادی	:	ادھوری آزادی
جور	:	ظلم
جہت	:	سمت
حرماں نصیبی	:	بدقسمتی
حریت	:	آزادی
حق گوئی	:	سچ بولنا
دراز کرنا	:	لمبا کرنا، طویل کرنا
دستور ساز	:	قانون بنانے والی
دواوین	:	دیوان کی جمع
راست گوئی	:	سچ بولنا
رجائیہ	:	امید والی
زنداں	:	جیل خانہ
ذرائعِ معاش	:	روزی روٹی کا ذریعہ، کمائی کا ذریعہ
سرشار	:	مست، نشے میں چوُر، مخمور
سخن	:	شاعری، بات، کلام
شمولیت	:	شامل ہونے کا عمل
صداقت	:	سچائی
صعوبتوں	:	مشکلات
صہبا	:	شراب، صبح کی شراب
ضمیمہ	:	وہ شے جو کسی کے ساتھ بڑھا کر لگائی جائے اخبار ورسائل کے اضافی صفحات
عالَم	:	دنیا، کیفیت
عروج	:	بلندی
فزوں تر	:	زیادہ ہونا، اضافہ ہونا
فکر، جمع افکار	:	غور، سمجھ
قوّتِ تسخیر	:	مسخر کرنے کی طاقت
کنارہ کشی اختیار کرنا	:	دوری اختیار کرنا
گراں قدر	:	قیمتی
مترادف	:	ہم معنی
متروکات	:	ترک کیے ہوئے
متقدمین	:	متقدّم کی جمع، اگلے زمانے کے
مضمر	:	پوشیدہ، چھپا ہوا
معائب	:	خامیاں، کمیاں
معتدل	:	درمیانی درجے کا، متوسط
منفرد	:	علیحدہ، اکیلا، نمایاں
موجد	:	ایجاد کرنے والا
مینا	:	صراحی
نشاط	:	خوشی
نوع	:	قسم
وسعت	:	پھیلاؤ
ہم آہنگ ہونا	:	مل جانا

08.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰۔۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : حسرتؔ موہانی کی مختصر سوانح لکھیے۔

سوال نمبر۲ : حسرتؔ موہانی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰۔۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : حسرتؔ موہانی پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۲ : حسرتؔ موہانی کی غزل گوئی پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

08.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ حسرتؔ موہانی	از	عبدالشکور
۲۔ حسرتؔ موہانی، حیات اور کارنامے	از	ڈاکٹر احمر لاری

08.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ حسرتؔ موہانی کا پورا نام ''سیّد فضل الحسن'' اور تخلّص ''حسرتؔ'' تھا۔

﴿۲﴾ حسرتؔ کی پیدائش ضلع اناؤ، اتر پردیش کے قصبہ ''موہان'' میں ہوئی تھی۔

﴿۳﴾ حسرتؔ نعرۂ حرّیت بلند کرنے کے جرم میں علی گڑھ کالج سے نکالے گئے تھے۔

﴿۴﴾ ماہنامہ ''اردوئے معلّٰی''

﴿۵﴾ روز نامہ ''مستقل''

﴿۶﴾ حسرتؔ کے رسالے نے ہندوستانیوں میں سیاسی فہم پیدا کی اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے تحریک آزادی اور کانگریس میں شمولیت کی راہ ہموار کی۔

﴿۷﴾ ''انتخابِ سخن'' کی سلسلے وار اشاعت ''اردوئے معلّٰی'' میں عمل میں آئی۔

﴿۸﴾ مولانا حسرتؔ موہانی کے روزنامہ کا نام ''مستقبل'' تھا، جس کو انہوں نے کان پور سے جاری کیا۔

﴿۹﴾ ''مشاہداتِ زنداں'' کے مصنّف حسرتؔ موہانی ہیں۔

﴿۱۰﴾ ''مشاہداتِ زنداں'' ایک طرح سے حسرتؔ موہانی کی آپ بیتی ہے۔ جیلوں میں قید ہندوستانیوں پر انگریزوں کے مظالم بطورِ خاص اس کتاب کا موضوع ہیں۔

﴿۱۱﴾ حسرتؔ کی غزلوں کی فضا نشاطیہ ہے۔

﴿۱۲﴾ سوتے میں جو دیکھا تھا رخِ یار کا عالم — آنکھوں میں یہ خنکی ہے اسی نورِ سحر کی
رنگ سونے میں چمکتا ہے طرح داری کا — طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

﴿۱۳﴾ اچّھا ہے اہلِ زور کیے جائیں سختیاں — پھیلے گی یوں ہی سوزشِ حبِّ وطن تمام
کیا سمجھتا ہے اسیرانِ قفس کو صیّاد — دل ہلا دیں جو کبھی درد سے فریاد کریں

﴿۱۴﴾ حسرتؔ کی غزلوں میں موضوعاتِ حسن وعشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے لیکن ان کا تصوّرِ عشق قدیم غزل گو شعرا کے عشق سے یکسر مختلف ہے۔

﴿۱۵﴾ حسرتؔ شاعری میں نسیمؔ کے شاگرد تھے۔

﴿۱۶﴾ ابتدا میں اگر چہ حسرتؔ نے شادؔ عظیم آبادی کے رنگِ تغزّل کو اپنایا، تاہم انہوں نے تمام اساتذۂ کلام کے مثبت پہلوؤں سے استفادہ کیا جس کا اقرار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

شیرینیِ نسیمؔ ہے ، سوز و گدازِ میرؔ
حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

☆

غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومن
طبعِ حسرتؔ نے اٹھایا ہر اک استاد سے فیض

اکائی 09 : عزیزؔ لکھنوی

ساخت

09.01 : اغراض ومقاصد
09.02 : تمہید
09.03 : عزیزؔ لکھنوی کے حالاتِ زندگی
09.04 : عزیزؔ لکھنوی کی شاعرانہ خصوصیات
09.05 : عزیزؔ لکھنوی کی پہلی غزل
09.06 : عزیزؔ لکھنوی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
09.07 : عزیزؔ لکھنوی کی دوسری غزل
09.08 : عزیزؔ لکھنوی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
09.09 : خلاصہ
09.10 : فرہنگ
09.11 : نمونہ امتحانی سوالات
09.12 : حوالہ جاتی کتب
09.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

09.01 اغراض ومقاصد

ادب، زندگی اور تہذیب کا عکّاس ہوتا ہے۔ یہ خارجی حقیقتوں کو داخلی آئینوں میں پیش کرتا ہے۔ ادب میں انسانی زندگی کی تصویر اس طرح پیش کی جاتی ہے کہ اس میں انسانی جذبات واحساسات کے ساتھ ساتھ مشاہدات، تجربات اور خیالات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ شاعر یا ادیب کا تعلّق سماج اور کسی ایک ملک سے ضرور ہوتا ہے لہٰذا اس سماج کی رسموں اور تہذیب کا اثر لازم ہے کہ ادب پر پڑے۔ چوں کہ شاعری بھی اظہار کا ایک ذریعہ ہے اس لئے طلبا میں اس کا ذوق وشعور پیدا کرنے اور ان میں شعرفہمی کا ذوق ابھارنے کے لئے شاعری کا درس دیا جاتا ہے۔ اس کے مطالعے سے طلبا میں نہ صرف شعری ذوق پیدا ہوتا ہے بلکہ اس میں اپنی تہذیب اور زبان سے ایک لگاؤ پیدا ہوتا ہے ساتھ ہی وہ زبان کی باریکیوں، لفظوں کے رکھ رکھاؤ اور شعری محاسن سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔

دبستانِ لکھنؤ کی خدمات اردو شاعری کے تعلّق سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ خامیوں کے ساتھ ساتھ خوبیاں بھی ہیں۔ ان خامیوں سے قطعِ نظر اس کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو اردو زبان کبھی فراموش نہیں کرسکتی اور وہ ہے اصلاحِ زبان۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ

میرؔ اور سوداؔ کے زمانے میں زبان کی اصلاح کا کافی کام ہوا تھا۔اس کے باوجود بہت سے نامانوس الفاظ کا استعمال ہو رہا تھا۔ان سب کی اصلاح کا سہرا ناسخؔ کے سر ہے۔انہوں نے زبان کے قاعدے مقرّر کیے اور ان پر خود بھی عمل کیا اور شاگردوں کو بھی ان پر کاربند رہنے کی ہدایت کی۔یہی وجہ ہے کہ لکھنوی دبستان کے شعرا کی زبان نہایت صاف ستھری اور رواں ہے۔عزیزؔ لکھنوی کا تعلّق بھی اسی دبستان سے ہے۔جن کا مطالعہ ہم یہاں کر رہے ہیں۔لہٰذا اس اکائی کے مطالعے سے آپ دبستانِ لکھنؤ کی شعری خصوصیات سے بالواسطہ طور پر واقف ہو جائیں گے۔کیوں کہ عزیزؔ لکھنوی کے کلام میں اس دبستان کے شعری معیارات کی پاس داری مکمّل طور پر نظر آتی ہے۔اس کے ساتھ ہی بحیثیت ایک شاعر عزیزؔ لکھنوی کا کیا مقام و مرتبہ ہے،اس سے بھی آپ روشناس ہوں گے۔کیوں کہ ہر شاعر کی اپنی طبعی و فطری جہت بھی ہوتی ہے۔وہ کسی خاص صف میں شامل ہونے کے باوجود اپنا انفرادی آہنگ بھی رکھتا ہے۔

09.02 تمہید

شاعری وفورِ جذبات کے بے اختیار بہہ نکلنے کا نام بھی ہے۔یہ زندگی اور حالات کی روشن تفسیر بھی ہے اور تفریحِ طبع کا سامان بھی۔یہ ہمارے کانوں میں رس نہیں گھولتی بلکہ دلوں پر اثر انداز ہو کر فکر و احساس کو ایک خوش گوار کیفیت بھی عطا کرتی ہے۔ادب حقیقتاً زندگی اور تہذیب کا عکّاس ہوتا ہے اور اس میں خارجی حقیقتوں کو داخلی آئینے میں پیش کیا جاتا ہے۔اس میں انسانی زندگی کی تصویر اس طرح پیش کی جاتی ہے کہ اس میں انسانی جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ مشاہدات و تجربات اور خیالات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

اردو شاعری کی سب سے مقبول صنفِ سخن کا نام غزل ہے۔غزل جسے کبھی اردو شاعری کی آبرو کہا گیا تو کبھی ناپاک دفتر مگر اس نے ہمیشہ وقت کا ساتھ دیا اور وقت نے ہی ثابت کیا کہ جو خوبی غزل میں ہے وہ دوسری کسی صنفِ شاعری میں نہیں۔بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جب غزل کو ترقّی پسندوں نے تنقید کا نشانہ بنایا تو حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ گونڈوی اور جگرؔ مرادآبادی نے اسے ایک نئی قوّت عطا کی۔عزیزؔ لکھنوی کا تعلّق اسی عہد سے ہے۔آیئے! دیکھتے ہیں کہ انہوں نے غزل کی آب یاری کہاں تک کی۔

09.03 عزیزؔ لکھنوی کے حالاتِ زندگی

عزیزؔ لکھنوی کا پورا نام محمد ہادی اور تخلّص عزیزؔ ہے۔ان کی ولادت ۱۸۸۲ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ان کے اجداد کا وطن شیراز (ایران) تھا۔علم و فضل خاندان میں موروثی تھا۔عزیزؔ کی عمر ابھی سات سال کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا لیکن فطری شوق نے علم حاصل کرنے سے مُنہ نہ موڑنے دیا اور مطالعے کا شوق ہمیشہ قائم رہا۔اساتذہ کے دواوین اور کتب سے ان کی شاعری کا ذوق پروان چڑھتا رہا۔غالباً طالبِ علمی کے زمانے سے ہی شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔شاعری کی ابتدا فارسی سے ہوئی مگر بہت جلد اردو میں شعر کہنے لگے اور اصلاحِ سخن کے لئے صفیؔ لکھنوی سے مشورہ کرتے تھے اور بہت ہی کم عرصے میں ان کے شاگردوں میں اپنی ایک خاص جگہ بنالی۔عزیزؔ لکھنوی کا شمار اردو کے ان چند شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے جدید دور میں غزل کی نوک پلک سنوارنے کی کوششیں کیں۔ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ''گل کدہ'' کے عنوان سے ۱۹۱۹ء میں پہلی بار اور ۱۹۳۱ء میں تیسری بار شائع ہوا۔۱۹۱۹ء کے بعد کی تخلیقات ان کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔اس کے علاوہ ''انجم کدہ'' اور ''قصائدِ عزیز'' ان کے دو مجموعے اور شائع ہوئے۔عزیزؔ لکھنوی نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔قصیدہ گوئی میں بھی ان کا پایہ کافی بلند ہے لیکن ان کی اصل قدر و منزلت غزلوں کی وجہ سے ہی ہے۔علّامہ اقبالؔ ''گل کدہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں آپ کے کلام کو ہمیشہ بہ نظرِ استفادہ دیکھتا ہوں

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

سبحان اللہ یہ بات ہر کسی کو نصیب نہیں! موجودہ ادبیات میں اردو کی نظر حقائق پر ہے اور یہ مجموعۂ غزلیات اس نئی تحریک کا بہترین ثبوت ہے۔'' (گل کدہ۔ص ۱۲،۱۹۳۱ء)

عزیزؔ لکھنوی کے مراسم مرزا محمد عبّاس علی خاں جگرؔ سے بڑے خاص تھے۔ یہ ڈپٹی کمشنر اور رئیسِ اعظم لکھنؤ تھے۔ سات آٹھ سال تک ان کے معتمد خاص رہے اور جگرؔ کو اصلاحِ سخن دیتے رہے۔ اس کے بعد امین آباد ہائی اسکول میں فارسی مدرّس کے طور پر فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۲۸ء میں راجہ صاحب محمود آباد نے طلب کر لیا اور ولی عہد کا استاد مقرّر کر دیا۔ اس طرح زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے اردو ادب کا یہ ستارہ ۱۹۳۵ء میں غروب ہو گیا۔

ویسے تو ان کے شاگردوں کی تعداد کافی ہے مگر ان کے مخصوص شاگردوں میں مرزا جعفر علی خاں اثرؔ، شبّیر حسن خاں جوشؔ، جگت موہن لال رواںؔ اور حکیم سیّد علی آشفتہؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ عزیزؔ لکھنوی کا اصل نام کیا تھا؟

﴿۲﴾ عزیزؔ کے استادِ گرامی کون تھے؟

﴿۳﴾ عزیزؔ کے پہلے شعری مجموعے کا نام بتایئے؟

09.04 عزیزؔ لکھنوی کی شاعرانہ خصوصیات

جس طرح ہر شخص کا ایک فطری میلان ہوتا ہے اسی طرح شاعر کا بھی ہوتا ہے۔ کسی کو تخّیل آفرینی سے لگاؤ ہوتا ہے، کسی کو معنی آفرینی سے۔ اسی طرح کسی کو فلسفہ سے شغف ہے تو کسی کو سادگی و پرکاری یا استفہام سے، لیکن یہ کبھی ضروری نہیں ہے کہ شاعر اپنے آپ کو کسی ایک دائرے تک محدود رکھے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ طبیعت کا جھکاؤ جس طرف ہوتا ہے، رفتہ رفتہ وہ رنگ غالب ہونے لگتا ہے۔ یہی خاص رنگ آگے چل کر شاعر کی انفرادیت قائم کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

عزیزؔ نے غزل، مرثیہ، قصیدہ، رباعی اور نظم میں اپنی شاعری کے جوہر دکھلائے۔ ان کے قصائد کا مجموعہ ''صحیفۂ وِلا'' اور ادبی و اصلاحی ،قومی و مذہبی نظموں کا مجموعہ ''نالۂ جرس'' ہے۔ اس سے ان کی جولانیِ طبیعت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ''گل کدہ'' اور ''انجمن کدہ'' کے مطالعے سے پہلی نظر میں جو بات ذہن میں آتی ہے۔ وہ ہے غالبؔ کا اثر۔ اس لئے سب سے پہلے اسی رنگ کی بات کی جاتی ہے۔

﴿۱﴾ غالبؔ کا طرز

عزیزؔ لکھنوی نے غالبؔ کے کلام کا مطالعہ خاص طور سے کیا تھا اور اسی رنگ کو اپنے لئے اختیار کیا۔ غالبؔ کی پیروی میں نہ صرف نئے مضامین، خیالات اور اسلوبِ بیان اختیار کیا بلکہ ان کی زمینوں میں کثرت سے غزلیں کہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عزیزؔ کو بھی استفہام سے کافی دل چسپی تھی۔ جو کہ غالبؔ کا ایک خاص رنگ ہے۔ ملاحظہ ہو:

شرحِ جاں کاہیِ عشق اک غیر ممکن بات ہے　　کاٹ کر لانا بہت آساں تھا جوئے شیر کا
بعد میرے ،میرا ساماں سب تبرک ہو گیا　　حلقہ حلقہ بٹ رہا ہے اب مری زنجیر کا
حسنِ بے پردہ ہے یارب! کیا ہی غیرت آفریں　　پانی پانی ہو گیا ہے آئنہ تصویر کا

☆☆☆☆☆

وہ نگاہیں کیا کہوں کیوں کر رگِ جاں ہوگئیں　　دل میں نشتر بن کے ڈوبیں اور پنہاں ہوگئیں
اک نظر گھبرا کے کی اپنی طرف اس شوخ نے　　ہستیاں جب مٹ کے اجزائے پریشاں ہوگئیں
اگر کچھ ہم کو امیدِ اثر ہوتی تو کیا ہوتا؟　　ہماری آہ کوئی کارگر ہوتی تو کیا ہوتا؟
کیے ہیں ملکِ حسن و عشق میں برپا یہ ہنگامے　　خدائی تیرے قبضے میں اگر ہوتی تو کیا ہوتا؟
کسی کے وعدے پر اتنا جو انتظار کیا　　ارے یہ کون سا دل تھا کہ اعتبار کیا

اوپر درج کیے گئے اشعار سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ عزیزؔ پر غالبؔ کا اثر بہت زیادہ تھا۔انہوں نے نہ صرف غالبؔ کا رنگ اپنانے کی کوشش کی بلکہ ان کی زمینوں میں غزلیں بھی کہی ہیں۔دیوان کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض غزلیں غالبؔ کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہیں۔عزیزؔ کا یہ خاص رنگ ہے جو ان کی شاعری پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔مرزا جعفر حسین،عزیزؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ’’عزیزؔ مرحوم تمام شعرائے سابقین میں سب سے زیادہ مرزا غالبؔ سے متاثر تھے اور ولیؔ کے رنگِ سخن کو قبول کرنے کی انہوں نے کامیاب کوشش کی۔‘‘

﴿۲﴾ تخیّل آفرینی

عزیزؔ کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں معنی آفرینی اور تخیّل آفرینی کا ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔شاعری میں ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔کہ شاعر کوئی نیا مضمون، نیا خیال لے کر آئے۔تخلیق کار اُنہی خیالات کو جو نظم کیے جا چکے ہیں ایک نئے طرز سے نظم کر کے اپنی تخیّل آفرینی اور فکری بلندی کی داد چاہتا ہے۔اس کے لئے وہ کبھی دو مماثل چیزوں میں فرق تو کبھی دو متفرق چیزوں میں مماثلت دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔مثال کے طور پر عزیزؔ کے اشعار درج ذیل ہیں:

سوزِ غم سے اشک کا ایک ایک قطرہ جل گیا　　آگ پانی میں لگی ایسی کہ دریا جل گیا
الحذر اب دوُر مجھ سے بیٹھتا ہے چارہ گر　　زخم پر رکھنے نہ پایا تھا کہ پھاہا جل گیا
کسی نے نزع کی اس طرح گتھّیاں سلجھائیں　　سرہانے بیٹھ کے ہر سانس کا شمار کیا
آگے خدا کو علم ہے کیا جانے کیا ہوا؟　　بس ان کے رُخ سے یاد ہے اٹھنا نقاب کا

☆☆☆☆☆

اُڑے وہ طور کے پرزے گرے وہ حضرتِ موسیٰ اثر تم نے بھی دیکھا کچھ تبسّم ہائے پنہاں کا
ہر گُل میں تو ہے ، تجھ میں ہزاروں تجلّیاں دیوانہ کر دیا مجھے فصلِ بہار نے
جو یہاں محو ماسوا نہ ہوا دور اس سے کبھی خدا نہ ہوا
اک نگہ نے تیری طے کی صورتِ اُمید و بیم سارا جھگڑا مٹ گیا تدبیر اور تقدیر کا
وہی ہمارے لئے پھول ہیں تر و تازہ قفس میں خون کے آنسو اگر رُلائے بہار

﴿۲﴾ سہلِ ممتنع

اس کے علاوہ ان کے کلام کی ایک اور خصوصیت ہے وہ ہے سہلِ ممتنع۔ سہلِ ممتنع اس وقت ہوتی ہے جب شعر میں کوئی مشکل لفظ استعمال نہ کیا گیا ہو اور شعر کی نثر بنانا مشکل ہو جائے۔ عزیزؔ کی شاعری میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ ملاحظہ ہو:

تم نے چھیڑا تو کچھ کھلے ہم بھی بات پر بات یاد آتی ہے
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی اب تو دن رات یاد آتی ہے
جس کے مرنے کی ہو خوشی تم کو ایسی میّت پہ کون روتا ہے
سانس بیمار کی اکھڑتی ہے آج قصّہ تمام ہوتا ہے
اے مرا حال پوچھنے والے تجھ کو اب تک مری خبر نہ ہوئی
ہم اسی زندگی پہ مرتے ہیں جو یہاں چین سے بسر نہ ہوئی
ہجر کی رات کاٹنے والے کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی
سبق آ کے گورِ گریباں سے لے لو خموشی مدرّس ہے اس انجمن میں
دل نے اک بات نہ مانی میری مٹ گئی ہائے جوانی میری

سہلِ ممتنع کے تعلّق سے اب تک جتنے اشعار نقل کیے گئے ہیں ان سے یہ اندازہ با آسانی کیا جا سکتا ہے کہ اس قدر عام فہم زبان میں ایسے مضمون نظم کرنا آسان نہیں لیکن عزیزؔ ایسے مضمون باندھتے چلے جاتے ہیں کہ احساس نہیں ہوتا کہ اس قدر سہل زبان میں اتنے بلند مضامین کیوں کر نظم ہو سکتے ہیں۔ یہی عزیزؔ کی شاعرانہ خصوصیت ہے۔

﴿۳﴾ معنی آفرینی

شاعری کی خصوصیات کے سلسلے میں اب تک ہم نے تین خصوصیات کا ذکر کیا ہے اور اب آخر میں معنی آفرینی پر گفتگو کر کے یہ سلسلہ ختم کیا جائے گا۔ معنی آفرینی کی کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں:

جلوہ دکھلائے جو وہ اپنی خود آرائی کا
نور جل جائے ابھی چشمِ تماشائی کا
اُف! ترے حسنِ جہاں سوز کی پر زور کشش
نور سب کھینچ لیا چشمِ تماشائی کا

زمانے کے حوادث خود مری فطرت میں داخل ہیں
مصیبت دل کی کیا کم ہے بلائے آسماں کیوں ہو؟

سوزِغم سے اشک کا ایک ایک قطرہ جل گیا
آگ پانی میں لگی ایسی کہ دریا جل گیا

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

کردیا دل نے زندہ و جاوید
قیدِ ہستی سے میں رِہا نہ ہوا

بقدرِ جوش جوانی بڑھا غرور ان کا
کہ مے نے نشہ باندازۂ خمار کیا

اچھا ہوا کہ جلد یہ برباد ہو گیا
اتنے سے دل میں ساری خدائی کا درد تھا

درج بالا اشعار سے آپ کو خود ہی معنی آفرینی کی تعریف کا اندازہ ہو رہا ہوگا۔ جب شاعر لفظوں کو ایک نیا معنی دیتا ہے یا معمولی سے لفظوں سے غیر معمولی کام لیتا ہے اور قاری اس کے فن کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا تو اسے معنی آفرینی کہتے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ عزیزؔ کے کلام سے غالبؔ کے رنگ کا ایک شعر درج کیجیے۔

﴿۵﴾ تخیّل آفرینی کسے کہتے ہیں؟ مثال کے ساتھ سمجھایئے۔

﴿۶﴾ سہلِ ممتنع کے اشعار نقل کیجیے اور تعریف بھی بیان کیجیے۔

09.05 : عزیزؔ لکھنوی کی پہلی غزل

﴿۱﴾

﴿۱﴾ شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا
یادگارِ حُسن و عشق اک داغ دل پر رہ گیا

﴿۲﴾ ضعف میں کرتا بیاں کس طرح آخر دردِ دل
آپ کا بیمار اک کروٹ بدل کر رہ گیا

﴿۳﴾ شوق نے کہہ کے یہ پہنچایا ہے آخر قبر تک
دو قدم بس اور آگے کوئے دلبر رہ گیا

﴿۴﴾ چارہ سازوں سے دمِ آخر ترا بیمارِ غم
دل کی جانب کچھ اشارے سے بتا کر رہ گیا

﴿۵﴾ قطرہ قطرہ اشک کا ہے مخبرِ ناسورِ دل
ہم کو اب رونا اسی کا زندگی بھر رہ گیا

09.06 : عزیزؔ لکھنوی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ عزیزؔ لکھنوی کی غزل گوئی کی یہ ایک خاص بات ہے کہ اس دور میں جب کہ غزل کے مقابلے میں نظم کو زیادہ سراہا جار ہا تھا، اس وقت اس طرح کی شاعری جس میں صرف وارداتِ قلبیہ اور حسن وعشق کو اپنا محور بنائے رکھنا اور زمانے کے حادثات وواقعات، ساتھ ہی خارجی مضامین کا اثر نہ ہونا ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ عہد ہے جب کہ علاّمہ اقبالؔ ''نیا شوالہ''، ''کوہِ ہمالہ'' اور چکبستؔ ''ہوم رول'' جیسی نظمیں کہہ رہے تھے۔ عزیزؔ اس وقت بھی اپنی دنیا میں مست، دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے حسن وعشق کے معاملات نہایت خوبی سے نظم کررہے تھے۔ عزیزؔ کی مندرجہ بالا غزل ۱۳/اشعار پر مشتمل ہے جس کے منتخب اشعار یہاں پیش کیے گئے ہیں اور تمام کے تمام اشعار اسی حسن کی جفاشعاری اور عشق کی وفاشعاری اور دلی کیفیات کے مضامین پر مشتمل ہیں۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: اس شعر میں شاعر یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ عشق کی آگ نے آخر کار دونوں کو یعنی حسن وعشق کو جلا کر خاک کر دیا ہے۔ اردو شاعری میں شمع و پروانہ، گل وبلبل، حسن وعشق کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے شام، دُکھ اور مصیبت کی اور صبح خوشی کی ایک نئی

امید کی علامت بن چکے ہیں۔ شعر کے پہلے مصرعے میں شمع اور پروانے کے جلنے سے مراد اُن کا حقیقی آگ میں جلنا نہیں ہے۔ بلکہ عشق کی وہ آگ جو دل میں ہوتی ہے اس نے دونوں کو جلا دیا مگر ان کی یادگار کے طور پر ایک داغ رہ گیا ہے یعنی ان کے خاک ہو جانے کے باوجود ان کے دلوں پر عشق کا ایک نشان باقی رہ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عشقِ حقیقی وہ جذبہ ہے جو زمانے کے لاکھ ستم کے باوجود باقی رہتا ہے۔ حسن و عشق کا وصال نہ ہوا تو کیا؟ اب بھی دونوں کے دلوں پر ایک نشانِ عشق باقی رہ گیا ہے یعنی عشق کبھی نہیں مٹ سکتا۔

دوسرا شعر: اردو غزل کا عاشق ہمیشہ کمزور، ناتواں، نحیف اور لاغر ہوتا ہے لیکن یہ کمزوری اور ناتوانی خدا کی دی ہوئی نہیں ہے بلکہ عشق میں جلتے جلتے عاشق کی حالت یوں ہو جاتی ہے۔ اس شعر میں معاملہ یہ ہے کہ عاشق اس قدر کمزور ہو چکا ہے کہ اس میں بولنے کی ہمّت و طاقت نہیں رہ گئی ہے، لہٰذا درِ دل کو بتانے کے لئے اس نے ایک کروٹ لی اور دل کا حال ان پر ظاہر کر دیا۔ اسی کی وجہ سے اس کا یہ حال ہوا ہے ورنہ وہ ایسا کبھی نہ تھا۔

تیسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ اپنے محبوب سے ملنے کے شوق نے اسے تمام کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عاشق نے پوری عمر اسی فراق میں گزار دی کہ آج نہیں تو کل وصال ہو ہی جائے گا۔ آج نہیں آئے ہیں مگر کل کی ملاقات کا وعدہ کیا ہے تو کل آئیں گے ہی۔ اسی آج کل میں پوری عمر گزر گئی۔ لیکن محبوب سے ملاقات کا موقع نہ آیا۔ اس شعر میں ''کوئے دلبر'' کو بڑی ہی خوبی سے ایک نئے معنی میں باندھا گیا ہے۔ ''کوئے دلبر'' سے یہاں مراد محبوب کی گلی نہیں بلکہ اس کا التفات ہے محبوب سے التفات کی چاہت میں عمر ختم ہو گئی مگر وہ اپنی کافر اداؤں اور جفا شعاری سے باز نہ آیا اور ایک عمر کی وفا پرستی پر بھی اسے یقین نہ آیا۔

چوتھا شعر: عاشق نے پوری عمر اپنے محبوب سے اپنی وفا کا انعام حاصل کرنے کے لئے گزار دی لیکن اسے اس کا التفات حاصل نہ ہو سکا۔ آخر کار اسی میں آخری وقت بھی آ پہنچا۔ ایسے میں معالج اور تیمار داروں سے اپنی بیماری، درد اور کرب کے بارے میں کمزوری کے باعث کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے بس اشارے سے دل کی طرف نگاہ کر دی اور اسی اشارے نے اس کے دل کا حال چارہ سازوں پر ظاہر کر دیا۔ کیا بیماری ہے؟ کہاں تکلیف ہے؟ اس کا ایک ہی جواب اس نے اشارے سے دیا کہ اسی دل نے اسے یہاں تک پہنچایا ہے۔ اسی کی وجہ سے اسے زندگی بھر کبھی سکون حاصل نہ ہو سکا۔ اس شعر میں ''بتا کر رہ گیا'' میں ''رہ گیا'' خاص توجّہ کا طالب ہے یہی اس شعر کا کلیدی لفظ ہے۔

پانچواں شعر: عشق کے ہاتھوں عاشق کا اب یہ حال ہو چکا ہے کہ وہ خون کے آنسو روتا ہے۔ اب تک عشق کا راز زمانے پر ظاہر نہیں ہوا تھا بلکہ عاشق اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتا تھا لیکن اب کیفیت دوسری ہو چکی ہے اور اس کی آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ یہ خون کے آنسو اب زمانے پہ ظاہر کر دیں گے کہ وہ عشق میں ناکام ہوا ہے۔ اسی وجہ سے آنسوؤں کے قطروں کو شاعر نے مخبر کہا ہے کہ یہ زمانے کو میرے دل کی خبر دے رہے ہیں۔ اسی بات کا عاشق کو افسوس ہے کہ جو راز کسی کو معلوم نہیں تھا ان آنسوؤں نے جو کہ اب بہ صورتِ خون نکلتے ہیں۔ زمانے تک پہنچا دیا اور عاشق کی بدنامی کا سبب بن گئے۔ جس کا افسوس، جس کا رونا اسے زندگی بھر رونا پڑے گا۔

محبوب کے ناز نخرے سے جو زخم دل پر لگے تھے، انہوں نے اب ناسور کی صورت اختیار کر لی ہے۔ آنکھوں سے جو آنسو خون کی شکل میں نکلتے ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دل میں ناسور ہو گیا ہے۔ چوں کہ ناسور اچھا نہیں ہوتا اور وہ بھی عشق کا ناسور تو اور بھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ روز نئے زخم اس میں لگتے چلے جاتے ہیں، لہٰذا عاشق کو اب عمر بھر یہی خون کے آنسو رونا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ عزیزؔ لکھنوی کی مندرجہ بالا غزل کتنے اشعار پر مشتمل ہے؟

﴿۸﴾ اردو شاعری میں شمع اور پروانہ کس کی علامت سمجھے جاتے ہیں؟

﴿۹﴾ چوتھے شعر کا کلیدی لفظ کون سا ہے؟

09.07 عزیزؔ لکھنوی کی دوسری غزل

﴿۲﴾

﴿۱﴾ دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

﴿۲﴾ حادثے دونوں یہ عالم پہ اہم گزرے ہیں
مرا مرنا، تری زلفوں کا پریشاں ہونا

﴿۳﴾ کچھ تو پوچھو شبِ وعدہ مرے گھر کی رونق
اللہ اللہ وہ سامان سے ساماں ہونا

﴿۴﴾ اللہ اللہ یہ سلیقہ ترا اے شعلۂ طور!
کس طرح تونے چھپایا ہے نمایاں ہونا

﴿۵﴾ ان سے کرتا ہے دمِ نزع وصیت یہ عزیزؔ
خلق روئے گی مگر تم نہ پریشاں ہونا

09.08 عزیزؔ لکھنوی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ یہ غزل بھی ان ہی واردات کے مضمون پر مبنی ہے جنہیں ہم معاملاتِ حسن وعشق کی کیفیات کہتے ہیں۔عزیزؔ کی شاعری کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ ان کے یہاں الفاظ کا استعمال بڑی خوبی سے ہوتا ہے۔سیدھی سادی زبان میں بلند خیال کے مضامین نہایت سلیقے سے ادا ہو جاتے ہیں۔اس طرح غزل کی تعریف جیسا کہ ہم جانتے ہیں محبوب سے باتیں کرنا یا واقعاتِ حسن وعشق کو نظم کرنا ہے۔اس پر عزیزؔ پوری طرح قادر ہیں۔اس دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ان کے تخیّل پر خارجی مضامین کا اثر شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: جب آدمی کسی نئی جگہ جاتا ہے تو چاروں طرف ایک حیرت کی نگاہ ڈالتا ہے ''پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا'' سے پہلی نظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سچ مچ جیل خانے کی بات ہورہی ہے اور شاعر وہیں کی بات کررہا ہے لیکن اس شعر میں ایہام ہے اور شاعر کی مراد قید خانے سے نہیں ہے، جہاں آدمی جرم کرنے کے بعد لایا جاتا ہے بلکہ اس کی مراد انسان کے دنیا میں قدم رکھنے سے ہے جب کہ وہ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں قدم رکھتا ہے اور قدم رکھتے ہی حیرت سے رونا شروع کردیتا ہے۔شاعر اسی داخلے کی بات کررہا ہے۔

دوسرا شعر: اس دنیا میں دو حادثے بہت اہم گزرے ہیں ایک میرا مرنا اور دوسرا تیری زلفوں کا پریشاں ہونا۔ یہاں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ عاشق و معشوق کے درمیان کیا تعلّق ہے۔ایک اور بات جو خاص طور سے قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ ''میرا مرنا اور تیری زلفوں کا پریشاں ہونا'' یعنی عاشق کے جیتے جی محبوب کی کرم فرمائی کا انتظار ہی رہا لیکن اس کا قرب حاصل نہ ہوسکا۔شاعر کہنا چاہتا ہے کہ یہ راز میرے مرنے کے بعد ظاہر ہوا کہ ان کو مجھ سے کافی لگاؤ تھا۔کیوں کہ مرنے کی خبر پر ان کی زلفیں پریشاں ہوا ٹھیں، ورنہ انہیں تو صرف قتل کرنے کی عادت ہوتی ہے۔وہ پریشان ہونا کیا جانیں؟ لیکن افسوس کہ یہ راز میرے مرنے کے بعد ظاہر ہوا۔''مرنا اور زلفوں کا پریشاں ہونا'' میں ایک خاص تعلّق ہے جو دل کے رشتے کی وضاحت کررہا ہے۔

تیسرا شعر: محبوب نے عاشق سے اس کے گھر آنے کا وعدہ کیا ہے اس کے اس وعدے پر کہ محبوب آنے والا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ اردو غزل کا محبوب وعدہ وفا نہیں کرتا پھر بھی عاشق کی معصومیت اسے وعدے پر یقین کرنے کو مجبور کرتی ہے۔اس کے آنے کی خوشی میں گھر کو کس طرح سجایا گیا ہے، اس کے بارے میں کچھ مت پوچھیے کیوں کہ یہ باتیں بیان سے باہر ہیں کہ کس طرح کی آرائش کی گئی ہے، نہ جانے کہاں کہاں سے ایک ایک چیز لاکر گھر کو جنّت بنایا گیا ہے۔

چوتھا شعر: اللہ اللہ حیرت کے ساتھ، اے شعلۂ طور! تیرا یہ طریقہ کہ تو نے اپنے جلوے کو کس طرح سے چھپایا ہے؟ کہ ساری دنیا انگشت بدنداں ہے۔اس شعر میں موسیٰ علیہ السّلام کا واقعہ باندھا گیا کہ جب انہیں کوہِ طور پر جلوہ دکھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بلایا، جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوگئے اور پورا کوہِ طور جل کر خاک ہوگیا۔اسی تاریخی واقعے پر یہ شعر نظم کیا گیا ہے۔

پانچواں شعر: عاشق بالکل آخری وقت میں جب کہ اس کی سانسیں ٹوٹنے والی ہیں، اپنے محبوب سے وصیت کرتا ہے کہ میں تو جارہا ہوں، لوگ روئیں گے مگر میری جان تم پریشان مت ہونا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ مطلع میں لفظ ''زنداں'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

﴿۱۱﴾ غزل کے چوتھے شعر میں کس نبی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے؟

﴿۱۲﴾ پانچویں شعر میں عاشق اپنے محبوب کو کیا وصیت کرتا ہے؟

09.09 خلاصہ

ادب، زندگی اور تہذیب کا عکّاس ہوتا ہے۔ چوں کہ ادیب یا شاعر معاشرے کا فرد ہوتا ہے لہٰذا اس معاشرے کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کی عکّاسی اس کے فن پاروں میں ہونا لازمی ہے۔ ادب و شعر کا مطالعہ قاری میں تہذیب و زبان سے لگاؤ پیدا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی زبان کی باریکیوں سے بھی واقفیت پیدا ہوتی ہے۔ عزیزؔ لکھنوی کا کلام بھی انہی شعری خصوصیات کا آئینہ ہے، جو دبستانِ لکھنؤ کے حوالے سے ہمارے شعری سرمائے کا حصہ رہی ہیں۔

عزیزؔ لکھنوی نام محمد ہادی تھا۔ ۱۸۸۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اساتذہ کے دواوین کے مطالعے نے شعر گوئی کی طرف راغب کیا۔ صفیؔ لکھنوی سے اصلاحِ سخن لی اور جلد ہی صفِ اوّل کے شعرا میں شمار ہونے لگے۔ پہلا مجموعہ ''گل کدہ'' ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا اور باقی تخلیقات یعنی ''انجم کدہ'' اور ''قصائدِ عزیز'' ان کی وفات (۱۹۳۵ء) کے بعد شائع ہوئیں۔ عزیزؔ کی شاعرانہ خصوصیات میں مضمون آفرینی و تمثیل آفرینی کے ساتھ ہی سہلِ ممتنع کے باوجود غضب کی معنویت پائی جاتی ہے۔ غالبؔ کے استفہامیہ انداز کی انہوں نے کامیاب تقلید کی ہے۔ شاملِ نصاب دونوں غزلوں کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے۔ کلاسیکی غزل کی روایات کا سچا شعور ان میں پایا جاتا ہے۔ وارداتِ حسن و عشق، کیفیاتِ دل و جگر اور احوالِ فکر و نظر کا اظہار سادہ، سلیس اور رواں نیز پُر تاثیر زبان و بیان کے ساتھ کیا گیا ہے۔

09.10 فرہنگ

استفادہ	فائدہ حاصل کرنے کی خواہش کرنا	شغف	کمالِ محبت، انتہائی رغبت
استفہام	سمجھنا، دریافت کرنا، پوچھنا، تفتیش کرنا	ضعف	کمزوری، ناطاقتی
الہام	وحی، کسی بات کا خدا کی طرف سے دل میں ڈالا جانا	معتمد	بھروسا رکھنے والا، قابلِ اعتبار
		موروثی	آبائی، پشتینی، باپ دادا سے ملنے والی چیز
چارہ ساز	کام بنانے والا، معالج، خدا تعالیٰ	میلان	رجحان، جھکاؤ، توجّہ
دواوین	دیوان کی جمع	نشتر	نوک دار اوزار، استرا
شعر فہمی	شعر کو سمجھنے کی قوّت	نشیب و فراز	اتار چڑھاؤ، زمانے کا نفع نقصان
شعری محاسن	شعر کی خوبیاں	وفور	بہتات، فراوانی، زیادتی، افراط، کثرت
شعور	عقل، دانائی، واقفیت، پہچان		

09.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰۔۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : عزیزؔ لکھنوی کی حیات پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر ۲ : تخیّل آفرینی پر بحث کرتے ہوئے اس کی مثالیں عزیزؔ کے کلام سے دیجیے۔

سوال نمبر ۳ : عزیزؔ کے استاد کا نام تحریر کیجیے اور ان کی ابتدائی زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر ۴ : ''شمع بجھ کر رہ گئی.................. داغ دل پر رہ گیا'' کی تشریح اپنے لفظوں میں کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰۔۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : عزیزؔ کی زندگی پر ایک نوٹ سپرد قلم کیجیے۔

سوال نمبر۲ : ''گل کدہ'' کی خوبیوں سے بحث کیجیے اور اس کی خصوصیات بھی بتائیے۔

سوال نمبر۳ : سہلِ ممتنع کی تعریف بیان کیجیے اور اس کی مثالوں سے وضاحت بھی کیجیے۔

09.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو ادب کی تاریخ	از	عظیم الحق جنیدی
۲۔ انجم کدہ	از	عزیزؔ لکھنوی
۳۔ گل کدہ	از	عزیزؔ لکھنوی
۴۔ بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں	از	مرزا جعفر حسین

09.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ عزیزؔ لکھنوی کا اصل نام مرزا محمد ہادی اور تخلص عزیزؔ تھا۔

﴿۲﴾ عزیزؔ کے استاد کا نام صفیؔ لکھنوی ہے۔

﴿۳﴾ عزیزؔ کے پہلے مجموعے کا نام ''گل کدہ'' ہے جو ان کی حیات میں ہی شائع ہوا تھا۔

﴿۴﴾ وہ نگاہیں کیا کہوں کیوں کر رگِ جاں ہو گئیں
دل میں نشتر بن کے ڈوبیں اور پنہاں ہو گئیں

﴿۵﴾ تخیّل آفرینی اس وقت ہوتی ہے جب شاعر کا خیال کچھ اس طرح کے مضمون باندھے جو عموماً لوگوں کے خیال سے ممتاز ہو۔ مثلاً

کسی نے نزع کی اس طرح گتھیاں سلجھائیں
سرہانے بیٹھ کے ہر سانس کا شمار کیا

﴿۶﴾ سہلِ ممتنع اسے کہتے ہیں جب کہ شعر میں ایسے الفاظ استعمال ہوں جو مشکل نہ ہوں اور شعر کی عبارت نثری جملے سے قریب تر ہو، تاکہ شعر کی نثر کرنا مشکل ہو جائے۔ جیسے:

ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی
اب تو دن رات یاد آتی ہے

﴿۷﴾ پہلی غزل تیرہ (۱۳) اشعار پر مشتمل ہے لیکن انتخاب میں صرف پانچ (۵) اشعار شامل ہیں۔

﴿۸﴾ شمع و پروانہ، عاشق و معشوق اور حسن و عشق کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

﴿۹﴾ چوتھے شعر کا کلیدی لفظ ''رہ گیا'' ہے۔

﴿۱۰﴾ لفظ ''زنداں'' سے شاعر کی مراد عالمِ ہستی یعنی دنیا ہے۔

﴿۱۱﴾ چوتھے شعر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

﴿۱۲﴾ پانچویں شعر میں عاشق اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ میری موت پر لوگ روئیں گے مگر تم مت رونا۔

بلاک نمبر 04

اکائی 10 اصغرؔ گونڈوی
اکائی 11 جگرؔ مرادآبادی
اکائی 12 یگانہؔ چنگیزی

اکائی 10 : اصغؔر گونڈوی

ساخت

10.01 : اغراض ومقاصد
10.02 : تمہید
10.03 : اصغؔر گونڈوی کے حالاتِ زندگی
10.04 : اصغؔر گونڈوی کی شاعرانہ خصوصیات
10.05 : اصغؔر گونڈوی کی پہلی غزل
10.06 : اصغؔر گونڈوی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اورتشریح
10.07 : اصغؔر گونڈوی کی دوسری غزل
10.08 : اصغؔر گونڈوی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اورتشریح
10.09 : خلاصہ
10.10 : فرہنگ
10.11 : نمونہ امتحانی سوالات
10.12 : حوالہ جاتی کتب
10.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

10.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں اصغؔر گونڈوی کی حیات، شاعری اور غزل گوئی کی تمام خصوصیات پر گفتگو کی جائے گی۔طلبا کے خصوصی مطالعے کے لئے دوغزلیں بھی شامل ہیں۔ان غزلوں کے مجموعی تاثر کے ساتھ ساتھ ہر شعر کی الگ الگ تشریح بھی کی جائے گی۔اس کے علاوہ شعری محاسن پر بھی ہماری نگاہ ہوگی جن کا ذِکر اشعار کی تشریح کے ساتھ ہی کر دیا جائے گا۔اکائی کے اختتام پر اکائی کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔امّید کی جاتی ہے کہ اس اکائی کے پڑھنے کے بعد آپ اصغؔر کی شخصیت اور شاعری سے پوری طرح واقف ہوسکیں گے۔

10.02 تمہید

اصغؔر گونڈوی کا شمار جدید غزل کے معماروں میں ہوتا ہے۔اردو غزل پر بیسویں صدی کے اوائل میں جب بپتا پڑی اور اس کی گردن زدنی کو ضروری قرار دیا گیا تو اس میں ایک نئی جان پھونکنے کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت کو برقرار رکھنے میں جن لوگوں نے نمایاں کردار ادا کیا، ان میں اصغؔر کا نام سرِ فہرست ہے۔اصغؔر کی غزلوں کی سب سے بڑی خوبی اخلاق کی بلندی ہے۔ان کی شاعری نے اور کوئی کام کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن ہم کو شریف انسان بنانے کی جو کوشش ان کے یہاں ملتی ہے وہ کسی دوسرے کے یہاں مشکل سے ملے گی۔

10.03 اصغرؔ گونڈوی کے حالاتِ زندگی

اصغرؔ گونڈوی یکم مارچ ۱۸۸۴ء کو گورکھ پور کے محلّہ الٰہی باغ میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام اصغر حسین تھا۔ان کے والد مولوی تفضّل حسین قانون گو تھے۔لہٰذا جب ان کا تبادلہ گورکھ پور سے گونڈہ ہوا تو ان کے اہلِ خانہ بھی ان کے ساتھ گونڈہ چلے آئے۔اصغرؔ کی ابتدائی تعلیم گونڈہ میں ہی ہوئی۔انہوں نے ۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور یہیں سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔اصغرؔ نے اپنی تعلیم کسی طرح انٹرنس تک جاری رکھی مگر اس کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔اس کے باوجود انہوں نے ذاتی مطالعے کی بنا پر اچھی خاصی قابلیت پیدا کرلی۔

اصغرؔ نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں منشی خلیل احمد وجدؔ بلگرامی کو اپنا کلام دکھایا۔بعد میں کچھ دنوں منشی امیر اللہ تسلیمؔ سے بھی مشورۂ سخن کرتے رہے۔اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا۔حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی استادی وشاگردی بس ایک رسم کی ادائیگی ہوتی ہے۔کیوں کہ شاعر کا اصل رہبر اس کا ذوق،وجدان اور طبیعت کی موزونی ہوتی ہے جو اسے دھیرے دھیرے صحیح راہ پر ڈال دیتی ہے۔

ریلوے کے محکمے میں ٹائم کیپر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا تو بیس روپے ماہوار تنخواہ پانے لگے۔اس کے بعد کے چند برس ان کی زندگی کا ایسا دور تھا جو ان کی شخصیت سے کہیں بھی میل نہیں کھاتا۔یہ وقت ان کی مے نوشی کا تھا۔''چھٹن'' سے اصغرؔ گونڈوی کو قربت ہوئی تو انہوں نے ان سے نکاح کرلیا۔آہستہ آہستہ اصغرؔ کا مذہبی رجحان بڑھتا گیا اور بہت جلد انہوں نے اپنی پرانی روش ترک کردی۔عبادت اور تصوف کی طرف ان کا ذہن مائل ہو چکا تھا۔اس تبدیلی نے آخر ایک دن عبدالغنی منگلوری سے شرفِ بیعت حاصل کروادیا۔۱۹۱۳ء میں جب سے انہوں نے بیعت کا شرف حاصل کیا،اس کے بعد سے تصوّف اور علم وعرفان ان کی توجّہ کا مرکز بن گئے۔اسی سال دکان کرلی اور مستقل طور پر اس پر بیٹھنے لگے۔چوں کہ طبیعت کچھ ایسی تھی کہ تجارت راس نہیں آئی اور گھاٹا برداشت کرنا پڑا۔۱۹۱۶ء میں جگرؔ مرادآبادی سے ملاقات ہوئی،یہی ملاقات رفتہ رفتہ دوستی میں تبدیل ہوگئی۔جگرؔ اصغرؔ کے دل دادہ ہوگئے۔اصغرؔ کی زندگی میں وہ دَور بھی آیا جب وہ چشمے کے کاروبار کے سلسلے میں جگرؔ کے معاون ہوگئے۔اس سے قبل وہ ''قصرِ ہند'' ہفتہ وار ۱۹۱۳ء کے مدیر کی حیثیت سے کام کر چکے تھے،جس کا نام بعد میں بدل کر ''پیغام'' کردیا گیا تھا۔۱۹۲۶ء میں وہ عطر چند کپور کے ''ادبی مرکز'' سے وابستہ ہوگئے۔جب ادارے کا کاروبار دَم توڑنے لگا تو اصغرؔ گونڈہ چلے آئے۔۱۹۳۰ء میں سرتیج بہادر سپرو نے ایک اکادمی ''ہندوستانی اکیڈمی'' کے نام سے قائم کی تو اصغرؔ اس میں کام کرنے لگے۔

اصغرؔ مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ سامعین کے سامنے کلام پیش کرنے کے لئے ان کی آواز موزوں نہیں تھی۔ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ''نشاطِ روح'' دسمبر ۱۹۲۵ء میں اور دوسرا مجموعہ ''سرودِ زندگی'' ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔اصغرؔ نہایت کم گو تھے۔اتنا کم کہنے کے باوجود اہلِ نظر کو اپنی طرف متوجّہ کرلینا کوئی معمولی بات نہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی شاعری میں ایسی قابلِ قدر خوبیاں موجود ہیں جو ایک معیاری شاعری کے لئے ناگزیر ہیں۔ان کے پورے کلام میں انبساط اور سرمستی کی ایک وجدانی کیفیت پائی جاتی ہے۔بغیر آہ وفریاد کے اصغرؔ عشق کی منزلیں بآسانی طے کرتے چلے جاتے ہیں۔مثلاً:

نشۂ عشق میں ہر چیز اڑی جاتی ہے
کون ذرّہ ہے کہ سرشار محبت میں نہیں

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں
جہاں سے تو نے لیے خندہ ہائے زیر لبی

اصغرؔ گونڈوی کے رنگ وآہنگ کی ابتدا ''نشاطِ روح'' سے ہوتی ہے۔ وہ فرسودہ مضامین باندھنے سے گریز کرتے تھے۔ زبان وبیان اور خیالات دونوں کے اعتبار سے ان کا کلام ابتذال کی سرحدوں میں داخل نہیں ہوتا۔ ان کے لب و لہجے میں ایک متانت آمیز رنگینی اور خیالات ومحسوسات میں پاکیزگی ولطافت پائی جاتی ہے۔ تصوّف اور معرفت کے مضامین کو کیف وسرور کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کی تخلیق کچھ یوں ہوتی ہے کہ دل پر اثر کرتی ہے۔ اردو ادب کا یہ مایہ ناز ادیب ۱۹۳۶ء میں الہ آباد میں روپوش ہوگیا اور وہیں پر تدفین عمل میں آئی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ اصغرؔ گونڈوی کا اصل نام کیا تھا؟

﴿۲﴾ اصغرؔ کہاں پیدا ہوئے؟

﴿۳﴾ اصغرؔ نے سب سے پہلے کون سی ملازمت حاصل کی؟

﴿۴﴾ اصغرؔ نے کس بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی؟

10.04 اصغرؔ گونڈوی کی شاعرانہ خصوصیات

شاعر ہو یا نثر نگار سب کا اپنا ایک مزاج، حیثیت اور امتیازی وصف ہوتا ہے۔ جس سے اس ادیب کی شناخت قائم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مجازؔ کا اپنا ایک رنگ ہے، فانیؔ کی اپنی ایک الگ دنیا ہے اور فیض احمد فیضؔ کا اپنا ایک لہجہ ہے۔ لیکن ان سب کی پہچان سب سے پہلے ایک شاعر کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ سبھی اپنا منفرد لب ولہجہ رکھتے ہیں اور اسی سے ان کی شناخت اور شخصیت قائم ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اصغرؔ کا بھی ایک مخصوص رنگ ہے، جس سے ان کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ غزلیاتِ اصغرؔ کی سب سے بڑی خصوصیت اخلاق کے معیار کی بلندی ہے۔ ان کے کلام میں تلاش کرنے کے بعد بھی ایک ایسا شعر نہیں مل سکتا جو معیار سے فروتر ہو۔ حسن وعشق، وصل و ہجر، سوز وگداز، حسرت ویاس، جوش ووارفتگی اور مسرّت وانبساط۔ غرض یہ کہ تمام طرح کے مضامین باندھے گئے ہیں لیکن کہیں بھی ابتذال یا عامیانہ پن نہیں ہے۔ اصغرؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال سہیل لکھتے ہیں:

> ''خدا کا شکر ہے کہ جنابِ اصغرؔ کی شاعری عام سطح سے بہت بلند ہے اور ان کے یہاں ڈوبی ہوئی نبضیں، پتھرائی ہوئی آنکھیں اور عالمِ نزع کی ہچکیاں غرض یہ کہ زندہ درگور شعرا کی بد مذاقیاں کہیں بھی نہیں ہیں۔ ان کی شاعری رقصِ معنی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔'' (نشاطِ روح)

غزل کو بیسویں صدی میں ایک نئے رنگ وآہنگ سے روشناس کرانے میں اصغرؔ سب سے پیش پیش تھے۔ سامنے کی باتیں ہوں یا عام وارداتِ قلبی ہوں، ان سب کو اصغرؔ ایک نئے پیکر میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں جس سے کلام میں ایک ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی پوری شاعری میں نشاط اور سرمستی کی ایک وجدانی کیفیت پائی جاتی ہے، جس کے باعث وہ عشق کی منزلیں بغیر آہ وفغاں کے طے کرتے چلے جاتے ہیں۔

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغؔر یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد ماتم کی
شعر میں رنگینیِ جوشِ تخیّل چاہیے مجھ کو اصغؔر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی
ہے خستگیِ دم سے رعنائیِ تخیّل میری بہارِ رنگیں پروردۂ خزاں ہے
اس جوئے بارِ حسن سے سیراب ہے فضا روکو نہ اپنی لغزشِ مستانہ وار کو
جوشِ شباب و نشۂ صہبا، ہجوم شوق تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

یہ لب ولہجہ اور خزاں کا پروردۂ رنگین مزاج اصغر ہی کے بس کی بات تھی۔ بیسویں صدی میں غزل کو نئی بلندیوں اور اور نئی منزلوں سے روشناس کرانے والوں میں فاؔنی، جگؔر اور حسرؔت بھی اصغؔر کے ہم قدم تھے۔ لیکن یہ جوش وجذبہ اصغؔر ہی سے منسوب ہے۔ ہر ایک کا اپنا رنگ ہے اور یہ سبھی اپنے اسی منفرد رنگ وآہنگ سے پہچانے جاتے ہیں۔

اصغؔر نے غالبؔ اور اقبالؔ دونوں سے ہی فیض حاصل کیا لیکن یہ فقط کورانہ تقلید نہیں ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور تراکیب کے اختیار کرنے کو اگر دیکھیں تو یقیناً غالبؔ کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً دل، شعلہ، آرزو، درماندگی، ذوق، تماشہ، ہجوم، در دغربی، کاوشِ بے مدّعا، نو بہارِ ناز اور ہر بُنِ مُو سے ٹپکتا ہے وغیرہ وغیرہ اس طرح کی تراکیب ہیں جنہیں اصغؔر نے غالبؔ سے لیا ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات صبر واستغنا، عملِ پیہم، سخت کوشی، ناز و نیاز کا امتزاج اور فلسفۂ وحدت الوجود ہیں۔ ان کے کلام میں فکری، فنّی اور ادبی محاسن کا ایک خوب صورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ آیئے! اب ان کی شاعرانہ خصوصیات پر گفتگو کی جائے۔

(۱) فلسفۂ حُسن وعشق

اُردو شاعری بالخصوص غزل میں حسن وعشق کے مضامین بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بغیر غزل کا کام چل ہی نہیں سکتا۔ حُسن وعشق کے فلسفے کے متعلّق لوگوں کی رائیں الگ الگ ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک حسن بذاتِ خود کوئی چیز نہیں ہے، اس میں ہمارے ذوق کا دخل زیادہ ہوتا ہے۔ یعنی عشق ہی حسن کا خالق ہے۔ دوسرے نظریے کے لوگوں کا ماننا اس سے مختلف ہے یعنی حسن ایک حقیقت ہے اور یہ عشق کا محرّک اور خالق ہے۔ حسن وعشق کے فلسفے سے متعلّق تیسرا نظریہ یہ ہے کہ حسن اور عشق دونوں اپنی جگہ مستقل وجود کے حامل ہیں۔ دونوں کا ایک دوسرے کی طرف لگاؤ فطری عمل ہے۔ چوتھا نظریہ یہ ہے کہ تمام کائنات ایک حسنِ ازل کا پرتو ہے لہٰذا حسن وعشق کی حقیقت ایک ہے۔ مذکورہ تمام طرح کے اشعار کی مثالیں اصغؔر گونڈوی کے کلام سے درج کی جاتی ہیں:

میرے مذاقِ شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویرِ یار کو
اس میں وہی ہیں یا مرا حسنِ خیال ہے دیکھوں اُٹھا کے پردۂ ایوانِ آرزو
تھیں نگاہِ شوق کی رنگینیاں چھائی ہوئی پردۂ محمل اُٹھا تو صاحبِ محمل نہ تھا
شعاعِ مہر خود بے تاب ہے جذبِ محبت سے حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی
وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنّا سے

دوسرا نظریہ:

اک غنچۂ افسردہ یہ دل کی حقیقت تھی — یہ موج زَنی خوں کی رنگینیِ پیکاں ہے
پھر گرمِ نوازش ہے ضو مہرِ درخشاں کی — پھر قطرۂ شبنم میں ہنگامۂ طوفاں ہے
کیا فیض بخشیاں ہیں رخِ بے نقاب کی — ذرّوں میں روح دوڑ گئی آفتاب کی

تیسرا نظریہ:

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا — اس رخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظر کو میں
مجنوں کی نظر میں بھی شاید کوئی لیلیٰ ہے — ایک ایک بگولے کو دیوانہ بنا آئی
مستی سے ترا جلوہ خود عرضِ تمنّا ہے — آشفتہ نگاہوں کا یہ کیفِ نظر دیکھا

چوتھا نظریہ: یہ وہ نظریہ ہے جسے سلوک کی اصطلاح میں وحدت الوجود کہتے ہیں۔ وحدت الوجود کے فلسفے کو تمام با کمال شعرا نے اپنے اپنے انداز میں نظم کیا ہے، اصغؔر نے اس مضمون کو اپنے طور پر بخوبی ادا کیا ہے، ملاحظہ ہو:

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے — پردے میں مصوّر ہی تنہا نظر آتا ہے
لو شمعِ حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے — فانوس کی گردش میں کیا کیا نظر آتا ہے
کچھ غنیمت ہو گئی یہ پردہ ہائے آب و رنگ — حُسن کو یوں کون رہ سکتا تھا عریاں دیکھ کر
بند ہو آنکھ، اٹھے منظرِ فطرت کا حجاب — لاؤ اک شاہدِ مستور کو عریاں کردیں
کس طرح حُسنِ دوست ہے بے پردہ آشکار — صدہا حجاب صورتِ معنی لیے ہوئے

﴿۲﴾ بلند نظری

شاعر جب اپنے کلام میں اپنے تخیّل کی بدولت ایسے مضامین باندھتا ہے جو عمومی سطح سے بہت اوپر ہوتے ہیں تو اسے بلند نظری سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اصغؔر کے کلام میں اس طرح کے مضامین کو بارہا نظم کیا گیا ہے۔ مثلاً:

یہ دین، وہ دنیا ہے، یہ کعبہ، وہ بت خانہ — ایک اور قدم بڑھ کر اے ہمّتِ مردانہ
کیا دردِ ہجر اور یہ کیا لذّتِ وصال — اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے
بہت لطیف اشارے تھے چشمِ ساقی کے — نہ میں ہوا کبھی بے خود، نہ ہوشیار ہوا
اک جہدِ مسلسل ہے، ہستی جسے کہتے ہیں — کفّار کا مٹ جانا خود مرگِ مسلماں ہے
نہ ہوگا مستیِ بے مدّعا کا رازداں برسوں — وہ زاہد جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

﴿۳﴾ اسرار و معارف

اسرار سِر کی جمع ہے، جس کے معنی راز اور بھید ہیں۔ شاعری میں جب شاعر کائنات کے مضامین سے نکل کر الوہیت اور فلسفہ وحکمت کے مضامین باندھتا ہے تو اسے اسرار و معارف کے مضامین کہتے ہیں۔ یہ مرحلہ آسان نہیں ہے اور نہ ہی یہ ہر شاعر کے لئے ممکن ہے۔ یہ ایک

خاص طرح کے مزاج سے وابستہ لوگوں کے لئے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔یعنی جس کی طبیعت میں خدا شناسی کے راز کو جاننے اوراس پر گفتگو کرنے کا شوق ہو وہی اس طرح کے مضامین نظم کرسکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر کا تخیّل ہی پہنچ سکتا ہے۔ دراصل یہ مقام اصغؔر جیسے شاعر کے لئے شاعری کی معراج ہے۔اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اقبال سہیل لکھتے ہیں:

''اگرایک شاعر عالمِ رنگ و بو سے گزر کر فلسفہ وحکمت کے نکتہ ہائے سربستہ، مذہب کے اسرار ورموز اور مراحلِ سلوک وعرفاں کی کیفیاتِ مجرّدہ اسی ترنّم، اور جدّتِ بیان، اور اسی حسنِ مصوّری کے ساتھ ادا کرتا ہے تو اس کی شاعری سحر سے گزر کر اعجاز بن جاتی ہے۔اس طرح کے شاعر کے لئے بصیرت، تاثر اور قوّتِ بیان تینوں کا اجتماع ضروری ہے۔یعنی ایک طرف تو قوّتِ مشاہدہ اتنی تیز ہونی چاہیے کہ نہایت دقیق نکتوں تک پہنچ سکے، دوسری جانب احساس اتنا لطیف ہونا چاہیے کہ وہ غیر مادّی حقائق سے بھی لذت اندوز ہوسکتا ہو اوران دونوں مراحل کے بعد قوّتِ بیان ایسی ہونی چاہیے کہ عرفانِ ذوق کی اس مجموعی کیفیت کی تصویر ایک نئے انداز کے ساتھ شعر ونغمہ میں کھینچ کر دوسروں کو بھی لذّت اندوز کرسکے تو وہ ایک باکمال شاعر ہے۔''

(نشاطِ روح، ازاقبال سہیل، صفحہ ۵۹)

درج بالا مضامین کو غزل کے سانچے میں ڈھالنا آسان نہیں ہے دوسرے ان مضامین کو ایک خشک طریقے سے باندھا جائے گا تب بھی وہ بات پیدا نہیں ہوگی۔ بقول غالب:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

جیسی کہ بادہ وساغر اور گل وبلبل کی زبان میں پیش کرنے سے ہوگی۔اسی بات کو اوپر کے شعر میں غالبؔ نے اپنے رنگ میں پیش کیا ہے۔اصغؔر نے اسرار ومعارف کے لطیف سے لطیف مضامین میں بھی ایک نئی کیفیت اور طرز سے اشعار کہنے کی کوشش کی ہے۔مثلاً:

پھر آج جوشِ سرِّ حقیقت ہے موج زَن — کچھ پردہ ہائے ساغر و مینا لیے ہوئے
اب تک تمام فکر و نظر پر محیط ہے — شکلِ صفات معنیٔ اشیا کہیں جسے
تری نگاہ کے صدقے یہ حال کیا ہے مرا — کمالِ ہوش کہوں یا کمالِ بے خبری
نظارہ بھی اب گم ہے بے خود ہے تماشائی — اب کون کہے اس کو جلوہ نظر آتا ہے

اہلِ بصیرت وعلم وعرفان اسے کہتے ہیں کہ انسان کے تمام ادراکات واحساسات پر جمالِ دوست کا قبضہ ہوجائے۔ ذات وصفات کا فرق مٹ جائے تو اس مقام کو اصطلاحِ سلوک میں فنا کہتے ہیں۔

تھیں خود نمودِ حسن میں شانیں حجاب کی
مجھ کو خبر رہی نہ رُخِ بے نقاب کی

جس طرح کمالِ بے خبری ہی اصل علم وعرفان ہے اسی طرح کمالِ ظہور بھی عینِ حجاب ہے۔اس حقیقت کی نہایت دل کش مصوّری اس شعر میں کی گئی ہے۔اس فلسفے سے متعلّق اصغؔر کی نظم ''سِرِّ فنا'' ہے۔ چند مثالیں اور پیش کی جا رہی ہیں جن کا تعلّق اسی سے ہے۔

پردۂ حرماں میں آخر کون ہے اس کے سوا　　اے خوشا رُوئے کہ نزدیکی بھی ہے دوری بھی ہے
میں تو ان محجوبیوں پر بھی سراپا دید ہوں　　اس کے جلوے کی ادا اک شانِ مستوری بھی ہے
میری محرومی کے اندر سے یہ دی اس نے صدا　　قرب کی راہوں میں میری راہ اک دوری بھی ہے

﴿۴﴾ ندرتِ بیان

ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ کوئی شاعر بالکل نیا خیال پیش کرے۔عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ شاعر وہی خیالات جو پہلے ادا کیے جا چکے ہیں اُنھی میں کچھ اضافہ کر کے ایک نیا پن لانے کی کوشش کرتا ہے یا ایک خیال کے ایک پہلو کو بدل کر دوسرا پہلو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے یا پھر دو متضاد چیزوں میں مماثلت اور دو مماثل چیزوں میں تضاد پیش کرتا ہے۔ یہ کیفیتیں خیال آفرینی کہی جا سکتی ہیں لیکن اگر کسی پرانے خیال کو اس جگہ قائم رکھ کر طرزِ ادا سے اس میں نئی روح پھونک دی ہے تو اس کو ندرتِ بیان کہتے ہیں۔اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ندرتِ بیان پرانی شراب کو نئے ساغر و مینا میں پیش کرنے کا نام ہے۔ بقول اصغؔر گونڈوی:

لو شمعِ حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش میں کیا کیا نظر آتا ہے

حقیقت میں یہی ندرتِ بیان شاعری کی روح ہے۔ نیا خیال ہر شعر میں پیش کرنا ناممکن سی بات ہے اور پرانے خیالات اور مضامین کو بغیر نئے پن کے ساتھ پیش کرنا بے غیرتی ہے۔لہٰذا یہ بات طے ہے کہ طرزِ ادا سے ہی شاعر اپنے مضامین میں نیا پن پیدا کرتا ہے۔ اصغؔر گونڈوی کی شاعری کا ایک مخصوص لہجہ ہے۔ان کے اس رنگ کو بعد کے شعرا میں کوئی نہ اپنا سکا۔اصغؔر اپنے رنگ کے پہلے اور آخری شاعر ہیں۔ ندرتِ بیان کی مثالیں اصغؔر گونڈوی کے کلام سے درج کی جاتی ہیں:

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا　　جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے
کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم　　کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا
اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پُر آشوب　　فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا
اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے رقص میں　　تم چیر کر تو سینۂ پروانہ دیکھتے
آہوں نے میری خرمنِ ہستی جلا دیا　　کیا مُنہ دکھاؤں گا تری برقِ نظر کو میں
جوشِ شباب ، نشۂ صہبا ، ہجومِ شوق　　تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو
تو برقِ حُسن اور تجلّی سے یہ گریز　　میں خاک اور ذوقِ تماشا لیے ہوئے

اصغؔر گونڈوی کی شاعرانہ خصوصیات میں اب تک جن خصوصیات کا ذِکر کیا گیا ہے وہ ان کی شاعری کی اصل پہچان ہیں۔اس کے علاوہ صفائی و برجستگی، لطافتِ خیال اور فلسفہ و حکمت پر بھی گفتگو کی جا سکتی ہے۔لیکن اس کا محل یہاں نہیں ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۵﴾ فلسفۂ حُسن وعشق سے متعلّق پہلے نظریے کا ایک شعر نقل کیجیے۔

﴿۶﴾ ندرتِ ادا کسے کہتے ہیں؟

﴿۷﴾ اصغؔر کی شاعری سے ان کی بلند نظری کی ایک مثال پیش کیجیے۔

10.05 اصغؔر گونڈوی کی پہلی غزل

﴿۱﴾

﴿۱﴾ آلامِ روز گار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

﴿۲﴾ میں کامیابِ دید بھی ، محرومِ دید ہوں
جلوؤں کے اژدہام نے حیراں بنا دیا

﴿۳﴾ یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

﴿۴﴾ وہ شورشیں، نظامِ جہاں جن کے دَم سے ہے
جب مختصر کیا اُنہیں ، انساں بنا دیا

﴿۵﴾ ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

10.06 اصغؔر گونڈوی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ یہ غزل اصغؔر کے دوسرے شعری مجموعے ''سرودِ زندگی'' سے اخذ کی گئی ہے۔ یہ غزل ان کی نمائندہ غزلوں میں شمار کی جاتی ہے۔ حُسن وعشق کے مضامین غزلوں میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن جس طرح اصغؔر کو فلسفے سے خاص لگاؤ تھا، اس کا اثر ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے، جس کا ذِکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ مذکورہ غزل کل ۱۰ ؍اشعار پر مشتمل ہے جس میں سے اوپر نقل کیے گئے اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔ حسن وعشق سے متعلّق معاملات میں عشقِ مجازی وحقیقی کی گفتگو اکثر کی جاتی ہے۔ اصغؔر کے اشعار میں یہ خوبی پائی

جاتی ہے کہ ان پر عشقِ مجازی اور حقیقی کا اطلاق بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اس غزل کی زبان آسان ہے اس میں کوئی مشکل لفظ نہیں آیا ہے، مگر ان آسان لفظوں سے بڑی کامیابی کے ساتھ بڑے مضامین ادا کرنے میں شاعر نہایت کامیاب رہا ہے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: شاعر کہتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے دکھوں اور روزگار کے مسائل کو حل کرنے کی ایک نئی ترکیب نکالی ہے، اور وہ یہ کہ میرے جو بھی دکھ ہیں، جو بھی مصیبتیں ہیں، میں نے سبھی کو غمِ جاناں سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔

دوسرا شعر: عاشق اپنی حیرت کا اظہار کر رہا ہے کہ کہاں تو ایک جھلک پانے کے لالے تھے اور کہاں اس قدر جلوے۔ وہ تو حیران ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسی عالمِ استعجاب میں کہہ رہا ہے کہ میں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی ہوں یعنی ایک جھلک یا ایک نظر دیکھنے کی بجائے جلوؤں کا انبوہ لگ گیا ہے جس سے عاشق کی نگاہیں چندھیا گئی ہیں۔

تیسرا شعر: اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اس کے محبوب کی مسکراہٹ اتنی لطیف ہے کہ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ گویا کلی کھل رہی ہے یعنی وہ اپنے نرم و نازک ہونٹوں کو ایک بہت ہلکی سی جنبش دیتا ہے، جس کے لئے شاعر کہتا ہے کہ اس کی وہ ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر ایسا لگا جیسے کلیوں میں جان سی پڑ گئی ہو۔ ٹھیک اسی طرح اپنے محبوب کی لب کشائی یعنی گفتگو کرنے کی تعریف میں شاعر نے چند لفظوں میں بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ لب کشا ہونے سے مراد بات کرنا، گفتگو کرنا، لب کھولنا، مُنہ کھولنا ہو سکتا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ اس کی مسکراہٹ ایک تو ایسی ہے کہ کلیوں میں جان ڈال دے تو دوسری طرف اس کی شیریں گفتاری ایسی ہے کہ لگتا ہے جیسے گلستان کھل اٹھا یا موسمِ بہار آ گیا ہے۔

چوتھا شعر: یہ شعر بھی پچھلے شعر ہی کی طرح فلسفیانہ ہے۔ وہ شورشیں یعنی ہنگامے، ولولے، فتنہ و فساد، جن کے دم سے دنیا میں ہما ہمی ، رنگا رنگی، غرور اور بڑ بولے پن کا طوطی بولتا ہے، اُنہی کو یکجا کر کے انسان کو بنایا گیا ہے۔ ایک پہلو جو سب سے زیادہ قابلِ غور ہے وہ ہے آدمی اور انسان کا فرق۔ آدمی سے انسان بننے کا جو مرحلہ ہے اس پر غور کرنا ضروری ہے۔ غالبؔ نے کہا ہے کہ ''آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ قدرت نے آدمی کو پیدا کیا اور اسے عقلِ سلیم سے نوازا، جس سے وہ خود اچھائی برائی کی تمیز کر کے اپنے اندر وہ صفات پیدا کرے جیسے انسان کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس شعر پر پھر غور کریں تو محسوس ہوگا کہ وہ شورشیں جن کے دم سے، جن کی بدولت دنیا کے کاروبار میں ہنگامے ہیں، فساد ہیں، بھاگ دوڑ ہے، نیکی و بدی کی قوّتیں ہیں، اُنہیکے ذریعے آدمی اپنے آپ کو انسان بنا سکتا ہے۔

پانچواں شعر: شاعر کہتا ہے کہ ہم نے تو اپنے محبوب کے ناز و انداز کی نظر کو نیشتر یعنی زخم کھولنے کا اوزار سمجھا تھا مگر ہوا اس کا ٹھیک اُلٹا۔ یہاں نشتر لگانے سے مراد پھونا یا زخم کا ٹھیک ہونا ہے۔ لیکن عشق میں نہ کبھی ایسا ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ کیوں کہ یہ مرض وہ ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''۔ یہی اور ایسا ہی اس شعر میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ محبوب کے ناز و انداز کی نگاہ کو ہم سمجھ رہے تھے کہ اس سے ہمارے دل کا کانٹا نکل جائے گا۔ لیکن اب اس کا یہ حال ہو گیا ہے کہ محبوب کی مسکراہٹ ہی اس کے لئے جینے کا وسیلہ بن گئی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۸﴾ پہلی غزل اصغؔر کے کس مجموعے سے لی گئی ہے؟

﴿۹﴾ تیسرے شعر میں کیا ہے؟

10.07 اصغؔر گونڈوی کی دوسری غزل

﴿۲﴾

﴿۱﴾ کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے؟
غبارِ قیس اُٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

﴿۲﴾ یہ سب ناآشنائے لذّتِ پرواز ہیں شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیّاد ہوتا ہے

﴿۳﴾ بہارِ سبزہ وگل ہے ، کرم ہوتا ہے ساقی کا
جواں ہوتی ہے دنیا ، مے کدہ آباد ہوتا ہے

﴿۴﴾ بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

﴿۵﴾ زمانہ ہے کہ خوگر ہو رہا ہے شوروشیون کا
یہاں وہ درد جو بے نالہ و فریاد ہوتا ہے

10.08 اصغؔر گونڈوی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ یہ غزل پوری طرح سے حوصلہ وہمّت سے لبریز ہے اور خاص طور سے غلامی، اسیری اور قید کی زندگی کے خلاف ایک موجِ رواں نظر آتی ہے۔ مکمّل غزل گیارہ اشعار پر مشتمل ہے، جس میں سے منتخب اشعار کا مطالعہ یہاں درکار ہے۔ اس کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ اس غزل کا ایک عنوان بھی قائم کیا جاسکتا ہے، جس کے اردگرد اس کے تمام موضوعات نظم کیے گئے ہیں۔ آزادیِ فطرت جیسے موضوعات بار بار باندھے گئے ہیں۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ غزل ملک کی سیاسی جدوجہد اور سماج کے غالب رجحان کی ترجمانی کرتی ہے۔ بیسویں صدی کے نصفِ اوّل کا عہد اس غزل میں سانسیں لیتا نظر آتا ہے۔ ایسا شاید ہی ہوتا ہے کہ کوئی ادیب اپنے سماج سے بالکل ہی

بے بہرہ ہو اور اس کی ترجمانی اپنی تخلیق میں نہ کرتا ہو۔ کیوں کہ آنے والے زمانے کے لئے وہی ادیب بڑا ثابت ہوتا ہے جو اپنے عہد کے غالب رجحان کی ترجمانی اپنے لہجے میں کرتا رہا ہے، خواہ نظم ہو یا نثر۔ اس غزل کو پڑھتے ہوئے بھی ہمیں یہ بات بار بار یاد آرہی ہے۔ کیوں کہ اس وقت آزادی کے لئے مختلف تحریکیں چل رہی تھیں۔ لہٰذا اصغرؔ نے بھی اپنے کلام سے لوگوں کو حوصلہ عطا کیا اور آزادی کا جذبہ ان میں بیدار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کبھی عنانِ تغزل کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یعنی فن اور مقصد دونوں میں اعتدال بنائے رکھنے کی کوشش کی۔ غزل کے پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ اس میں وقت کو سمونے کی کوشش کی اور ایک معتدل رویّہ اپنا کر ملک والوں کو اپنا پیغام دینے کی کوشش کی۔ اس میں بھی اصغرؔ کا ایک لب ولہجہ ہے جس سے وہ کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ یہی ان کی غزلوں کی انفرادیت ہے کہ وہ کبھی بھی معیار سے فروتر کوئی بات نظم نہیں کرتے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: اس شعر میں ''محمل نشیں'' کلیدی لفظ ہے۔ اس کو سمجھ لینے کے بعد شعر کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ ''محمل نشیں'' دراصل لیلیٰ کا استعارہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی معشوقہ کیوں خوش یا ناراض ہوتی ہے؟ جب کہ عاشق کا اپنے دیوانے پن پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اس کے جذبات خود اسے بربادی کی طرف لے جاتے ہیں۔

دوسرا شعر: شاعر آزادی اور غلامی کے فرق کو سمجھانا چاہتا ہے اور عوام میں جذبۂ بیداری پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کا یہ کہنا کہ قیدی یا وہ لوگ جو اسیر ہیں اور اپنی اس اسیری کے لئے صیّاد کو قصوروار ٹھہرا رہے ہیں۔ شاید انہیں آزادی کا لطف حاصل نہیں ہے۔ چوں کہ اپنا مافی الضّمیر شاعر پرواز اور صیّاد کے ذریعے ادا کر رہا ہے۔ اس لئے بات پرواز اور صیّاد کے استعارے سے کہی گئی ہے۔ ورنہ بات یہی ہے کہ ہمارے لوگ اگر آزادی کی لذّت سے آشنا ہوتے تو شاید شکوۂ صیّاد نہ کرتے اور قفس کی تیلیاں توڑ کر آزاد ہو جاتے۔

تیسرا شعر: اس شعر کو سہل ممتنع کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بہارِ سبزہ وگل ہے یعنی موسمِ بہار ہے اور گلشن پوری طرح گلزار ہے اور یہ ساقی کے کرم سے ہی ہے۔ لہٰذا جب گلشن میں اس طرح کا موسم ہوتا ہے تو رند اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتے اور میکدہ آباد ہو جاتا ہے۔

چوتھا شعر: یہ شعر جذبے کی پختگی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ شخص جو کہ قید میں ہے اور جس کی فطرت میں آزادی رچی بسی ہوئی ہے۔ وہ اپنے خون کی موجوں سے ایک چمن آباد کر لیتا ہے۔ یعنی ہندوستانیوں کی فطرت میں ابھی آزادی سمائی نہیں ہے۔ انہیں آزادی کے بارے میں ابھی کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ ورنہ وہ اپنے خون سے اپنا چمن آباد کر لیتے۔ خون سے چمن آباد کر لینے سے مراد آزادی کے لئے اپنا تن من دھن نثار کر کے آزادی حاصل کرنا ہے۔ اس شعر میں صنعتِ تضاد ہے۔ جو کہ ''پابند'' اور ''آزاد'' سے قائم ہوئی ہے۔

پانچواں شعر: اصغرؔ صاحب کہتے ہیں کہ زمانہ شور وغوغا اور ہنگامے کا عادی ہوتا جا رہا ہے لیکن میں اپنی دنیا میں ہی گم ہوں۔ میں اپنے دل کا درد ظاہر نہیں کرتا، بغیر کسی شور ونالے کے اپنے درد کو سنبھالے ہوئے رکھتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زمانہ جس چلن کا خوگر ہوتا جا رہا ہے، اس سے منفرد اپنا مزاج ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ تشبیہ سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

﴿۱۱﴾ اصغؔر گونڈوی کس عہد کے شاعر ہیں؟

﴿۱۲﴾ اس غزل کا مرکزی موضوع کیا ہے؟

10.09 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے اب تک اصغؔر گونڈوی کی حیات، شاعری کی خصوصیات اور جدید غزل میں ان کے مرتبے کی بات کی ہے۔ جس سے آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اصغؔر کس طرح کے آدمی تھے۔ اور شاعری کے کس معیار کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔

ان کے دونوں شعری مجموعے ''نشاطِ روح'' اور سرودِ زندگی'' ان کی زندگی میں ہی شائع ہو چکے تھے۔ یہ دونوں مجموعے بہت مختصر ہیں لیکن اردو دنیا میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان دونوں مجموعوں میں اصغؔر کی شاعری، اس کے معیار اور ان کے خاص نکات کی ہم نے نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے، جن کا ذکر اصغؔر کے یہاں بار بار ہوتا ہے۔ فلسفے سے ان کو خاصا لگاؤ تھا اور تصوّف سے بھی۔ اس سے انہوں نے کافی فائدہ اٹھایا اور مختلف قسم کے نظریات پر حامل اشعار بھی کہے۔ ایسے اشعار بغیر فلسفیانہ خیالات کو سمجھے سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ لہٰذا اکثر کی تعریف بھی پچھلے صفحات میں درج کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس سے طلبا کو فائدہ پہنچے گا۔

کلاسیکی غزل کا یہ شاعر تشبیہات، استعارات اور علامات کے ذریعے اپنے کلام کی طرف لوگوں کو راغب کرتا ہے۔ خالص غزل کے موضوعات تک اپنے کو محدود رکھتے ہوئے بھی بعض غزلوں میں زمانے کی روش اور عوامی جذبات کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔ اس عہد میں جس طرح کا سیاسی و سماجی منظر نامہ تھا، ان اشعار سے ان کا بھی پتہ چلتا ہے۔ دو غزلوں کی شرح بھی متن کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ طلبا اس اکائی سے اصغؔر گونڈوی کی شخصیت اور ان کی شاعری سے خاطر خواہ واقفیت حاصل کر سکیں گے۔ آخر میں فرہنگ اور مزید مطالعے کے لئے کتابوں کے نام درج کیے گئے ہیں، جن سے باذوق طلبا یقیناً استفادہ کریں گے۔

10.10 فرہنگ

آہ وفغاں	:	رونا پیٹنا، نالہ وفریاد	صہبا	:	ایک قسم کی لال شراب، سفید انگوروں کا رس
ابتذال	:	اخلاقی پستی، کمینہ پن، شاعری کا ہلکا پن	عنان	:	باگ، لگام، باگ ڈور
اسرار ومعارف	:	خدا کے راز، خدائی بھید، شانِ خداوندی	فرسودہ	:	پرانا، گھسا ہوا، پھٹا ہوا
امتزاج	:	ملاوٹ، ہم آہنگی، آمیزش	فروتر	:	کم تر، نچلا
بادی النظر	:	دیکھتے ہی، سرسری نظر سے	قابلِ گردن زدنی	:	واجب القتل، قتل کیے جانے کا سزاوار، قتل کیے جانے کا مستحق
پروردہ	:	پالا ہوا، بسایا ہوا، پرورش کیا ہوا			
جوئے بار	:	ایک ایسی نہر جس میں بہت سی نہریں آ کر مل جاتی ہوں، پہاڑ کا دامن	کورانہ	:	اندھوں کی طرح
			مستور	:	چھپا ہوا، پوشیدہ

حسرت و یاس	:	کسی چیز کے نہ ملنے کا افسوس، آرزو، ارمان، شوق	معراج	:	بلند مرتبہ، اعلیٰ، ایسا درجہ یا رتبہ جس سے زیادہ تصوّر میں نہ آسکے
خیرہ	:	تاریک، اندھیرا، حیران، پریشان	وارفتگی	:	بے خودی، آپے سے باہر ہونے کی حالت
سلوک	:	تلاشِ حق، نیک روی، صوفیوں کی اصطلاح میں حق تعالیٰ کی طلب	ندرت	:	عمدگی، انوکھا پن
سوز و گداز	:	وہ کیفیت جس سے متاثر ہو کر رقّت طاری ہو اور رونا آئے			

10.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰۔۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : اصغر گونڈوی کی شخصیت سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

سوال نمبر ۲ : اصغر کے فلسفیانہ نکات کی نشاندہی کیجیے۔

سوال نمبر ۳ : اصغر کے کلام میں ندرتِ بیان پر ایک نوٹ لکھیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰۔۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : اصغر گونڈوی کے حالاتِ زندگی پر ایک نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر ۲ : اصغر گونڈوی کی شاعری میں فلسفیانہ خیالات کے اظہار پر ایک مضمون سپردِ قلم کیجیے۔

سوال نمبر ۳ : اصغر کی شاعرانہ خصوصیات کی نشان دہی کیجیے۔

10.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ تاریخ ادب اردو: عہدِ میر سے ترقی پسند تحریک تک (جلد چہارم) از سیّدہ جعفر

۲۔ سرودِ زندگی از اصغر گونڈوی

۳۔ کلّیاتِ اصغر از کرن کانت

۴۔ کلّیاتِ اصغر (مقدمہ) از مجنوں گورکھ پوری

۵۔ نشاطِ روح از اصغر گونڈوی

10.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ اصغر حسین

﴿۲﴾ گورکھ پور میں

﴿۳﴾ ریلوے میں ٹائم کیپر کی

﴿۴﴾ عبدالغنی منگلوری

﴿۵﴾ تھیں نگاہِ شوق کی رنگینیاں چھائی ہوئی ☆ پردۂ محمل اٹھا تو صاحبِ محمل نہ تھا

﴿۶﴾ پرانے خیال کواس کی جگہ قائم رکھ کر طرزِ ادا سے اس میں نئی روح پھونکنے کو ندرتِ بیان یا ندرتِ ادا کہتے ہیں۔

﴿۷﴾ نہ ہوگا مستیِ بے مدّعا کا رازداں برسوں ☆ وہ زاہد جو رہا سرگشتۂ سود وزیاں برسوں

﴿۸﴾ ''سرودِ زندگی'' سے اخذ کی گئی ہے۔

﴿۹﴾ تیسرے شعر میں تشبیہ ہے۔

﴿۱۰﴾ جب ایک شے کو دوسری کے مماثل کہتے ہیں وہ بھی اس طرح کہ جس کے لئے تشبیہ دی گئی ہے اس کا حسن بڑھ جائے۔

﴿۱۱﴾ اصغؔر بیسویں صدی کے نصف اوّل کے شاعر ہیں۔

﴿۱۲﴾ اس غزل کا مرکزی خیال عملِ پیہم اور جذبۂ آزادی قرار دیا جا سکتا ہے۔

اکائی 11 : جگر مرادآبادی

ساخت

11.01 : اغراض ومقاصد
11.02 : تمہید
11.03 : جگر مرادآبادی کے حالاتِ زندگی
11.04 : جگر مرادآبادی کی شاعرانہ خصوصیات
11.05 : جگر مرادآبادی کی پہلی غزل
11.06 : جگر مرادآبادی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
11.07 : جگر مرادآبادی کی دوسری غزل
11.08 : جگر مرادآبادی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
11.09 : خلاصہ
11.10 : فرہنگ
11.11 : نمونہ امتحانی سوالات
11.12 : حوالہ جاتی کتب
11.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

11.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ جگر مرادآبادی کے حالاتِ زندگی، شخصیت، فن، شاعرانہ اہمیت اور ان کی شعری خصوصیات کا مطالعہ کریں گے۔ زیرِ نظر اکائی میں جگر کی دو غزلیں بھی شامل ہیں، جن کی تشریح سے آپ واقف ہو جائیں گے۔ ان غزلوں کے مطالعے سے آپ کو جگر کے کلام کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

11.02 تمہید

جگر مرادآبادی اردو کے بے حد مقبول اور مشہور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ انہوں نے اپنی شاعری اور آواز دونوں سے غزل کو ایک نئی زندگی دی اور اسے خواص وعوام میں مقبول بنایا۔ وہ اپنے زمانے کی آواز رہے۔ انہیں اردو شاعری میں جو مقبولیت ملی وہ کم لوگوں کو ملتی ہے۔ ان کے عہد کے تمام ناقدین نے ان کو ایک بڑا شاعر تسلیم کیا ہے۔

11.03 جگر مراد آبادی کے حالاتِ زندگی

جگر مراد آبادی کا اصل نام علی سکندر اور تخلّص جگر تھا۔ وہ ۱۸۹۰ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد کا تعلّق مولویوں کے خاندان سے تھا اور ان کے جدِّ اعلیٰ مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے اتالیق کے منصبِ جلیلہ پر فائز رہ چکے تھے۔ نسبتی امتیاز سے شیخ صدّیقی تھے اور سلسلۂ نسب ۳۶/واسطوں سے حضرت ابوبکر صدّیق سے ملتا تھا۔ چھ ماہ کی عمر میں جگر کے والد محمد علی نظر صاحب انہیں لے کر مراد آباد چلے آئے۔ ابتدائی تعلیم مراد آباد میں ہوئی۔ زمانے کے رواج کے مطابق جگر کو اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی تعلیم دی گئی۔ قرآن شریف مولانا محمد صدیق سے پڑھا۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا۔ کروی (ضلع باندہ) اور لکھنؤ میں انہوں نے انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور نویں جماعت تک انگریزی پڑھی۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ باقاعدی جاری نہ رہ سکا۔ کچھ دن باندہ میں اپنے چچا علی ظفر کے ساتھ رہ کر تعلیم حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد لکھنؤ چلے آئے۔

جگر نے تین شادیاں کیں۔ ان کی پہلی بیوی وحیدہ بیگم تھیں جن کا دو برس بعد انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اصغؔر گونڈوی کی سالی، نسیم بیگم سے جگر کی شادی ہوئی۔ لیکن جگر کی شراب نوشی اور دوسرے عوامل کی وجہ سے نسیم بیگم نے طلاق لے کر اصغؔر گونڈوی سے شادی کر لی۔ اصغر کے انتقال تک جگر شراب نوشی سے تائب ہو چکے تھے اور باقاعدہ زندگی گزار رہے تھے۔ لہٰذا اصغؔر کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق نسیم بیگم نے دوبارہ جگر سے شادی کر لی۔

جگر بچپن سے شاعرانہ مزاج لے کر آئے تھے۔ کم عمری میں ہی انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے پہلی غزل ۱۴/ یا ۱۵/ برس کی عمر میں کہی تھی۔ شاعری کا یہ شوق عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور خاندان کے ادبی ماحول نے مزید قوّت عطا کی۔ انہوں نے اپنے کلام پر سب سے پہلے داغؔ دہلوی سے اصلاح لی۔ یہ اصلاح خط و کتابت کے ذریعے لی گئی تھی لیکن یہ سلسلہ انتہائی مختصر تھا۔ اس کے بعد رساؔ رام پوری اور اصغر گونڈوی سے اصلاح لی۔ حالاں کہ اس کے باوجود انہوں نے اپنی الگ راہ نکالی۔ جگر کی ذاتی زندگی اور شاعری دونوں پر اصغؔر صاحب کا بہت گہرا اثر تھا۔ اصغؔر گونڈوی سے جگر کی ملاقات ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔ اس زمانے میں جگر ذہنی کشمکش اور روحانی اذیّت کا شکار تھے۔ حد سے بڑھی شراب نوشی نے ان کی زندگی سے ہر قسم کے نظم وضبط کو ختم کر دیا تھا۔ ازدواجی زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ایسے میں اصغؔر نے انہیں سنبھالا اور رفتہ رفتہ صحیح راہ پر لے آئے اور اپنی سالی سے شادی بھی کرا دی۔ جگر کی ذہنی تربیت میں اصغؔر نے اہم کردار ادا کیا۔ جگر فطرتاً انتہائی خلیق، وضع دار، ملنسار اور شریف النفس شخص تھے۔ خودداری اور قناعت پسندی ان کی فطرت کا اہم جز تھی۔ رندی و سرشاری کے زمانے میں بھی کوئی سبک بات یا حرکت ان سے سرزد نہیں ہوئی۔ وہ فیّاض اور شاہ خرچ بھی تھے بلکہ انہیں کسی قدر بے پروا بھی کہا جا سکتا ہے۔ جو بھی ہاتھ آتا تھا، بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر وبیشتر ان کا ہاتھ تنگ رہتا تھا۔

جگر کے کلام کے تین مجموعے ''داغِ جگر''، ''شعلۂ طور''، اور ''آتشِ گل'' شائع ہو چکے ہیں۔ ''داغِ جگر'' کے تعلّق سے قیاس ہے کہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ مرزا احسان احمد وکیل اعظم گڑھ نے مرتّب کر کے بزمِ ادب اعظم گڑھ سے شائع کیا تھا اور ۴۴/صفحات پر مشتمل ایک طویل مقدمہ بھی لکھا تھا۔ جگر کا دوسرا مجموعہ ''شعلۂ طور'' ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اس میں جگر کا منتخب کلام شامل تھا۔ حامد سعید خاں حامد بھوپالی نے اس مجموعے کو مرتّب کیا تھا۔ ''شعلۂ طور'' کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۴ء شائع ہوا اور اس میں اس وقت تک کا کل کلام شامل کر لیا گیا

تھا۔'آتشِ گُل' جگرؔ کا آخری مجموعہ ہے جو پہلی بار ڈھاکہ سے شائع ہوا جس میں رشید احمد صدیقی اور آلِ احمد سرور جیسے مشاہیرِ ادب نے مضامین لکھے تھے۔۱۹۵۸ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔آخری مجموعے 'آتشِ گُل' پر ساہتیہ اکادمی سے ۱۹۵۸ء میں پانچ ہزار روپیے کا انعام ملا۔ ڈاکٹر محمد اسلام نے لکھنؤ یونیورسٹی سے جگرؔ کی شخصیت اور ان کے فن پر مقالہ لکھ کر پی. ایچ. ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس کے علاوہ انہوں نے جگرؔ کے غیر مطبوعہ کلام کو نومبر ۱۹۶۴ء میں یادگارِ جگرؔ کے نام سے شائع کردیا۔جگرؔ کا انتقال ۱۹۶۰ء میں گونڈہ میں ہوا۔انتقال سے ایک برس پہلے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے انہیں ڈی.لٹ.کی اعزازی سند دی تھی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

(۱) جگرؔ کا پورا نام لکھیے۔

(۲) جگرؔ کی پیدائش کس شہر میں ہوئی؟

(۳) جگرؔ کے آخری مجموعے کا نام لکھیے۔

11.04 جگرؔ مرادآبادی کی شاعرانہ خصوصیات

جگرؔ غزل کے شاعر ہیں اور غزل دراصل حُسن و عشق کی داستان ہے لیکن غزل صرف حسن و عشق تک ہی محدود نہیں ہے۔شعرا نے غزل میں ہجر و وصال کی کہانیوں کے علاوہ غمِ روزگار، مسرت و خوشی اور دنیا کی بے ثباتی کے مضامین بھی نظم کیے ہیں۔غزل دراصل ہمارے تاثرات، احساسات اور جذبات کی آئینہ دار ہے۔وہ ہمیں شاعری کی دوسری اصناف کے مقابلے زیادہ متاثر کرتی ہے۔غزل میں ردیف و قافیے کے استعمال کے سبب ہمیں اس میں موسیقی دل فریب لگتی ہے۔غزل میں استعمال ہونے والے الفاظ ساقی، گل، آشیاں اور بلبل صرف وہی معنی نہیں رکھتے جو بظاہر نظر آتے ہیں بلکہ مختلف مقامات پر مختلف معنی اور مفہوم رکھتے ہیں اور کہیں ان الفاظ کا استعمال صرف عشقیہ مفہوم میں ہوتا ہے۔

جگرؔ حالاں کہ کسی بھی انجمن سے وابستہ نہیں رہے لیکن انہوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ اپنے کلام میں ضرور لیا ہے۔اس لئے ''داغِ جگر''، ''شعلۂ طور'' اور ''آتشِ گُل'' کے کلام میں اتنا فرق محسوس ہوتا ہے۔چنانچہ ان کے ابتدائی کلام میں گہرائی، دل کشی اور رنگینی نہیں ملتی۔حالاں کہ جگرؔ سیاست سے بہت دور رہے مگر انہوں نے اپنے عہد کے حقائق سے چشم پوشی نہیں کی۔مثلاً انہوں نے قحطِ بنگال کے واقعے سے متاثر ہو کر بڑی خوب صورت غزل کہی ہے ۔

بنگال کے میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں　　ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں
افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ　　بے گور و کفن خاک بسر دیکھ رہا ہوں
بچّوں کا تڑپنا وہ بلکنا و سسکنا　　ماں باپ کو مایوسِ نظر دیکھ رہا ہوں

جگرؔ کو ہندوستان کی آزادی کا بے صبری سے انتظار تھا۔ساتھ ہی کامیابی کا یقین بھی تھا۔چنانچہ اپنی ایک غزل میں وہ اپنے ہم وطنوں کو آزادی کی خوش خبری اس طرح دیتے ہیں ۔

ارباب وطن کو مری جانب سے ہو مژدہ　　اغیار کو مجبورِ سفر دیکھ رہا ہوں
رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیّرِ تاباں　　ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں
بیداریِ آزادی و اخلاص و محبت　　اک خلد در آغوشِ نظر دیکھ رہا ہوں
جو خواب کہ شرمندۂ تعبیر تھا اب تک　　اس خواب کی تعبیر جگرؔ دیکھ رہا ہوں

لیکن آزادی کے بعد آئی تباہی نے جگرؔ جیسے محبت کرنے والے شخص کو مغموم کر دیا۔ وہ اس صورتِ حال سے مضطرب ہو گئے اور ان کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ اپنی نظموں اور غزلوں میں انہوں نے ان باتوں کی شکایت کی کہ کیسے تقسیمِ ہند کے وقت لوگ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ ان کے خیال میں یہ آزادی ایک بے جان جسم کی شکل میں ہمارے سامنے آئی۔

کہتے ہیں جس کو صورتِ آزادیِ وطن
دراصل ایک پیکرِ بے جاں ہے آج کل

﴿۱﴾ جگرؔ کا تصوّرِ عشق

جگرؔ کی شاعری بھی عشقیہ شاعری ہے۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں شوخی اور عاشقانہ مضامین ملتے ہیں۔ جگرؔ کی ۱۹۳۲ء تک کی شاعری پر روایتی غزل گوئی کا بہت گہرا عکس نظر آتا ہے۔ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام شعلۂ طور ۱۹۳۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ بھی غزلوں کا مجموعہ ہے لیکن جگرؔ کی اس دور کی شاعری داغؔ اور امیر اللہ خاں تسلیمؔ کی غزلوں کے اثر سے خود کو آزاد نہیں کر سکی۔

جگرؔ کے تیسرے مجموعۂ کلام ''آتشِ گل'' کے مطالعے سے ان کی اصل اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں ان کا تصوّرِ حُسن و عشق زیادہ معصوم اور زیادہ صحت مند نظر آتا ہے۔ جگرؔ کی شاعری کا ترنّم اور کیفیت فوری طور پر ذہن و دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ فانیؔ کی شاعری پڑھنے والوں کو غم کا شکار بنا دیتی ہے لیکن جگرؔ کی شاعری ہمیں افسردہ کرنے کے بجائے ایک میٹھے میٹھے درد سے روشناس کراتی ہے۔

جیسا کہ ابتدا میں آپ نے پڑھا کہ غزل کا غالب موضوع حُسن و عشق ہے اور جگرؔ خالصتاً غزل ہی کے شاعر ہیں۔ اس لئے ان کی غزل کا غالب موضوع بھی حسن و عشق ہی ہے۔ یہ جذبۂ عشق ان کی ابتدائی شاعری سے لے کر آخری دَور کی شاعری تک ان کی شعری فکر کا حصہ بنا رہا۔ وہ سرشاری و سرمستی جو سچّے عاشق کی فطرت کا لازمی عنصر بن جاتی ہے، جگرؔ کی شخصیت اور ان کے فن دونوں پر چھائی رہی۔ وہ دولخت شخصیت کے مالک نہیں تھے۔ جذبۂ عشق نہ صرف یہ کہ ان کے کلام بلکہ ان کی اپنی زندگی پر بھی عمر بھر حاوی رہا۔ جگرؔ عشق کو زندگی کا سب سے مشکل مرحلہ سمجھتے تھے۔ عشق کرنا آگ کے دریا کو پار کرنا ہے۔

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

وہ عشق میں مصلحت کے قائل نہیں۔ عاشق وہی ہے جو آگ کے دریا کو پار کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو اور جب عشق اس مقام پر پہنچ جائے تو پھر سرشاری و سرمستی پیدا ہوتی ہے کہ محبت کرنے والے کو محبت کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا۔

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

جگر کا جذبۂ عشق محبوب سے مکمّل اور مستقل قرب کا خواہاں ہے۔ عاشق کی محبوب سے دوری اس کی موت ہے اور وہ سرشاری و سرمستی کے قائل ہیں۔ لیکن یہ کیفیت کوشش سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ جگر کے اشعار کی یہ بھی خاصیت ہے کہ ان میں جذبۂ عشق کا بیان شدّتِ احساس لیے ہوئے ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں
تری امانتِ غم کا تو حق ادا کرلوں
خدا کرے شبِ فرقت ابھی دراز رہے

﴿۲﴾ جگر کا تصوّرِ محبوب

جگر کی شاعری کا محبوب سماوی نہ ہو کر ارضی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو غزل کے روایتی محبوب کی طرح یہ بھی مغرور اور خود پسند ہے۔ جگر محبوب کو رُسوا نہیں کرتے بلکہ اس کا احترام کرتے ہیں۔ پھر وہ محبوب سے عرضِ حال کے بھی قائل نہیں لیکن ان کا محبوب عاشق کے جذبۂ صادق سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ جگر چوں کہ آدابِ محبت کے قائل ہیں، اس لئے محبوب کی بارگاہ میں دل کی خواہش کا اظہار کرنے سے خود کو روکتے ہیں۔ ذیل میں چند اشعار دیے جارہے ہیں، جن سے جگر کی غزلوں میں تصوّرِ محبوب پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

اُف! وہ رُوئے تاب ناک وچشمِ تر میرے لئے
ہائے رے زلفِ پریشاں تا کمر میرے لئے
حسن کی بارگاہ میں رکھیے قدم سنبھال کر
یہ وہ مقام ہے جہاں خواہشِ دل حرام ہے
کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا، اُن کو پیار آ ہی گیا

﴿۳﴾ جگر اور تصوّف

جگر صوفی نہیں تھے۔ اصغر کی صحبت نے ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ ضرور پیدا کردیا۔ ان کا تصوّرِ عشق خالص صوفیانہ نہیں تھا، بلکہ اس میں ارضی تصوّرِ عشق بھی شامل تھا۔ اسی لئے اس کی رنگینی کم نہیں ہوئی۔ جگر نے جن مسائل تصوّف پر اشعار کہے ہیں وہ کم وبیش وہی ہیں کہ جن پر اردو کے صوفی شعرا کہتے رہے ہیں۔ اصغر گونڈوی چوں کہ خود بھی صوفی شاعر تھے اور جگر ان کے بے حد قریب تھے، اس لئے ان کا اثر بھی جگر پر پڑا اور انھوں نے تصوّف کے مسائل پر اشعار کہے۔ یوں تو جگر کا تصوّرِ عشق خالصتاً مجازی وارضی ہے مگر عشقِ حقیقی کی پرچھائیاں بھی اس پر پڑتی نظر آتی ہیں اور یہ تصوف کا ہی اثر ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا فلسفہ تصوّف کا محبوب موضوع ہے۔ جگر نے بھی اس موضوع پر اشعار کہے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں، جو تصوّف کے تعلّق سے جگر نے کہے ہیں:

میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا
اس سوال و جواب نے مارا
کوئی نہ یہاں عدم نہ ہستی
اوّل و آخر جو کچھ ہے تو ہے
صوفی نے جس کو شاہدِ مطلق سمجھ لیا
اک پَرتوِ لطیف تھا حُسنِ مجاز کا
چشمِ نظر پرست میں جس کا جہان نام ہے
حسنِ تمامِ یار کا جلوۂ ناتمام ہے

غرض کی جگر کے مجموعۂ کلام''آتشِ گل'' کی شاعری نے اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبے کی نشان دہی کر دی۔ان کے دو ابتدائی مجموعہ ہائے کلام کے مقابلے میں''آتشِ گل'' کی عشقیہ شاعری بلند پایہ ہے جس کے سبب جگر کا شمار ہماری زبان کے اہم غزل گوشعرا میں ہوتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

(۴) جگر کس صنف کے شاعر تھے؟

(۵) ''شعلۂ طور'' پہلی بار کب شائع ہوا؟

(۶) جگر اپنے ہم وطنوں کو کس چیز کی خوش خبری دے رہے ہیں؟

11.05 جگر مرادآبادی کی پہلی غزل

(۱)

(۱) عشق کی یہ نمودِ پیہم کیا
ہو تمہی تم اگر تو پھر ہم کیا

(۲) جز ترے کچھ نظر نہیں آتا
آرزو بن گئی مجسّم کیا

(۳) ترا ملنا ترا نہیں ملنا
اور جنّت ہے کیا جہنّم کیا

﴿۴﴾ اس نظر میں نہیں سماتا کچھ
جانِ بے تاب و چشمِ پر نم کیا

﴿۵﴾ عشقِ خاموش کے مزے ہیں جگؔر
جوش و فریاد و شور و ماتم کیا

11.06 جگؔر مرادآبادی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ اِس غزل کے پانچ اشعار شاملِ نصاب ہیں۔ یہ غزل تصوفانہ خیالات پر مبنی ہے۔ جگؔر کہتے ہیں کہ اگر ہر جگہ خدا ہی کا جلوہ ہے تو پھر ہماری کیا حیثیت ہے؟۔ محبوب کے علاوہ کچھ بھی دِکھائی نہیں دیتا، ایسا لگتا ہے کہ میری آرزو نے ایک جسم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اگر محبوب مِل جائے تو زندگی جنت ہے اور نہ مِلے تو جہنم ہے۔ عاشق چاہے جتنی آہ وزاری کرے، آنسو بہائے یا اپنا حلیہ تک بگاڑ لے مگر ظالم محبوب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اے جگؔر! خاموش رہ کر عشق کے مزے لیتے رہو کیوں کہ رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: یہ بہت خوب صورت شعر ہے۔ اس شعر میں جگؔر نے صوفیانہ انداز میں اپنی بات کہی ہے۔ شاعر کو محبت میں وہ مقام حاصل ہو گیا ہے جس میں ہر طرف محبوب ہی نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ عشق کی یہ کیسی پے در پے نمائش ہے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اے محبوب! مجھے چاروں طرف تو ہی تو نظر آتا ہے۔ ہماری یعنی عاشق کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر ہر طرف تیرا ہی جلوہ ہے تو ہمارا اس دنیا میں کیا مقام ہے۔ یعنی ہر چیز میں خدا کا ہی جلوہ ہے جدھر دیکھو وہی نظر آتا ہے، جس چیز میں دیکھو اسی کی قدرت عیاں ہے۔ ایسے میں انسان کی کیا حقیقت ہے۔

دوسرا شعر: اے دوست! ہم ہر پل تیرے بارے میں سوچتے رہتے ہیں ہمیں دنیا کی ہر شے میں تو ہی تو دکھائی دیتا ہے۔ لگتا ہے ہماری آرزو نے جسم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اسی لئے ہمیں دنیا میں صرف تو ہی تو نظر آتا ہے۔ شاعر محبوب کے تصوّر میں اس قدر ڈوب چکا ہے کہ اسے اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

تیسرا شعر: شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے کہ اس کی زندگی صرف محبوب کے بارے میں سوچتے گزر گئی۔ محبوب سے وصال اور اس سے جدائی اِنہی دو باتوں کے درمیان زندگی ختم ہو گئی۔ یعنی اے دوست! تو اگر مل جائے تو زندگی ہمارے لئے جنّت ہے اور تو نہ ہو تو پھر یہ زندگی جہنّم ہے۔ ہمیں اس زندگی میں کوئی دل چسپی نہیں۔ محبوب کے بغیر یہ زندگی بے مزہ اور بے کار ہے۔

چوتھا شعر: محبوب کی شکایت غزل کی روایت رہی ہے۔ جگؔر بھی اس میں شعر کہتے ہیں کہ ہم اپنے محبوب کی محبت میں بے قرار ہیں۔ دن رات اس کے لئے تڑپ رہے ہیں مگر اسے کسی چیز کی قدر نہیں۔ یہاں تک کہ ہماری آنسوؤں سے بھری آنکھیں بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ ہماری تڑپتی ہوئی جان اسے ذرا بھی متاثر نہیں کرتی۔ اسے ہماری محبت کا ذرا بھی پاس نہیں۔

پانچواں شعر: جگؔر اس شعر میں اپنے تخلّص سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے جگؔر! اگر محبت کی ہے تو قوّتِ برداشت بھی اپنے اندر پیدا کرو۔ آہ وزاری یا فریاد محبت کرنے والوں کا شیوہ نہیں۔ کیوں کہ خاموش محبت میں جو لطف ہے وہ فریاد کرنے میں نہیں ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ شاعر کو چاروں طرف کون نظر آتا ہے؟

﴿۸﴾ محبوب سے ملنا شاعر کے لئے کیسا ہے؟

﴿۹﴾ شاعر کی نظر میں کون سی محبت اہمیت رکھتی ہے؟

11.07 جگرؔ مرادآبادی کی دوسری غزل

﴿۲﴾

﴿۱﴾ کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر، کبھی غنچہ وگل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصلِ بہار پر

﴿۲﴾ مجھے دیں نہ غیظ میں دھمکیاں، گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مری سلطنت یہی آشیاں مری ملکیت یہی چار پر

﴿۳﴾ عجب انقلابِ زمانہ ہے، مِرا مختصر سا فسانہ ہے
یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوے یار پر

﴿۴﴾ مری سمت سے اُسے اے صبا! یہ پیامِ آخرِ غم سنا
ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پر

﴿۵﴾ میں رہینِ درد سہی مگر مجھے اور چاہیے کیا جگرؔ
غمِ یار ہے مرا شیفتہ، میں فریفتہ غمِ یار پر

11.08 جگرؔ مرادآبادی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ اِس غزل کے پانچ اشعار شاملِ نصاب ہیں۔ جگرؔ کہتے ہیں کہ ایک پرندہ چمن میں کہیں بھی رہ کر موسمِ بہار کے مزے لے سکتا ہے۔ یہ چمن ہی اُس پرندے کا ٹھکانہ ہے، بجلیاں چاہے جتنی بار دھمکی دیں یا اُس کے آشیانے پر گریں، اُسے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی، ذرا دیکھو تو کہ یہی سر جو اب کندھے پر بوجھ محسوس ہو رہا ہے، کل تک یہی سر محبوب کے زانو پر رکھا ہوا تھا۔ اے صبا! میرے محبوب کو یہ پیغام سُنا دے کہ اے میری تباہی کی خواہش رکھنے والے! اِس وقت میری تباہی اپنے شباب پر ہے اگر تُو دیکھنے کا شوق رکھتا ہے تو جلد از جلد آ جا۔ اے جگرؔ! میں درد کا احسان مند ہوں کیوں کہ یار کا غم میرا دیوانہ ہے اور میں غمِ یار پر فدا ہوں، اِس کے علاوہ مجھے اور کیا چاہیے؟۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: اس شعر میں جگر نے وطن سے اپنے تعلّق کا بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ پرندہ چمن میں چاہے جہاں رہے وہ درخت کی کسی شاخ پر آشیانہ بنائے یا کہیں اور، سارے چمن سے اس کا تعلّق ہے، چمن کی ہر شے پر اس کا حق ہے۔اسی طرح میں بھی اپنے وطن سے محبت کرتا ہوں۔وطن میں میرا گھر کسی بھی جگہ ہو میرا حق تو وطن کی ہر چیز پر ہے۔

دوسرا شعر: شاعر اپنی بات پھر اشارے میں بیان کر رہا ہے۔چمن میں رہنے والے پرندے کا گھر اس کا آشیانہ ہے، چاہے آشیانے پر کتنی ہی بجلیاں گریں یا مصیبتیں آئیں، پرندہ اپنے گھر سے دور نہیں جا سکتا۔کیوں کہ اس کی بادشاہت وہی اس کا چھوٹا سا گھونسلہ ہے۔آشیانے کے علاوہ اگر اس کے نزدیک کوئی شے اہم ہے تو وہ اس کے پر ہیں۔پرندہ اپنے آشیانے اور پروں کا عاشق ہے،شاعر اپنے وطن کا۔اسی لئے وہ کہتا ہے کہ چاہے مجھے کتنی ہی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں، میں اپنے وطن سے دور نہیں ہو سکتا۔میرا سرمایہ یہی وطن ہے۔دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت مجھے میرے وطن سے جدا نہیں کر سکتی۔میں کسی کے غیظ و غضب سے خوف زَدہ ہونے والا نہیں۔

تیسرا شعر: دنیا عجب جگہ ہے، وقت اور زمانہ کبھی یکساں نہیں رہتا۔انقلاب آتے رہتے ہیں، تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔میری زندگی کی کہانی اگر چہ مختصر ہے مگر وقت کی رفتار نے اسے بھی نہیں بخشا۔زمانے کے ساتھ میری زندگی میں بھی تبدیلیاں آئی ہیں۔وہ سر، جو کبھی دوست کے زانو پر تھا، آج وہی سر میرے کاندھوں پر بوجھ بن چکا ہے۔یعنی زندگی پہلے پر سکون تھی، خوشیوں سے بھر پور تھی۔مگر زمانے کے اتار چڑھاؤ نے سارے حالات تبدیل کر دیے۔آج وہی خوب صورت زندگی ہمارے لئے بوجھ بن چکی ہے۔

چوتھا شعر: شاعر اپنی جانب سے محبوب کو ایک آخری پیغام صبا کے ذریعے بھیج رہا ہے۔وہ کہتا ہے اے ہوا! تیرا گزر تو ہر جگہ ہے، تجھے تو محبوب کی گلی میں جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔جب تو ادھر سے گزرے تو میرا بھی ایک کام کرنا۔میرے محبوب کو یہ پیغام دینا کہ میں پورے طور سے تباہ و برباد ہو چکا ہوں۔وہ مجھے تباہ کرنا چاہتا تھا آج میری بربادی عروج پر ہے۔اگر اسے اپنی زیادتیوں کا نتیجہ دیکھنا ہے تو آجائے اور دیکھ لے کہ میں زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہوں۔

پانچواں شعر: جگر کی غزل کا یہ آخری شعر ہے۔بڑے خوب صورت انداز میں وہ اپنی بات کہتے ہیں۔میں درد کا احسان مند ہوں اور اس کے علاوہ مجھے کسی اور چیز کی خواہش نہیں ہے۔یہ درد ہی میرا اصل ساتھی ہے۔محبت کے اس درد نے مجھے جینا سکھا دیا ہے۔ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں۔دوست کا غم میرا شیفتہ ہے اور میں اس پر فدا ہوں، اس کا عاشق ہوں۔یہی سبب ہے کہ مجھے جینے کے لئے کسی اور شے کی ضرورت نہیں میں خوش ہوں کہ دوست کے ذریعے دیا گیا غم میرا ساتھی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ شاعر کی چمن سے کیا مراد ہے؟

﴿۱۱﴾ شاعر کا مختصر فسانہ کیا ہے؟

﴿۱۲﴾ شاعر کس چیز پر فریفتہ ہے؟

11.09 خلاصہ

جگر مرادآبادی کا اصل نام علی سکندر اور تخلص جگر تھا۔ ۱۸۹۰ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد علی نظر تھا۔ ابتدائی تعلیم مرادآباد میں ہوئی، بعد میں باندہ چلے گئے اور چچا کے ساتھ رہ کر تعلیم حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد لکھنؤ چلے آئے۔ جگر نے بچپن سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ رسا رام پوری اور اصغر گونڈوی سے اصلاح لی۔ خاص طور پر وہ اصغر سے بہت متاثر ہوئے۔ جگر کے تین شعری مجموعے ''داغِ جگر''، ''شعلۂ طور'' اور ''آتشِ گل'' شائع ہو چکے ہیں۔ آخری مجموعے پر ساہتیہ اکادمی نے انعام بھی دیا۔ جگر کا انتقال ۱۹۶۰ء میں گونڈہ میں ہوا۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے انہیں ڈی.لٹ کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی۔

جگر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کا غالب موضوع داستانِ حسن و عشق ہے۔ لیکن جگر کا تصوّرِ حسن و عشق ایک قسم کی معصومیت سے سرشار ہے۔ وہ ایک مترنّم شاعر تھے۔ ان کے اشعار میں بلا کی موسیقیت پائی جاتی ہے۔ جہاں تک عصری آگہی اور سماجی شعور کی بات ہے تو جگر کا کلام اس سے بھی محروم نہیں ہے۔ قحطِ بنگال اور تقسیمِ ہند جیسے موضوعات پر انہوں نے اپنے غزلیہ اشعار میں غزل کی تمام تر روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اظہارِ خیال کیا ہے۔ شاملِ نصاب جگر کی دونوں غزلیں ان کے کلام کی خصوصیات کا احاطہ کرتی ہیں۔ پہلی غزل میں انہوں نے جلوۂ محبوب کی ہمہ گیریت، تصوّرِ محبوب، عاشق سے معشوق کی بے اعتنائی اور معاملاتِ عشق میں فریاد و ماتم سے ممانعت جیسے مضامین کو نظم کیا ہے۔ دوسری غزل میں جگر نے اپنی ذات اور اس کے اختیارات کو چمن اور پرندہ کی رعایت سے بیان کیا ہے۔ جگر کے مطابق وقت ہمیشہ یکساں نہیں رہتا اور حالات بدلتے رہتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میرے محبوب کو بلاؤ تا کہ وہ میری بربادی دیکھ لے۔ کیوں کہ اسے یہی مقصود تھا۔ آگے ان کا کہنا ہے کہ میرا درد دل ہی اب میرا ساتھی ہے اور مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ یہ دونوں غزلیں روایتی طرزِ اظہار کا نمونہ ہیں لیکن ان میں لہجے کی وہ تمکنت پائی جاتی ہے جو جگر کے اندازِ بیان کی خصوصیت ہے۔

11.10 فرہنگ

ارباب	: لوگ	رہین	: مرہون/احسان مند
اصناف	: صنف کی جمع، قسم	زانو	: ران، گھٹنے کے اوپر کا حصہ
اعزاز	: عزّت، توقیر، مرتبہ	ساغر	: پیمانہ
انجمن	: محفل	سلطنت	: بادشاہت
انقلابِ زمانہ	: زمانے کی گردش	سند	: ثبوت، نظیر، سرٹیفکیٹ
بکف	: ہاتھ میں	شمشیر	: تلوار
بہتات	: زیادتی/کثرت	شیفتہ	: فریفتہ/عاشق
بے ثباتی	: ناپائیداری	عہد	: زمانہ
پیام	: پیغام	غمِ یار	: دوست کا غم
پیہم	: لگاتار	غیظ	: سخت غصّہ

جانِ بے تاب	:	تڑپتی ہوئی جان	فریفتہ	:	دیوانہ، عاشق
جز	:	سوائے	قافیہ	:	شعر میں استعمال ہونے والے ہم وزن الفاظ
جلا	:	چمک/روشنی	گور	:	قبر
چشمِ پرنم	:	آنسوؤں سے بھری آنکھیں	مژدہ	:	خوش خبری
خزاں	:	پت جھڑ	مجسم	:	جسم بنایا ہوا
دل فریب	:	خوب صورت	ملکیت	:	بادشاہت
دوش	:	کاندھا	ناصح	:	نصیحت کرنے والا
راغب	:	مائل	نمود	:	نمائش
ردیف	:	شعر کے آخر میں بار بار آنے والا لفظ	وصال	:	ملاقات
رند	:	شرابی	ہجر	:	جدائی

11.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰۔۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : جگر مرادآبادی کی ابتدائی تعلیم کس طرح ہوئی؟

سوال نمبر۲ : جگر کی شاعری کی اہم خصوصیات پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔

سوال نمبر۳ : آزادی ملنے کے بعد بھی جگر کا دل خوش کیوں نہ ہوا؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰۔۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : جگر مرادآبادی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : جگر کی ابتدائی شاعری اور ''آتشِ گل'' کی شاعری میں فرق واضح کیجیے۔

سوال نمبر۳ : جگر کی پہلی اور دوسری غزل سے اپنی پسند کے تین تین اشعار کی تشریح کیجیے۔

11.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ تاریخ ادب اردو از اعجاز حسین

۲۔ جگر فن اور شخصیت از شارب ردولوی

۳۔ جگر مرادآبادی حیات اور شاعری از محمد اسلم

11.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ جگر کا پورا نام علی سکندر ہے۔

﴿۲﴾ جگر کی پیدائش بنارس میں ہوئی۔

﴿۳﴾ جگرؔ کے آخری مجموعۂ کلام کا نام ''آتشِ گُل'' ہے۔

﴿۴﴾ جگرؔ غزل کے شاعر تھے۔

﴿۵﴾ ''شعلۂ طور'' ۱۹۳۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔

﴿۶﴾ جگرؔ اپنے ہم وطنوں کو آزادی کی خوش خبری دے رہے ہیں۔

﴿۷﴾ شاعر کو چاروں طرف محبوب نظر آتا ہے۔

﴿۸﴾ محبوب سے ملنا شاعر کے لئے جنّت ہے۔

﴿۹﴾ شاعر کی نظر میں خاموش محبت اہمیت رکھتی ہے۔

﴿۱۰﴾ شاعر کی چمن سے مراد اپنا ملک ہے۔

﴿۱۱﴾ شاعر پہلے محبوب سے قریب تھا مگر بعد میں وہ محبوب کے ساتھ نہ رہ سکا۔

﴿۱۲﴾ شاعر غمِ یار پر فریفتہ ہے۔

✵

اکائی 12 : یگانہ چنگیزی

ساخت

12.01 : اغراض ومقاصد

12.02 : تمہید

12.03 : یگانہ چنگیزی کے حالاتِ زندگی

12.04 : یگانہ چنگیزی کی شاعرانہ خصوصیات

12.05 : یگانہ چنگیزی کی پہلی غزل

12.06 : یگانہ چنگیزی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

12.07 : یگانہ چنگیزی کی دوسری غزل

12.08 : یگانہ چنگیزی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

12.09 : خلاصہ

12.10 : فرہنگ

12.11 : نمونہ امتحانی سوالات

12.12 : حوالہ جاتی کتب

12.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

12.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں یگانہ چنگیزی کی حیات اور شخصیت کا اجمالی تذکرہ اوران کی شاعری کی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یگانہ کی دوغزلیں بھی شامل کی جارہی ہیں۔ دونوں غزلوں پر مجموعی تبصرے کے ساتھ ہی تمام اشعار کی تشریح عام فہم زبان میں کی جائے گی۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد امید کی جاتی ہے کہ آپ یگانہ کی شاعری، ان کے رنگ وآہنگ اوران کے منفرد لب ولہجے سے خاطر خواہ واقف ہوسکیں گے۔

12.02 تمہید

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جن شعرا کے حصے میں بہت زیادہ شہرت ومقبولیت آئی ان میں یاسؔ یگانہ چنگیزی کا بھی نام آتا ہے۔ البتّہ یہ بات بالکل الگ ہے کہ جہاں ان کو جتنی مقبولیت اپنی شاعری سے حاصل ہوئی، اس سے زیادہ تشہیر ’غالب شکن‘ ہونے کے باعث نصیب ہوئی۔ ان کی شاعری اور شخصیت کا ایک مخصوص رنگ ہے۔ ان کا تعلّق کسی دبستان سے نہیں تھا۔ روزمرّہ، محاورے اور زبان کے دروبست پر انہیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ یگانہ کی شاعری اور شخصیت سے طلبا کو واقف کرانے کی غرض سے یہ اکائی شاملِ نصاب ہے۔

12.03 یگانہ چنگیزی کے حالاتِ زندگی

نام مرزا واجد حسین، پہلے یاس تخلّص کرتے تھے بعد میں یگانہ ہوگئے۔ان کے اجداد ایران سے ہندوستان آئے۔یگانہ چنگیزی ۲۷؍ ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۷؍اکتوبر ۱۸۸۴ء کو پٹنہ کے محلے مغل پورہ میں پیدا ہوئے۔پانچ چھ سال کی عمر سے مکتب میں داخل ہوئے۔فارسی کی چند کتابیں پڑھنے کے بعد عظیم آباد (پٹنہ) کے محمّڈن عربک اینگلو اسکول میں نام لکھوایا گیا۔اسکول میں ہمیشہ اوّل رہے۔ ہر سال وظیفہ اور انعام پاتے رہے۔۱۹۰۳ء میں انٹرنس پاس کیا۔۱۹۰۴ء میں مٹیا برج کلکتہ تشریف لے گئے۔جہاں شہزادہ مرزا مقیم بہادر کے صاحب زادوں شہزادہ محمود یعقوب علی مرزا اور شہزادہ یوسف علی مرزا کی انگریزی تعلیم کے استاد مقرّر رہوئے۔لیکن کلکتہ کی آب وہوا راس نہیں آئی اور کچھ دنوں بعد وطن واپس چلے آئے۔علاج کے سلسلے میں لکھنؤ آئے اور لکھنؤ کی فضا ایسی راس آئی کہ اچھے ہو کر بھی واپس جانا گوارا نہیں کیا۔لکھنؤ ہی میں ۱۹۱۳ء میں شادی کر کے اسی کو اپنا وطن بنالیا۔

یگانہ کا لکھنؤ کا قیام بڑا ہنگامہ خیز اور معرکہ آرا رہا،جس کا اثر ان کے فن پر بھی پڑا۔معرکہ آرائیوں نے بھی ان کے فن کو جلا بخشی۔شروع میں لکھنؤ کے شعرا سے ان کے تعلّقات خوش گوار تھے۔اتنا ہی نہیں وہ عزیزؔ،صفیؔ اور ثاقبؔ ومحشرؔ وغیرہ کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔جب عزیزؔ کی سرپرستی میں رسالہ ’’معیار‘‘ جاری ہوا اور معیار پارٹی وجود میں آئی تو یگانہ بھی اس پارٹی کے مشاعروں میں غالبؔ کی زمینوں میں غزلیں پڑھنے لگے۔ان طرحی مشاعروں کی جو غزلیں ’’معیار‘‘ میں چھپی ہیں ان میں بھی یگانہ کی غزلیں شامل ہیں۔لیکن یہ تعلّق بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکا اور لکھنؤ کے اکثر شعرا سے یگانہ کی چشمک ہوگئی۔اس سلسلے میں مالک رام بہ زبانِ یگانہ تحریر کرتے ہیں کہ:

> ’’اب اِس میں میرا کیا قصور! یہ خدا کی دین ہے۔میرا کلام پسند کیا جانے لگا۔باہر کے مشاعروں میں بھی جانا پڑتا۔میری یہ ہردل عزیزی اور مقبولیت ان لوگوں سے دیکھی نہ گئی‘‘۔

یگانہ سے اہلِ لکھنؤ کی چشمک کا معاملہ کچھ یوں تھا کہ ’’معیار‘‘ پارٹی کے مشاعروں میں ان کے کلام پر خندہ زنی کی جاتی تھی اور بے سروپا اعتراضات کیے جاتے تھے مگر یہ سب کچھ زبانی ہوتا تھا۔اصلی اور تحریری جنگ کا آغاز خود یگانہ نے کیا۔اس کے بعد ایک دوسرے کے خلاف لکھنے کا سلسلہ چل پڑا۔جس کی انتہا ’’شہرتِ کاذبہ‘‘ نامی یگانہ کی ایک کتاب ہے۔لکھنؤ کے شعرا غالبؔ کے بڑے قائل تھے۔لٰہذا یگانہ کے لئے اب یہ بات بھی ناگزیر ہوگئی تھی کہ وہ غالبؔ کی بھی مخالفت کریں۔غالبؔ کی مخالفت کے سلسلے میں انہیں اندھا مخالف نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ انہوں نے خود کہا ہے کہ:

> ’’یہ کس نے آپ کو بہکا دیا کہ میں غالبؔ کا مخالف ہوں،وہ یقیناً بہت بڑا شاعر ہے۔صاحب! غالبؔ کی صحیح قدر ومنزلت مجھ سے زیادہ کون سمجھے گا،مجھے غصّہ اس بات پر آتا ہے کہ لوگ اس کے جائز مقام سے زیادہ اس کو دینا چاہتے ہیں اور پھر ستم یہ ہے کہ یہ بھی وہ لوگ نہیں، جو اس کا صحیح مقام سمجھتے ہوں، بلکہ وہ جو تقلیداً اسے بڑا سمجھتے ہیں......تو صاحب! میں غالبؔ کے خلاف نہیں تھا،اور نہ ہوں،لیکن میں اس کی جائز جگہ سے زیادہ اس کے حوالے کردینے پر تیار نہیں۔‘‘

(مضمون از۔مالک رام)

یگانؔہ نے اس مخالفت کے چلتے اپنے آپ کو ''آتشؔ کا مقلد'' کہنا شروع کر دیا اور اپنے مجموعۂ کلام ''نشترِ یاس'' کے سرِ ورق پر اپنے نام سے پہلے ''خاکِ پائے آتشؔ'' لکھا اور جب اس کے ایک سال بعد ''چراغِ سخن'' شائع ہوا تو انھوں نے آپنے آپ کو ''آتشؔ پرست'' کے درجے تک پہنچا دیا۔اسی بنیاد پر انھوں نے آتشؔ اور غالبؔ کا تقابلی مطالعہ کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آتشؔ، غالبؔ سے بڑا شاعر ہے۔ یہ مضمون رسالہ ''خیال''، نومبر ۱۹۱۵ء میں ''غالبؔ شکن'' کے نام سے شائع کیا۔دوبارہ اسے مزید اضافوں کے ساتھ ۱۹۳۵ء میں چھاپا۔اس مخالفت کی وجہ سے یگانؔہ کا اچھا خاصا وقت ضائع ہو گیا کیوں کہ اس مخالفت سے نہ تو شعرائے لکھنؤ کا کچھ ہوا اور نہ ہی غالبؔ کو کچھ نقصان پہنچا بلکہ یگانؔہ ہی خسارے میں رہے کہ اپنی شاعری پر پوری طرح توجّہ نہ دے سکے۔

ان سب مخالفتوں اور معرکہ آرائیوں کے باوجود یگانؔہ کا ایک گروپ تھا، جن سے ان کے اچھّے مراسم تھے۔۱۹۱۹ء میں انھوں نے ایک ادبی انجمن ''انجمن خاصانِ ادب'' کے نام سے قائم کی۔اس انجمن کے صدر بےخودؔ موہانی، سکریٹری یگانؔہ اور جوائنٹ سکریٹری عبدالباری آسیؔ تھے۔اس انجمن کے اعزازی رکن اور سرپرستوں میں فصاحتؔ لکھنوی اور سیّد رضوی ادیبؔ جیسے لکھنوی اہلِ قلم شامل تھے۔

زندگی کے دوسرے مشاغل کے ساتھ ساتھ یگانؔہ کی ملازمت کا سلسلہ بھی ناہمواری کا شکار رہا۔ایک عرصے تک وہ ''اودھ اخبار'' سے وابستہ رہے لیکن حتمی طور سے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کب تک۔البتہ ''اودھ اخبار'' کے ایڈیٹروں میں یگانؔہ کا نام شامل تھا۔۱۹۲۴ء میں یگانؔہ اٹاوہ چلے گئے جہاں انہیں اسلامیہ ہائی اسکول میں ملازمت مل گئی۔مارچ ۱۹۲۵ء کے آس پاس وہ اٹاوہ چھوڑ کر علی گڑھ چلے آئے۔وہاں ایک پریس میں انہیں ملازمت مل گئی۔۱۹۲۶ء میں انھوں نے لاہور کا رخ کیا اور ''اردو مرکز'' سے وابستہ ہو گئے۔یہاں کا ماحول انہیں راس نہیں آیا۔یہاں کے ادیبوں سے ان کے بہتر مراسم رہے۔کئی کتابوں اور رسالوں کے چھپنے کی سبیل پیدا ہوئی۔اقبالؔ کے یہاں بھی ان کا آنا جانا رہا۔اقبالؔ بھی یگانؔہ کے بڑے قائل تھے۔۱۹۲۷ء میں یگانؔہ ''اردو مرکز'' سے علاحدہ ہو گئے لیکن قیام لاہور ہی میں رہا۔لاہور کے بعد انھوں نے حیدرآباد کا رخ غالباً ۱۹۲۸ء میں کیا۔حیدرآباد میں ان کا قیام ان کے لئے کافی آسودگی لے کر آیا۔یہاں وہ نثار احمد مزاجؔ کے توسّط سے محکمۂ رجسٹریشن میں ''نقل نویس'' کی حیثیت سے مقرّر ہو گئے۔یہاں کی آمدنی ۲۵/۳۰ روپے ماہوار تھی۔کبھی کبھی زیادہ بھی ہو جاتی تھی۔۱۹۳۱ء میں یگانؔہ محکمۂ رجسٹریشن میں باقاعدہ ملازم ہو گئے۔یہ جگہ سب رجسٹرار کی تھی۔اس طور پر وہ عثمان آباد، لاتور اور یادگیر میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے اور ۱۹۴۲ء میں ۵۸ برس کی عمر میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ریٹائرمنٹ کے بعد ایک لمبے عرصے تک حیدرآباد ہی میں قیام رہا۔۱۹۴۶ء میں وہ بمبئی آ گئے اور وہاں اپنے بڑے بیٹے آغا جان کو ملازمت دلوائی۔حیدرآباد میں نواب معظّم جاہ نے انہیں اپنے دربار سے وابستہ کرنا چاہا لیکن یگانؔہ راضی نہ ہوئے۔ریٹائرمنٹ کے بعد یگانہ بار بار حیدرآباد روزگار کی امید سے آتے رہے لیکن انہیں مایوسی ہی نصیب ہوئی۔ان کے حالات ابتر ہوتے گئے اور اسی عالم میں انھوں نے ۳ یا ۴ فروری ۱۹۵۶ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

یگانؔہ کا پہلا مجموعہ ''نشترِ یاس'' ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا تھا۔اس کا بڑا حصہ ان کے ابتدائی اور روایتی کلام پر مشتمل ہے۔ان کا دوسرا مجموعہ ''آیاتِ وجدانی'' کے نام سے ۱۹۲۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔یگانؔہ کی قدر و منزلت کا دارومدار بڑی حد تک اسی مجموعے پر ہے۔''آیاتِ وجدانی'' کے بعد ان کا تیسرا مجموعہ ''ترانہ'' کے نام سے سات سال بعد ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔۱۹۳۴ء میں ''آیاتِ وجدانی'' کا دوسرا ایڈیشن منظرِ عام پر آ گیا۔۴۶-۱۹۴۵ء میں اس مجموعے کا تیسرا ایڈیشن بھی آ گیا۔اس اشاعت کا کام پہلی اشاعتوں سے بہتر تھا۔۱۹۴۶ء میں یگانؔہ بمبئی گئے۔

وہاں ان کی ملاقات سجّاد ظہیر سے ہوئی۔ ان کے لئے یگانہ نے اپنے تمام مجموعوں میں شامل کلام کو ''گنجینہ'' کے نام سے مرتّب کر دیا۔ یہ مجموعہ کمیونسٹ پارٹی کے اشاعتی ادارے سے ۱۹۴۷ء میں شائع کیا گیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے چند کتابچے بھی لکھے تھے۔ مثلاً ''شہرتِ کاذبہ'' جسے خرافاتِ عزیز کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے ''غالب شکن'' بھی شائع کیا تھا جس سے لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں بڑی اُٹھا پٹک ہوئی تھی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ یگانہ کا اصل نام کیا تھا؟

﴿۲﴾ وہ کب پیدا ہوئے؟

﴿۳﴾ یگانہ کے شعری مجموعوں کے نام بتایئے؟

12.04 یگانہ چنگیزی کی شاعرانہ خصوصیات

یگانہ ایک کلاسیکل غزل گو شاعر تھے۔ حالاں کہ انہوں نے قطعات و رباعیات بھی کہی ہیں لیکن ان کی اصل پہچان ان کی غزلیں ہی ہیں۔ انہوں نے غزل کے موضوعات کے دائرے کو ایک نئی جہت اور اونچائی عطا کی اور ایسے مضامین نظم کیے جو پہلی بار حقیقت پسندانہ کیفیت کے ساتھ غزل کے افق پر نمودار ہوئے تھے۔ وہ خود اپنی ذاتی زندگی میں جس طرح کے شیریں و تلخ تجربات سے گزرے تھے اور زندگی کے اتار چڑھاؤ کا جس طرح تجربہ کیا تھا، اس سے ان کے دل و دماغ نے جو تاثرات قبول کیے تھے، انہی واقعات نے ان کی غزلوں کو اصلیت پسندی اور تابناکی بخشی۔ ان کی غزل گوئی ان کے مزاج کی آئینہ دار ہے۔ وہ ایک خوددار اور صاف گو انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بھی اس کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

یگانہ کی شاعری میں جو چیز سب سے پہلے دل میں اترتی ہے وہ ہے ان کا زورِ کلام۔ بندش کی چستی کے علاوہ بلند بانگ مضامین کے لئے ایسے الفاظ لاتے ہیں جو پوری طرح مفہوم کو ذہن نشین کرانے کے ساتھ خیالات کو بھی جلا دیتے ہیں۔ دوسری چیز جو ان کی شاعری میں دل کشی پیدا کرتی ہے وہ ہے طنز۔ ان کی شاعری کا یہ عنصر کہیں کہیں اتنا تیز اور تیکھا ہوتا ہے کہ زورِ بیان کا لطف دوبالا کر دیتا ہے۔

انسان کا انسان فرشتے کا فرشتہ انسان کی یہ بو العجبی یاد رہے گی
پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا خدا تھے کتنے مگر کوئی آڑے آ نہ گیا
کیسے کیسے خدا بنا ڈالے کھیل بندے کا ہے خدا کیا کیا
حال دونوں کا ہے غیر اب سامنا مشکل کا ہے دل کو میرا درد ہے اور مجھ کو رونا دل کا ہے
جو خاک کا پُتلا، وہی صحرا کا بگولہ مٹنے پہ بھی اک ہستیِ برباد رہے گی
'دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو زندگی پھر کیوں ہوئی ہے دردِ سر میرے لئے

یگانہ کے کلام میں تخیّل کی بلند پروازی اور فکر کی بالیدگی دیکھتے ہی بنتی ہے۔ وہ حقائق کو عالمِ بالا سے چن کر لاتے ہیں اور نہایت صفائی و سادگی کے ساتھ اشعار میں سمو دیتے ہیں۔ بندش ایسی ہوتی ہے کہ الفاظ و تراکیب میں مطلب و مفہوم الجھنے نہیں پاتا۔ ان کے کلام میں زیادہ تر

حوصلہ اور ہمّت افزائی کی لہریں موج زَن نظر آتی ہیں۔ مصیبتوں میں گھر جانے کے باوجود یہی پیغام ملتا ہے کہ ہمّت کسی بھی صورت میں ہارنی نہیں چاہیے۔

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا　ہمیں سر مار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا
بزمِ دنیا میں یگانہ ایسی بے گانہ روی　میں نے مانا عیب ہے لیکن ہنر میرے لئے
رات دن شوقِ رہائی میں کوئی سر پٹکے　کوئی زنجیر کی جھنکار سے دیوانہ بنے
واہ کس ناز سے آتا ہے ترا دورِ شباب　جس طرح دور چلے بزم میں پیمانے کا
باز آ ساحل پہ غوطہ کھانے والے باز آ　ڈوب مرنے کا مزہ دریائے بے ساحل میں ہے
بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا　بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

یگانہ ایک خوددار، حق گو اور بے باک انسان تھے اور یہی خصوصیات ان کے کلام میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی خودداری کہیں کہیں ''انا پرستی'' سے جا ملتی ہے، جسے بعض ناقدین نے ان کی 'کج روی' سے تعبیر کیا ہے۔ اپنے دور میں انہیں وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی جس کے وہ مستحق تھے۔ ان کی زندگی آزمائش اور اتار چڑھاؤ سے عبارت تھی۔ اس کے باوجود ان کی شاعری میں زندگی سے فرار، مایوسی اور پست ہمّتی کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ زندگی کے ہر مرحلے کو طے کرنے کی ان میں جرأت تھی۔

ہنوز زندگیِ تلخ کا مزہ نہ ملا　کمال صبر ملا صبر آزما نہ ملا
بہار آئے گی پھر یاس نا امید نہ ہو　ابھی تو گلشنِ ناپائیدار باقی ہے
دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں　وہ آنسو کیا پیے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا
سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں　سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا
رہائی کا خیالِ خام ہے یا کان بجتے ہیں؟　اسیرو! بیٹھے کیا ہو، گوش بر آوازِ در ہو کر
پاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے منزل کی طرف　کان اب تک ہوسِ بانگِ درا کرتے ہیں

یگانہ کے کلام کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہیں فارسی ترکیبوں کے استعمال سے کافی لگاؤ تھا۔ تشبیہات کی جدّت سے طرزِ بیان میں تازگی پیدا کرتے ہیں۔ مصرعے نہایت چست ہوتے ہیں۔ الفاظ کی بندش سے اشعار میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

وحشت آباد عدم ہے وہ دیارِ خاموش　کہ قدم رکھتے ہی ایک ایک سے بے گانہ بنے
حسن وہ حسن کبھی جس کی حقیقت نہ کھلے　رنگ وہ رنگ جو ہر رنگ میں شامل ہو جائے
چشمِ نامحرم سے غافل روئے لیلیٰ ہے نہاں　ورنہ اک دھوکا ہی دھوکا پردۂ محمل کا ہے
دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے　آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجیے

یگانہ نے صرف اپنا تخلّص ہی یاس سے یگانہ (۲۱۔۱۹۲۰ء میں) نہیں کیا بلکہ ۱۹۳۲ء تک پہنچتے پہنچتے اس میں چنگیزی کا اضافہ بھی کر لیا۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جس طرح چنگیز نے اپنی تلوار سے دنیا کا صفایا کر دیا تھا اسی طرح جب سے میں نے غالبؔ پرستوں کا صفایا کرنے کا تہیّہ کیا ہے، یہ لقب اختیار کیا ہے۔''

(بحوالہ: یگانہؔ سوانحی خاکہ مشمولہ کلّیاتِ یگانہؔ چنگیزی، صفحہ۔۶۸)

یہ تبدیلی صرف تخلّص تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ نظریات و افکار میں بھی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ اہلِ لکھنؤ سے ان کے معرکے نے انہیں اور خود سر و خود اعتماد بنا دیا۔ معرکوں کے باعث ان کے لہجے میں تیزی آ گئی۔ آیئے ان کے کلام سے کچھ ایسے اشعار دیکھتے چلیں جن سے ان کے لہجے کا انوکھا پن ہی نہیں بلکہ تیکھا پن بھی سامنے آ جائے گا۔

موت مانگی تھی، خدائی تو نہیں مانگی تھی　　　لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

کلامِ یاسؔ سے دنیا میں پھر اک آگ لگی　　　یہ کون حضرتِ آتش کا ہم زباں نکلا

دن چڑھے سامنا کرے کوئی　　　شمع کیا شمع کا اجالا کیا

صبر کرنا سخت مشکل ہے، تڑپنا سہل ہے　　　اپنے بس کا کام کر لیتا ہوں آساں دیکھ کر

مندرجہ بالا اشعار یگانہؔ کی یگانہ روی کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے ان کا کلام ان کے کسی ہم عصر سے کم تر نہیں ہے۔ روزمرّہ محاوروں کا استعمال، طرزِ ادا، روانی اور بے ساختگی یگانہؔ کی خاص پہچان بن گئے تھے۔ ان کی شاعری کی خصوصیات پر گفتگو ہو اور بات رباعیوں کی نہ کی جائے تو ناانصافی ہوگی۔ انہوں نے اپنی رباعیوں میں بھی ایک طرح کی جدّت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ دیگر شعرا سے ان کا رنگ الگ رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایسی بندشیں اور محاورے استعمال کیے جو منجھے ہوئے نہیں تھے یا جن پر زبان کی صفائی نے ابھی تک جلا نہیں کی تھی۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ یگانہؔ کو رباعی کے فن پر کامل عبور تھا۔ وہ اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ رباعی کے چوتھے مصرعے میں خیال کی تان ٹوٹتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رباعیاں ہمیں اپنی طرف متوجّہ کر لیتی ہیں۔ انہوں نے غالبؔ کے کلام پر بھی رباعیوں میں اظہارِ خیال کیا۔ یگانہؔ کی رباعیوں کے مجموعے کا نام ''ترانہ'' ہے جسے کافی سراہا گیا ہے۔ ان کی رباعیوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے تمام تر رباعیوں کو عنوان دے کر رقم کیا ہے۔ مثلاً:

''تحفۂ درد''

دل کو پہلے ٹٹول لیتا ہوں　　　پھر تحفۂ درد مول لیتا ہوں

آثارِ زلال و درد و مستی و خمار　　　آنکھوں آنکھوں میں تول لیتا ہوں

''حسن دوروزہ''

سورج کو گہن میں نہیں دیکھا شاید　　　کیوں چاند کو گہن میں نہیں دیکھا شاید

اے حُسنِ دو روزہ پہ اکڑنے والو!　　　یوسف کو کفن میں نہیں دیکھا شاید

''ٹیڑھے مرزا''

شاہوں سے مری کلاہ ٹیڑھی ہی رہی　　　بدمغزوں سے رسم و راہ ٹیڑھی ہی رہی

ٹیڑھے مرزا کو کون سیدھا کرتا　　　سیدھی نہ ہوئی نگاہ ٹیڑھی ہی رہی

یگانؔہ نے غالب شکنی کے باعث بڑی بدنامی مول لی لیکن یہ بدنامی ایسے ہی نہیں تھی بلکہ انہوں نے بہت سی رباعیاں اس سلسلے میں کہی تھیں۔ان کی اس رنگ کی بھی چند رباعیاں پیش ہیں تا کہ حقیقت کا اندازہ کیا جاسکے۔

غالب کے سوا کوئی بشر ہے کہ نہیں ۔۔۔ اَوروں کے بھی حصے میں ہنر ہے کہ نہیں
مردہ بھیڑوں کو پوجتا ہے ناداں ۔۔۔ زندہ شیروں کی کچھ خبر ہے کہ نہیں

☆☆☆☆☆

اللہ ری ہوا و ہو میں خلعت و زر ۔۔۔ مرزا کا سر ہے اور انگریز کا در
ہاں کیوں نہ ہوں مورکھوں کے دیوتا غالبؔ ۔۔۔ ہے باؤلے گاؤں اونٹ بھی پرمیشر

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ یگانؔہ نے کس سن میں اپنا تخلّص یاسؔ سے یگانہ کیا؟

﴿۵﴾ یگانؔہ کی شاعری کے مرکزی موضوعات کیا ہیں؟

12.05 یگانؔہ چنگیزی کی پہلی غزل

﴿۱﴾

﴿۱﴾ ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا
ہوس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا کیا ؟

﴿۲﴾ اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور
اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا؟

﴿۳﴾ پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا؟

﴿۴﴾ خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے
وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا؟

﴿۵﴾ خدا ہی جانے یگانؔہ! میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟
خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا؟

12.06 یگانؔہ چنگیزی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ یگانؔہ کی یہ غزل ان کے مجموعۂ کلام ''گنجینہ'' سے اخذ کی گئی ہے۔ ''گنجینہ'' یگانہ کا ایک اہم مجموعۂ کلام ہے۔ اس غزل میں سب سے پہلی بات جو قاری کو متاثر کرتی ہے وہ ہے اس کی زبان۔ اس قدر آسان اور عام فہم الفاظ سے غیر معمولی کام لینا اسی کا شیوہ ہو سکتا ہے جو زبان پر پوری طرح قدرت رکھتا ہو۔ اس بات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ پوری غزل میں ایک دو الفاظ چھوڑ کر بقیہ زبان وہ ہے جو عام طور سے لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں مگر جس طرح کے مضامین نظم کیے گئے ہیں وہ قاری کو لاجواب کر دیتے ہیں۔ اس غزل کو ہم استفہامیہ غزل بھی کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح ردیف ''کیا کیا'' کی تکرار سے شاعر نے ایک فضا قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی اس میں تنوّع پیدا کرنے کی سعی کی ہے وہ ایک انوکھی چیز ہے۔ ''کیا کیا'' ایک عام لفظ ہے جس کا استعمال ہر خاص و عام صبح و شام کرتا ہے۔ لیکن اس غزل میں جس طرح سے ''کیا کیا'' کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس نے اسے ایک نئی وسعت عطا کی ہے اور شعر میں اس سے گہرائی و گیرائی پیدا ہو گئی ہے۔ اس طرح کی چیزوں سے انہیں خاص لگاؤ تھا وہ عام لفظوں میں بات کرتے ہوئے بھی اس میں ایک جدّت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ بات ہمیشہ سے بڑے شاعروں کی پہچان رہی ہے کہ وہ معمولی الفاظ سے بھی غیر معمولی کام لے لیا کرتے تھے۔ وہ چیز ہمیں یہاں بھی دکھائی دے رہی ہے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: یہ غزل یگانؔہ کی مقبول غزلوں میں سے ایک ہے۔ جس کے مطلع میں ہی یگانؔہ نے اپنی فکری بلندی اور تخیّل آفرینی کی چھاپ چھوڑنے کی ایک کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ مطلع سوالیہ ہے کہ ادب نے دل کے کیسے کیسے تقاضوں کو اٹھا رکھا ہے۔ یہاں ''دل'' کلیدی لفظ ہے۔ اس لئے دل اور دل کے تقاضوں کو سمجھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دل طرح طرح کے تقاضوں کی آماج گاہ ہے۔ اس لئے تقاضے بھی گوں ناگوں نوعیت کے حامل ہو سکتے ہیں یعنی خواہشیں، آرزوئیں، تمنّائیں، ولولے، حوصلے اور رنج و غم وغیرہ ان تمام کے تقاضوں کو ادب نے اٹھا رکھا ہے۔ یہاں ایک بات دونوں مصرعوں کے درمیان یہ محسوس ہوتی ہے کہ جس طرح سے ادب نے دل کے تقاضوں کو سنبھال رکھا ہے، اسی طرح گوں ناگوں شوق کے پہلوؤں کو ہوس نے دبا رکھا ہے۔ ہوس اور شوق کے معاملے کو یوں سمجھنا چاہیے کہ ہوس منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور شوق ہمیشہ مثبت پہلوؤں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اب یہاں ایک نکتہ یہ ہے کہ انسان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ یہ کام کرے، وہ کام کرے، بھلائی اور نیکی کے کام میں اپنا نام پیدا کرے لیکن ہوس اس کو بھلے کاموں سے روکتی ہے۔ انسان کے دل میں نہ جانے کیا کیا شوق ہوتے ہیں مگر جھوٹے عشق اور لالچ کی وجہ سے وہ نہیں کر پاتا۔ لہٰذا شاعر کہتا ہے کہ نہ جانے وہ کون کون سے شوق کے پہلو ہوں گے جن کو ہوس نے دبا رکھا ہے۔

دوسرا شعر: انسان اس فریب میں رہتا ہے کہ چھوڑو! یہ کام کل کر لیں گے، کیوں کہ کل کتنی دوٗر ہے۔ اسی کل کے دھوکے نے کہ کل کون سا بھاگا جا رہا ہے، کون سا بہت دوٗر ہے، کل تو کام ہو ہی جائے گا، یا کر ہی لیں گے مگر اسی آج کل کے دھوکے میں نہ جانے کیسے کیسے اور کتنے قیمتی دن ہم نے گنوا دیے ہیں۔

تیسرا شعر: اس شعر میں حیرت کا اظہار کیا گیا ہے کہ پہاڑ کاٹنے والے زمین سے ہار گئے! یعنی وہ انسان جو سخت محنت اور جاں فشانی کر کے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر جاری کرتا تھا وہ زمین سے ہار گیا؟ کیوں؟ کیسے؟ اس شعر میں یگانہ ''فرہاد'' کی تعریف کر رہے ہیں کہ اس کے اندر جو لگن تھی جو سچّا جذبہ تھا اور جس کی بدولت وہ پہاڑ کاٹنے میں کامیاب ہوا تھا آج کا انسان بھی وہی ہے، اسی طرح کا انسان ہے مگر شاید اس کے اندر وہ تڑپ اور جذبہ نہیں ہے جو اس کے پاس تھا۔ ورنہ ایسا کیسے ممکن ہے کہ پہاڑ کاٹنے والا انسان زمین سے ہار جائے۔

چوتھا شعر: یہ شعر خالص غزل کا شعر ہے اور عاشق اپنی لغزشوں کے باعث اپنے محبوب کے مسکرانے پر فدا ہوا جاتا ہے۔ لغزش کا مطلب ہے پھسلن، لرزش، کپکپی، خطا، غلطی، بھول، چوک وغیرہ۔ اب اگر اس شعر پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ عاشق کے لڑکھڑانے پر اس کا معشوق بھی جی بھر کر مسکرا رہا ہے۔ اس لئے وہ مارے خوشی کے اپنے قدموں کو چوم لینا چاہتا ہے کہ جس کے باعث اس کا محبوب یوں خندہ زن ہے۔ یہاں پر لفظ مسکرانا خاص توجّہ کا طالب ہے۔ کیوں کہ اگر آدمی کھل کر ہنس دیتا ہے یا قہقہہ لگاتا ہے تو اس میں وہ کشش یا جاذبیت نہیں آتی جو مسکرانے سے پیدا ہو جاتی ہے۔

پانچواں شعر: اس شعر میں شاعر خود اپنے آپ سے مخاطب ہے اور کہتا ہے کہ ''میں کون ہوں؟، کیا ہوں؟'' یہ مجھے نہیں معلوم یہ بات صرف خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں کس طرح کا انسان ہوں۔ اپنی حرکات وسکنات اور اعمال دیکھ کر تو مجھے خود اپنی ذات پر نہ جانے کیسے کیسے شکوک وشبہات ہو رہے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۶﴾ یگانہ کی پہلی غزل کا انتخاب کس مجموعہ کلام سے کیا گیا ہے؟

12.07 یگانہ چنگیزی کی دوسری غزل

﴿۲﴾

﴿۱﴾ خودی کا نشہ چڑھا، آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

﴿۲﴾ گناہِ زندہ دلی کہیے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لیے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا

﴿۳﴾ پکارتا رہا کس کس کو؟ ڈوبنے والا
خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے آ نہ گیا

﴿۴﴾ سمجھتے کیا تھے؟ مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

﴿۵﴾ کرشن کا ہوں پجاری ، علی کا بندہ ہوں
یگاؔنہ! شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

12.08 یگاؔنہ چنگیزی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔یگاؔنہ کی یہ غزل ''آیاتِ وجدانی'' سے لی گئی ہے۔اس غزل کے موضوعات سے ایسا لگتا ہے کہ یگاؔنہ لب ورخسار کی جگہ انسانی قدروں کے مضامین کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں انسانیت ،اخلاقیات اور تہذیبی مضامین کثرت سے نظر آتے ہیں۔یگاؔنہ کی یہ بھی ایک یگانہ روی ہے کہ وہ اپنے خیالات ومحسوسات کو بڑی آسانی سے بڑے سیدھے سادے لفظوں میں پرو دیتے ہیں۔اس غزل کا ایک نمایاں وصف یہ بھی ہے کہ اس میں شاعر نے مطلع اور مقطع دونوں ہی میں اپنا تخلّص نظم کیا ہے۔لیکن دونوں کا انداز جدا گانہ ہے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: شاعر کہتا ہے کہ مجھے خودشناسی کا ایسا نشہ سوار ہوا کہ میں آپے سے باہر ہو گیا اور اس کیفیت میں میں اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا۔یا مجھے اپنے آپ پر خدا کا گمان ہو چلا تھا مگر حقیقت میں ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔

دوسرا شعر: اس شعر میں لفظ ''اتنا'' کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔اس لئے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ہم نے جو کام کیا ہے اسے آپ خواہ ہماری زندہ دلی کہیں یا دل آزاری کی حرکت کہیں۔یہ آپ پر ہے بہر حال گناہ تو ہم سے ہو گیا لیکن اسی چھیڑ کا نتیجہ یہ ہے یا یوں کہیں اسی سے ہمیں یہ سبق ملا کہ پھر زندگی بھر ہم نے ویسی حرکت نہیں کی۔''کسی پہ ہنس لئے اتنا'' یعنی حد سے زیادہ ہم نے کسی پہ ہنس لیا جس سے ہمیں یہ عبرت نصیب ہوئی کہ آدمی کو کسی پہ پھبتی نہیں کسنی چاہیے۔انسان کو انسان سمجھنا ضروری ہے۔ورنہ ہم سے انسانیت کا جو تقاضہ ہے اس کی بھرپائی نہیں ہو سکے گی۔نتیجتاً ہم گناہ گار ٹھہریں گے۔

تیسرا شعر: اس شعر میں یہ ضروری نہیں کہ یہی مطلب ہو کہ کوئی انسان پانی میں ڈوب رہا تھا اور کسی نے اسے نہیں بچایا۔''خدا'' کا لفظ اس شعر میں استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔یہ بات بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص ڈوب رہا تھا اور اس نے بار بار لوگوں کو پکارا مگر کسی نے اس کی آواز پر لبیک نہیں کہا اور وہ غرقاب ہو گیا۔

چوتھا شعر: شاعر کہتا ہے کہ جب ہماری سمجھ میں درد ودکھ کی باتیں نہیں آتی تھیں تب ہم درد کے ترانے سن لیا کرتے تھے لیکن اب جب سمجھ میں آنے لگی ہیں تو ہم سے نہیں سنا جاتا۔یعنی شاعر کا دل اتنا نرم ونازک ہے کہ اس سے دوسروں کا دکھ برداشت نہیں ہو سکتا۔اس لئے شاید اب وہ کوئی نالہ وفریاد نہیں سن سکتا۔

پانچواں شعر: اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ شاعر میں مذہبی کٹّر پن نہیں ہے۔اسے جہاں بھی خدا کی شان دکھائی دیتی ہے وہاں وہ اپنا سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔کہتے ہیں کہ خدا ذرّے ذرّے میں موجود ہے تو پھر کیا عجب ہے کہ ہمیں جہاں خدا کی شان نظر آئے وہاں ہمارا سر نہ جھکے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ صنعتِ تضاد کب قائم ہوتی ہے؟

﴿۸﴾ یگانہؔ اپنی شاعری میں کن موضوعات کو ترجیح دیتے ہیں؟

﴿۹﴾ خودی کا معنی بتایئے؟

12.09 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے اردو شاعری کے ایک ممتاز شاعر یگانہؔ کی حیات اور غزل گوئی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی ان کے تعلیمی کوائف کے اُتار چڑھاؤ اور ملازمت کے سلسلے میں ملک کے مختلف حصّوں میں گردش وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ یہاں اس اکائی میں یگانہؔ کی غزلیات و رباعیات کا بھی ذِکر کیا گیا تاکہ طلبا ان کی شاعری سے پوری طرح آگاہ ہوسکیں۔ ان کی شاعری میں انسانیت، اخلاقی قدریں اور آدمی کے جملہ محرکات کا احاطہ کیا گیا۔ انہوں نے غالبؔ کے مقابلے میں آتشؔ کو بڑا شاعر ثابت کرنے کے لئے سخت مضامین لکھے۔ اہلِ لکھنؤ سے الگ اپنی ایک روش قائم کرنے کے لئے ''غالب شکن'' اور ''آتش پرست'' جیسے القابات اختیار کیے۔ ان تمام کا احاطہ خاطر خواہ حدتک اس اکائی میں کر دیا گیا ہے۔ آپ کے خصوصی مطالعے کے لئے دو غزلیں، ان کی تشریح اور ان کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا۔ پہلی غزل کے الفاظ انتہائی سادہ اور عام فہم ہیں مگر معنی انتہائی وسیع اور گہرے۔ خصوصاً اس غزل کا استفہامیہ لہجہ تاثر میں بے پناہ اضافہ کرتا ہے۔

دوسری غزل روایتی علامات اور تشبیہات و استعارات کی حامل ہونے کے باوجود انسانی قدروں کے تعلّق سے چند خیالات اپنے اندر رکھتی ہے۔ یگانہؔ کی یہ غزل حکایتِ زلف و رخسار نہیں سناتی بلکہ انسانیت اور اخلاقی قدروں سے واقف کراتی ہے۔ یگانہؔ سے متعلّق مزید مطالعے کے لئے کتابوں کی فہرست بھی آگے دی گئی ہے۔ مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی آپ کی سہولت کے لئے اکائی میں شامل کی گئی ہے۔ اکائی کے مطالعے کے بعد یگانہؔ کی شاعری سے آپ کو یقیناً دل چسپی پیدا ہوگی اور آپ کتابیات سے ضرور استفادہ کریں گے۔

12.10 فرہنگ

اجداد	جد کی جمع، باپ، دادا، پرکھے	سلطنت	حکومت، باشاہی
اجمالی	مختصر	شاہ و گدا	بادشاہ اور فقیر، امیر اور غریب
اغراض	غرض کی جمع، مطلب، ضرورت	شیوہ	طور، ڈھنگ، انداز
بالیدگی	بڑھوتری، افزائش، اضافہ	عافیت	امن، سلامتی، آسودگی، صحت، خیریت
بخوبی	اچھی طرح، پوری طرح	عبث	بے کار، بے فائدہ، فضول، ناحق
بندش	حسبِ موقع اور ترتیب کے ساتھ، گرہ	گوں ناگوں	طرح طرح کا، رنگ برنگا
تخلّص	شاعر کا وہ مختصر نام جو اشعار میں استعمال کیا جاتا ہے	مراسم	تعلّقات، برتاؤ
		مست و خود سر	سرکش، ضدّی
تخیّل	وہ قوّت جو خیالی صورتیں بنائے، تصوّر، قیاس	معرکہ آرائی	لڑائی، جنگ، صف آرائی

تقلیدی	:	نقل کیا ہوا، نقلی	مفہوم	:	سمجھا گیا، جو سمجھ میں آئے
تلخ	:	کڑوا، ترش، تیز	مقاصد	:	مقصد کی جمع، منشا، نیت، ارادہ
حتمی	:	پکّا، مضبوط	منفرد	:	تنہا، اکیلا، یکتا، واحد
ردیف	:	وہ لفظ جو غزل و قصیدے کے ہر شعر کے آخر میں قافیے کے پیچھے بار بار آئے	ناگزیر	:	ضروری، لازم، جس سے فرار نہ ہو

12.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : یگانہ کی تخلیقات کے بارے میں اپنی معلومات سے آگاہ کیجیے۔

سوال نمبر ۲ : ''غالب شکن'' اور ''آتش پرست'' بننے کے کیا اسباب تھے؟ بیان کیجیے۔

سوال نمبر ۳ : یگانہ کی تعلیم اور ملازمت سے واقف کرائیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : یگانہ چنگیزی کی مختصر سوانحِ حیات تحریر کیجیے۔

سوال نمبر ۲ : یگانہ کی شاعری میں انسانیت کے موضوعات کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر ۳ : اہلِ لکھنؤ سے یگانہ کی معرکہ آرائیوں پر ایک نوٹ لکھیے۔

12.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ تاریخ ادب اردو از اعجاز حسین

۲۔ تاریخ ادب اردو: عہدِ میر سے ترقی پسند تحریک تک (جلد چہارم) از سیّدہ جعفر

۳۔ کلّیاتِ یگانہ چنگیزی از مشفق خواجہ

۴۔ میرزا یگانہ: شخصیت اور فن از مشفق خواجہ، پاشا رحمٰن، آمنہ مشفق

12.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ مرزا واجد حسین

﴿۲﴾ یگانہ کی پیدائش ۱۷/اکتوبر ۱۸۸۴ء کو پٹنہ میں ہوئی

﴿۳﴾ یگانہ کے شعری مجموعوں کے نام ہیں: نشترِ یاس، آیاتِ وجدانی، ترانہ اور گنجینہ

﴿۴﴾ یگانہ نے ۲۱۔۱۹۲۰ء میں اپنا تخلّص یاس سے یگانہ کر لیا۔

﴿۵﴾ یگانہ کی شاعری میں انسانیت اور اخلاقی اقدار مرکزی موضوعات ہیں۔

﴿۶﴾ یگانہ کی پہلی غزل کا انتخاب ''گنجینہ'' سے کیا گیا ہے۔

﴿۷﴾ جب شعر میں دو متضاد الفاظ یکجا ہو جائیں تو صنعتِ تضاد قائم ہوتی ہے۔

﴿۸﴾ اخلاقی اقدار اور انسانیت۔

﴿۹﴾ خودی کے معنی ہیں، انانیت، خود پرستی، غرور، تکبّر اور خودشناسی۔

✵

بلاک نمبر 05

اکائی 13 فراقؔ گورکھ پوری

اکائی 14 مجروحؔ سلطان پوری

اکائی 15 ناصرؔ کاظمی

اکائی 13 : فراقؔ گورکھ پوری

ساخت

13.01 : اغراض ومقاصد
13.02 : تمہید
13.03 : فراقؔ گورکھ پوری کے حالاتِ زندگی
13.04 : فراقؔ گورکھ پوری کی شاعرانہ خصوصیات
13.05 : فراقؔ گورکھ پوری کی پہلی غزل
13.06 : فراقؔ گورکھ پوری کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
13.07 : فراقؔ گورکھ پوری کی دوسری غزل
13.08 : فراقؔ گورکھ پوری کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
13.09 : خلاصہ
13.10 : فرہنگ
13.11 : نمونہ امتحانی سوالات
13.12 : حوالہ جاتی کتب
13.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

13.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ہم فراقؔ گورکھ پوری کی سوانح، اردو سے ان کی محبت، ادبی خدمات اور شعری خصوصیات وغیرہ کا مطالعہ کریں گے۔ اس اکائی کے مطالعے سے آپ یہ جان جائیں گے کہ رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھ پوری کون تھے؟ اور انہیں اردو ادب میں کیا مقام حاصل ہے؟

13.02 تمہید

جب اردو کے شیدائیوں کا نام لیا جائے گا تو اس فہرست میں فراقؔ کا نام بھی ضرور شامل ہوگا۔ اگر چہ وہ انگریزی ادب کے استاد تھے اور ایک ہندو خانوادے میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر بھی اردو سے ان کی بے پناہ محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنا سارا تخلیقی کام اردو میں ہی کیا۔ انہوں نے اردو زبان کو مقامی رنگ عطا کیا اور اردو ادب کو قدیم ہندوستانی اور مغربی ادب کے تجربات، روایات اور احساسات سے مالا مال کیا۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومتِ ہند نے انہیں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا۔ انہوں نے اردو غزل کو فکر کا نیا انداز دیا اور اسے ایک اچھوتے اُسلوب سے روشناس کرایا۔

13.03 فراقؔ گورکھ پوری کے حالاتِ زندگی

فراقؔ گورکھ پوری کا نام رگھوپتی سہائے اور تخلّص فراقؔ تھا۔ان کے والد گورکھ پرساد سہائے عبرتؔ کا شمار گورکھ پور کی ممتاز شخصیتوں میں ہوتا تھا۔عبرتؔ کی فارسی اور اردو کی لیاقت نہایت عمدہ تھی۔ پیشے سے وکیل تھے لیکن شعروسخن سے خاص شغف تھا۔ان کے مورثِ اعلیٰ بنواری لال سہائے شیر شاہ کے عہد میں کسی مقام سے منتقل ہوکر بنوار پار میں آباد ہو گئے تھے۔بنواری لال کی نسبت سے اس گاؤں کا نام بنوار پار قرار پاتا ہے۔بنوار پار کے اسی کائستھ خاندان میں فراقؔ کی ولادت ۱۸۹۶ء میں ہوئی تھی۔فراقؔ کا بچپن بہت اچھا گزرا۔زمین دار گھرانے سے تعلّق رکھنے کی وجہ سے بچپن میں ہر طرح کی سہولیات حاصل تھیں۔تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی فراقؔ کے خاندان کا ایک پس منظر تھا۔والد عبرتؔ کے علاوہ پھوپھی زاد بھائی راج کشور لال سحرؔ بھی شاعر تھے اور فراقؔ کے چچا ہٹی پرساد سہائے ہندی کے ادیب تھے۔بطورِ مجموعی ابتدائی تعلیم اور تربیت جس ماحول میں ہوئی وہ تعلیمی اور تہذیبی اعتبار سے بہت صحت مند تھا۔

گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے گورکھ پور کے مڈل اسکول اور مشن اسکول گورکھ پور (موجودہ جبلی انٹر کالج) میں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں انہوں نے میور سینٹرل کالج الٰہ آباد سے ایف اے کیا۔اسی دَوران ان کی شادی ہو گئی جو نا کام ثابت ہوئی۔ بقولِ فراقؔ گورکھ پوری ان کی شادی ان کے لئے ایک حادثہ تھی۔جس کا المیہ نظم ''ہنڈولہ'' میں یوں رقم ہے ؎

سیاہ ہو گئی دنیا مری نگاہوں میں
وہ جس کو کہتے ہیں شادیِ خانہ آبادی
مرے لئے وہ بنی بیوگی جوانی کی
لٹا سہاگ مری زندگی کا مانڈو میں

شادی کی ناخوشی اور الجھنوں کے باوجود انہوں نے الٰہ آباد یونی ورسٹی سے کسی طرح بی.اے پاس کرلیا۔ابھی بی.اے کے امتحانات سے فارغ ہو کر لوٹے ہی تھے کہ والد عبرتؔ دارِفانی سے کوچ کر گئے۔والد کے انتقال کی وجہ سے وہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ جو کچھ بچا تھا وہ والدہ کی بیماری کی نذر ہو گیا۔مجبوراً انہیں نہ صرف اپنا تعلیمی سلسلہ ترک کر دینا پڑا بلکہ اپنا آبائی مکان ''لکشمی بھون'' بھی فروخت کرنا پڑا۔ لیکن اسی زمانے میں انگریزی سرکار نے انہیں ڈپٹی کلکٹری کے لئے نام زَد کرلیا۔ان کی مشکلات کے دوران یہ سروس ایک نعمت تھی۔لیکن ابھی انہوں نے ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ سنبھالا بھی نہ تھا کہ جواہر لال نہرو اور گاندھی جی سے متاثر ہو کر احتجاجاً اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور خود کو تحریکِ آزادی کے لئے وقف کر دیا۔

۱۹۲۰ء میں جب پرنس آف ویلز ہندوستان کا دورہ کرنے کے لئے آئے تو گاندھی جی کی قیادت میں اس دَورے کا بائیکاٹ کرنے والوں میں فراقؔ بھی شامل تھے۔ بہت سارے لوگوں کی گرفتاری عمل میں آئی اور جیل میں ہی ایک برائے نام کاروائی کے بعد فیصلہ سنا دیا گیا، جس میں اور لوگوں کے ساتھ فراقؔ کو بھی ڈیڑھ سال کی قید اور پانچ سو روپے کی سزا ہوئی۔ دیگر قیدیوں کے ساتھ انہیں بھی آگرہ جیل بھیج دیا گیا۔جیل کے اندر بھی فراقؔ اور ان کے ساتھیوں نے شعروادب کی شمع روشن رکھی۔ بہر حال جیل سے رہائی کے بعد نہرو کی ایما پر انہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے انڈر سیکریٹری کی ذمہ داری سنبھال لی۔ چند برس انڈر سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد نہرو کے سفرِ یورپ پر

روانگی سے قبل یعنی ۱۹۲۷ء میں ''لکھنؤ کرشچین کالج'' میں ان کا تقرر بحیثیتِ استاد ہوگیا۔تقریباًایک سال لکھنؤ میں کام کرنے کے بعد کان پور کے سناتن دھرم کالج میں اردو اور انگریزی کے استاد کی حیثیت سے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔۱۹۳۰ء میں انہوں نے آگرہ یونی ورسٹی سے انگریزی میں ایم.اے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ایم.اے کرنے کے بعد ۱۹۳۰ء ہی میں الہ آباد یونی ورسٹی میں ان کا تقرّر ہوگیا۔جہاں انہوں نے ریٹائرمنٹ یعنی ۱۹۵۸ء تک تدریسی فرائض انجام دیے۔ریٹائرمنٹ کے بعد یو.جی.سی نے انہیں نیشنل ریسرچ پروفیسر مقرّر کیا۔جس پر وہ ۱۹۶۶ء تک کام کرتے رہے۔

فراقؔ کی وفات ۳/مارچ ۱۹۸۲ء کو دہلی میں ہوئی۔دہلی وہ اپنی آنکھوں کا آپریشن کرانے گئے تھے۔اگرچہ آپریشن کامیاب رہا مگر ان کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔چوں کہ جسمانی اعتبار سے وہ کافی کمزور ہو چکے تھے،عمر بھی زیادہ تھی،ان پر دل کا دَورہ پڑا اور انتقال فرما گئے۔ان کی نعش ایک مخصوص ٹرین کے ذریعے الہ آباد لائی گئی اور سنگم پر ان کا کریا کرم سرکاری اعزاز کے ساتھ کیا گیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ فراقؔ کا پورا نام لکھیے۔

﴿۲﴾ فراقؔ کہاں پیدا ہوئے تھے؟

﴿۳﴾ فراقؔ کس سرکاری نوکری کے لئے نام زَد ہوئے تھے؟

﴿۴﴾ فراقؔ کس یونی ورسٹی میں اور کس مضمون کے استاد تھے؟

فراقؔ کی ادبی خدمات:۔

فراقؔ گورکھ پوری انگریزی کے استاد تھے مگر انہوں نے سارے تخلیقی کام اردو میں کیے۔اردو کی وجہ سے ہی انہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ان کے شعری مجموعوں کے نام ہیں: ''مشعل''،''شعلۂ ساز''،''گلِ نغمہ''،''دھرتی کی کروٹ''،''چراغاں''،''پچھلی رات''،''گل بانگ''،''روپ''،''ہزار داستاں''،''شبنمستان'' اور ''غزلستان'' وغیرہ۔ان کے نثری کارناموں میں ''اندازے''،''اردو کی عشقیہ شاعری''، ''حاشیے'' اور ''من آنم'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ہندی میں بھی انہوں نے ایک کتاب بعنوان ''اردو ساہتیہ کا اتہاس'' لکھی،جو ہندی داں طبقے میں خاصی مقبول ہوئی۔

فراقؔ نے غزلوں کے علاوہ بہت سی کامیاب نظمیں بھی لکھیں۔جن میں پرچھائیاں،ہنڈولہ،آدھی رات اور جگنو وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ان نظموں سے ان کی فطرت پرستی کا اندازہ ہوتا ہے۔اردو نظم کو ان کی سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ انہوں نے اردو نظم کو ہندوستانی مزاج اور رنگ میں رنگ دیا۔نیز ۱۹۴۴ء میں پہلی بار اپنی نظم ''آدھی رات'' میں ''آزاد تلازمۂ خیال'' کی تکنیک کو استعمال کر کے اردو نظم کو وسعت بخشی۔اس تکنیک کو میراجی (ثناءاللہ خان ڈارؔ) کی طرح محض تحلیلِ نفسی کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے انہوں نے بھرپور سماجی معنویت اور جمالیاتی ربط کے ساتھ استعمال کیا۔اس نظم میں آدھی رات کا پورا منظر ہی سامنے نہیں آتا بلکہ اس نظم میں تاریکی،خاموشی اور سنّاٹے کو توڑتی ہوئی دور سے آتی ہوئی کسی گزرنے والی سواری کے گھنگروؤں کی آواز،رات رانی کی مہک،خوشبو کی لپٹ اور اس عہد کے ذہین انسان کے ذہن سے گزرنے والے خیالات سب کچھ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔مختصراً فراقؔ اردو کے ان نمائندہ نظم گو شاعروں میں شامل ہیں جنہوں نے صنفِ نظم میں افکار،اسالیب،بحور اور ساخت کے نت نئے تجربے کیے۔

فراق کی رباعیات اردو ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کی رباعیوں کو اس لحاظ سے اوّلیت حاصل ہے کہ پہلی بار اردو رباعیوں میں ہندو گھرانوں کی عکّاسی ہوئی ہے۔ان رباعیوں میں انہوں نے جسم کی عرفانیات کو نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندو تصوّر کے مطابق جسم اور مادّہ مقدّس ہیں اور ان میں بھی ایک نوع کی پاکیزگی موجود ہے۔ یہی تصوّر ان کی رباعیوں کا پس منظر اور مرکزی موضوع ہے۔ان کی رباعیوں میں آنگن میں تلسی کے پودے کو پانی دینے والی سہاگنوں کی تصویریں بھی ہیں اور گج گامنی جیسی چال والی کامنیاں بھی۔ محض ہندو گھرانوں کی تصویر کے سبب ان رباعیوں کی اہمیت نہیں بلکہ ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق اس میں اس آفاقی کلچر اور عالمی فکر کی پرچھائیاں بھی ہیں جو قدیم ہندوستان کے طرزِ حیات میں جلوہ گر ہوئی تھیں اور جس نے مصوّری، مجسمہ سازی، سنگیت اور ادب، الغرض سبھی فنونِ لطیفہ کو ایک وحدت میں پرو دیا تھا، بطورِ مثال یہ رباعیاں دیکھیں:

پنگھٹ پہ گاگر چھلکنے کا رنگ　　پنگھٹ پہ گاگر چھلکنے کا رنگ
کاندھوں پر سروں پر ہاتھوں میں کلس　　مدھ بھری انکھڑیوں میں سینوں میں بھرپور رنگ
وہ گایوں کا دوہنا ، سہانی صبحیں　　گرتی ہوئی بھرے تھن سے چمکتی دھاریں
گھٹنوں پہ کلس کا وہ کھنکنا کم کم　　یا چٹکیوں سے پھوٹ رہی ہیں کرنیں

شاعر کے علاوہ فراق ایک منجھے ہوئے نثر نگار اور نقاد بھی تھے۔مختلف تنقیدی مضامین کے علاوہ ان کے وہ مضامین بطورِ خاص قابل ذِکر ہیں جو انہوں نے اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے حوالے سے لکھے ہیں۔اس معاملے میں ان کا ذہن بالکل صاف تھا۔انہیں اردو سے بے پناہ محبت تھی اور انہیں یہ گوارہ نہ تھا کہ اس خوب صورت زبان کے رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کر دیا جائے۔اردو کی حمایت میں لکھی گئی اس تحریر کو دیکھیے:

''تو ہم اس اردو کے طرف دار ہیں کہ ہم تاریخ سے لڑنا نہیں چاہتے،تاریخ سے لڑنا اپنے آپ کو مٹانا ہے۔کھڑی بولی کو مانجھنے اور سنوارنے میں مسلم مڈل کلاس کا بہت بڑا حصہ ہے۔اب ہمارا کارنامہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں سے اچھا لکھ کے دیں جو پریم چند نے کیا۔''

تاہم ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو غزل کو نئی سمتوں سے روشناس کرایا اور اردو زبان و ادب کو نیا لہجہ عطا کیا، جس کے لئے فراق کو ان کی زندگی میں ہی متعدّد انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔ ۱۹۳۱ء میں انہیں ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔ ۱۹۷۰ء میں انہیں دو بڑے اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا یعنی ساہتیہ اکادمی نے انہیں اپنا فیلو مقرّر کیا اور ''گیان پیٹھ'' بلند ترین انعام سے نوازا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۵﴾ فراق کے پانچ مجموعوں کے نام بتائیے۔
﴿۶﴾ فراق کو کس سن میں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا؟
﴿۷﴾ فراق کی رباعیوں کا مرکزی موضوع کیا ہے؟
﴿۸﴾ فراق کی چند نظموں کے نام لکھیے۔
﴿۹﴾ کس ادارے نے اور کب فراق کو اپنا فیلو مقرر کیا؟

13.04 فراقؔ گورکھ پوری کی شاعرانہ خصوصیات

فراقؔ گورکھ پوری نے جس شعری ماحول میں قلم اٹھایا اس وقت امیرؔ مینائی اور داغؔ دہلوی کا طوطی بول رہا تھا۔فراقؔ کے استاد وسیمؔ بھی امیرؔ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔اس لئے فراقؔ کا امیرؔ مینائی کے اثرات قبول کر لینا فطری عمل تھا۔چنانچہ فراقؔ کی ابتدائی غزلوں میں داغؔ اور امیرؔ کے اثرات بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔یہ اثرات کم و بیش ۱۹۴۰ء تک کی غزلوں پر واضح ہیں۔لیکن انھوں نے اپنی ذہانت اور تخلیقی صلاحیت کی وجہ سے بدلتی ہوئی قدروں اور فضا کو محسوس کر لیا۔غزل کے جدید ترین رجحانات پر غور کیا اور غزل کے نئے امکانات کی تلاش و جستجو میں مصروف رہے۔اس دوران یعنی ۱۹۴۰ء تک پہنچتے پہنچتے امیرؔ مینائی اور داغؔ دہلوی کا رنگ پھیکا پڑنے لگا تھا اور لوگوں کی نظریں عزیزؔ اور صفیؔ لکھنوی کی طرف اٹھنے لگی تھیں۔دوسری جانب حالیؔ کی کوششیں بھی برگ و بار لا رہی تھیں۔ان اسباب کی وجہ سے فراقؔ کے دورِ اوّل کی یعنی ۱۹۴۰ء تک کی غزلوں میں متعدّد اور مختلف شعرا کے رنگ، اسلوب، اور طرزِ فکر کا احساس ہوتا ہے تاہم اس پندرہ بیس سال کے عرصے میں غزل کے کسی ایک رنگ پر ٹھہرنے کے بجائے وہ ایک منفرد اور ذاتی آواز کی تلاش میں مسلسل سرگرداں رہے۔کبھی میرؔ کی جانب جھکے تو کبھی مومنؔ اور مصحفیؔ کی طرف۔اُسلوب احمد انصاری کے لفظوں میں:

> ''فراقؔ کی ابتدائی شاعری میں کئی اردو شاعروں کا رنگ جھلکتا ہے، جن میں مومنؔ، مصحفیؔ، اور امیرؔ مینائی قابلِ ذکر ہیں۔''

دوسرے لفظوں میں فراقؔ نے حسرتؔ کی طرح ہر استاد شاعر سے کسبِ فیض کرنے کی سعی کی۔چنانچہ ان کے کلام میں دردمندی، سوز و گداز اور نشتریت میرؔ کی یاد دلاتی ہے تو ان کا ادراکِ رنگ و نور، حد سے بڑھا ہوا احساسِ جمال، خارجیت اور داخلیت کا دل کش امتزاج مصحفیؔ اور حسرتؔ سے کسبِ فیض کی شہادت دیتا ہے۔نیز ان کا طرزِ تفکر اور فلسفیانہ بصیرت غالبؔ سے ذہنی قربت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

۱۹۳۵ء۔۴۰ء تک قریب فراقؔ نے شعوری طور پر تقلیدی اور روایتی رنگِ سخن سے انحراف کرنا شروع کیا۔شعور کی پختگی کے علاوہ ہندی اور انگریزی ادب کے مطالعے نے ذہن کو وسعت بخشی۔چنانچہ ان کے دورِ دوم (۱۹۴۰ء کے بعد) کی شاعری میں موضوعات کا تنوّع ملتا ہے اور زندگی سے الجھنے اور اس کو سمجھنے کی شعوری کوشش، حیات و کائنات کے مسائل اور ان پر غور و فکر، نیز ان سے ہم رشتگی کا احساس، مرد و عورت اور ان کے باہمی تعلّقات اور جنس وغیرہ جیسے موضوعات ان کے اشعار کے پیکر میں ڈھلنے لگے۔موضوعات کے تنوّع کے علاوہ ان کا اندازِ فکر بھی انہیں دیگر شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔دراصل فراقؔ کی شاعری کی فکری اساس خالص ہندوستانی بلکہ ہندو فلسفے پر قائم ہے۔چنانچہ ان کی شاعری میں حیات و کائنات، انسان و خدا، حُسن و عشق، زندگی اور موت وغیرہ کے تصوّرات خالص ویدک فلسفے پر مبنی ہیں۔ان کی شاعری کا پس منظر خالص ہندوستانی ہے۔ان کی غزلوں کا یہ ہندوستانی پس منظر قلی قطب شاہ، نظیرؔ اکبر آبادی اور ولیؔ دکنی سے قدرے مختلف ہے۔بلکہ فراقؔ کی شاعری کا ہندوستانی پس منظر وہ ہے جو کالی داس، جائسی، سورداس، میرا بائی، وِدّیا پتی اور جے دیو وغیرہ کے یہاں نظر آتا ہے۔یہی فراقؔ کی انفرادیت ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کو خالص قدیم ہندوستانی فضا کے پس منظر میں پیش کیا۔یہ ہندوستانی فضا اردو شاعری کی روایات اور غزل کے متعدّد رنگوں سے مل جل کر ان کی غزلوں میں قوسِ قزح کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔یہی ان کی شاعری کا واضح، منفرد اور بنیادی عنصر ہے۔بطورِ مثال یہ اشعار دیکھیں، جن میں مذکورہ عنصر بہت ہی نمایاں ہے:

ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو زندگی ہے کہ رام کا بن باس
شیو کا وِش پان تو سنا ہو گا میں بھی اے دوست پی گیا آنسو

فراقؔ نے جس طرح قدیم ہندوستانی فلسفے اور ہندو مذہب سے استفادہ کیا اسی طرح انہوں نے قدیم ہندی اور سنسکرت شاعری کے تجربوں سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا۔ چند مثالیں دیکھیے:

سنسکرت کا مشہور ڈرامہ نویس ''بھاس'' کہتا ہے کہ پچھلے پہر مندروں میں جلتے ہوئے چراغ ایسے لگ رہے ہیں جیسے نیند میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ فراقؔ کا تصرّف ملاحظہ ہو:

دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

اسی طرح سنسکرت کا ایک شاعر کہتا ہے کہ میری پریہ (محبوبہ) جہاں جہاں قدم رکھتی ہے وہاں کنول اُگ آتے ہیں۔ اب فراقؔ کے یہ اشعار دیکھیے:

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ
فرشِ مے خانہ پہ جلتے چلے جاتے ہیں چراغ
دیدنی ہے تری آہستہ روی اے ساقی!

اسی طرح ان کے متعدّد اشعار میں دیگر ہندی شاعروں بالخصوص میرابائی اور سورداس وغیرہ کے اثرات کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

قدیم ہندوستانی فضا اور روایات سے کسبِ فیض کرنے کے علاوہ فراقؔ نے مغربی ادب سے بھی فکری اور فنّی دونوں سطحوں پر استفادہ کیا۔ وہ انگریزی کے استاد تھے۔ انگریزی پڑھنا اور پڑھانا نہ صرف ان کا پیشہ تھا بلکہ ان کا اوڑھنا بچھونا بھی تھا۔ وہ انگریزی شاعری کے رموز و نکات سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے جہاں انگریزی ادب سے بہترین منظوم ترجمے لیے، وہیں مغربی ادب کے تجربات و احساسات اور روایات کو انہوں نے بہت قرینے سے اپنی غزلوں میں برتا۔ ان کے منظوم تراجم کے ماخذ کی نشان دہی تو بہ آسانی کی جاسکتی ہے لیکن قدیم ہندوستانی اور مغربی ادب کے عناصر، روایات اور تجربات کو انہوں نے اس طرح اپنی شاعری میں سمویا ہے کہ ان کے ماخذ کی نشان دہی مشکل ہے۔ یوں بھی فراقؔ بذاتِ خود اس بات کے قائل تھے کہ شاعر یا ادیب جتنی کامیابی سے کسی دوسرے ادب کے تجربات کو برتے گا اتنا ہی زیادہ یہ بتانا دشوار ہوگا کہ یہ تجربہ کس زبان و ادب سے کسب کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ شاعر یا ادیب بذاتِ خود ان تجربات اور اثرات کی نشان دہی نہ کرے۔ بزعمِ خود وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ انہوں نے دیگر زبان و ادب کے تجربات کو بڑی ہی خوبی، کامیابی اور سلیقے کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ بلاشبہ وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں۔ انہوں نے دیگر ادبیات سے استفادہ کرنے کے باوجود اپنا مخصوص اور منفرد لب و لہجہ برقرار رکھا بلکہ مغربی ادب کے تجربات اور احساسات کو ہندوستانی مزاج عطا کیا۔ تاہم اتنا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ انہوں نے ورڈس ورتھ، ٹینی سن اور ولیم بلیک وغیرہ جیسے مغربی شاعروں کے خیالات و تجربات سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ جیسا کہ نقی حسین جعفری فراقؔ کی شاعری کی اس صفت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انہوں (فراقؔ) نے انگریزی نظموں کے اردوترجمے کے دور کو بڑی فن کاری کے ساتھ ایک نئی شعری روایت میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ بجائے خود ایک بڑا کارنامہ ہوتا ہے۔لیکن فراقؔ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انگریزی شاعری کے بعض غالب اور اہم رجحانات اور رویّوں کو بھی اردو میں روشناس کرایا۔۔فراقؔ کا یہ تجربہ کتنا مفید اور کامیاب ہے اس بات کا اندازہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ آج اردو شعر گوئی کی روایت میں انگریزی ہی نہیں بلکہ بہت سی غیر ملکی زبانوں کے اہم اور مقبول رجحانات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔''

مختصراً اردو شاعری کو فراقؔ کی ایک بڑی عطا یہ ہے کہ انہوں نے اردو غزل کو قدیم ہندوستانی روایات اور زبان وادب سے قریب تر کر دیا اور مغربی ادب کے تجربات وروایات کو غزل کی فضا میں شامل کر دیا۔

فراقؔ کی غزلوں کا بنیادی موضوع حُسن وعشق ہے جو خالص مادّی اور دنیاوی ہے۔ کیوں کہ فراقؔ جسم کی مادّیت کے پرستار ہیں۔اس لئے ان کے یہاں جسم کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔فراقؔ جنس ہی کے راستے سے عشق کی تلاش کرتے ہیں لیکن اس کا یہ معنی ہرگز نہیں ہے کہ جنس ان کے یہاں عریاں ہوکر سامنے آتا ہے بلکہ جنسی جذبہ بھی جمالیاتی کیفیت میں تبدیل ہوتا نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وہ جنسی اور جذباتی گھٹن محسوس نہیں ہوتی جو لکھنؤ اسکول کا خاصہ ہے۔دراصل فراقؔ قدیم ہندو تصوّر کے مطابق جنس کو تطہیرِ جذبات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔عشق ان کے نزدیک صرف جسمانی تسکین کا ذریعہ نہیں بلکہ وجدانی انبساط اور تقدیس کا سرچشمہ بھی ہے۔

فراقؔ کے الفاظ میں:

''پُرعظمت عشقیہ شاعری کا ایک افادی پہلو بھی ہے۔ایسی شاعری ایک تو ہمارے ادراک وجذبات میں بڑی قوّتیں اور لطافتیں پیدا کر دیتی ہے، دوسرے ایسی شاعری جنم اس وقت لیتی ہے جب عشق کی شدّتیں صحیح سلامت رہ جائیں لیکن اس کی کثافتیں اور آلودگیاں شعور میں اپنی ارتقائی صورت حاصل کر لیں اس وقت محبت کا طوفان بھر پور ہوتا ہے لیکن اس میں ایک سکون بھی آجاتا ہے۔''

فراقؔ کے مذکورہ بالا بیان کے آئینے میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ذرا وصال کے بعد آئنہ تو دیکھ اے دوست! ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی ہے

مری آغوش سے اُٹھ کر کبھی آئینہ دیکھا ہے سحر کو اور بھی بڑھ جاتی ہے دوشیزگی تیری

درج بالا اشعار اردو شاعری کی روایت سے قطعی مختلف ہیں۔ان کے مبتذل ہونے یا نہ ہونے کی بحث اور فراقؔ کے مذکورہ خیال سے اتّفاق یا عدمِ اتّفاق سے قطعِ نظر یہ بات حتمی ہے کہ جہاں کہیں فراقؔ نے اپنے جذبات کو تہذیب اور شائستگی کے ساتھ پیش کیا ہے وہاں ان کی شاعری میں سرشاری اور والہانہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔اس طرز کے اشعار میں کہیں کہیں بے پناہ سوز وگداز اور دردمندی کا احساس بھی ہوتا ہے۔شاید یہ غم انگیز تاثر ان کی ازدواجی زندگی کی ناکامی کی دین ہے۔

شام بھی تھی دھواں دھواں، حُسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں
پھر یہ کیسی کسک سی ہے دل میں
تجھ کو مدّت ہوئی کہ بھول چکا
سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنّا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں
بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ! ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

فراقؔ کا تصوّرِ عشق محدود نہیں، وہ اپنے اردگرد عشق ومحبت کا حصار کھینچ کر آنکھیں نہیں چراتے، عشق کو محبوب کی جلوہ گاہ تک محدود رکھنے کے بجائے اس میں ساری کائنات کو شامل کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے انسانوں کی زندگیوں میں پائی جانے والی محرومیوں اور ناکامیوں کو محسوس کرتے ہیں اور اپنی غزلوں میں ان کی عکّاسی کرتے ہیں۔ اس طرح وہ عرفانِ عشق کے ساتھ ساتھ، نئی قدروں اور زندگی کے سینے میں پلنے والے طوفانوں کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں۔ ایسے مقامات پر غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں ایک دوسرے میں گھل کر فراقؔ کی غزلوں کی شعری فضا کو ایک عجب سا تاثر دے جاتے ہیں:

اس دور میں زندگی بشر کی بیمار کی رات ہو گئی ہے
چپ ہو گئے تیرے رونے والے دنیا کا خیال آ گیا ہے
زندگی کیا ہے آج اِسے اے دوست! سوچ لیں اور اداس ہو جائیں
اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں
ایسے بھی ہیں کہ کٹ نہ سکی جن سے ایک رات

فراقؔ کی شاعرانہ شخصیت کو عظمت بخشنے میں ان کے لب و لہجے کا بھی بڑا دخل ہے، جس میں بلا کا سوز اور ساتھ ساتھ بلا کی رعنائی اور دل کشی بھی ہے۔ اس معاملے میں بھی انہوں نے پرانی روایت سے استفادہ ضرور کیا لیکن اس میں بھی اپنی ذہانت سے اضافہ کیا۔ انہوں نے اپنے ہمہ گیر تجربوں کو نئے لب و لہجے اور نئے آہنگ کے ساتھ پیش کر کے کائناتِ غزل کو وسعت بخشی۔ فراقؔ نے اپنے فن کو بیرونی عناصر کے بجائے ہندوستان کی دھرتی پر بکھرے حسن پاروں سے اس طرح سجانے کی کوشش کی کہ ان کا لہجہ نہ صرف ممتاز اور منفرد نظر آتا ہے بلکہ اس میں بڑی اپیل بھی پیدا ہو گئی ہے۔ فراقؔ نے غزل کی مروّجہ تشبیہوں اور استعاروں میں ہندوستانیت کی روح کو شامل کر دیا ہے۔ جس کی بدولت ان کے اشعار میں ہندی شاعری میں پائی جانے والی ارضیت، نغمگی، موسیقی، تازگی اور دل کشی پیدا ہو گئی ہے۔

خیالِ گیسوئے جاناں کی وسعتیں مت پوچھ
کہ جیسے پھیلتا جاتا ہے شام کا سایہ

دلوں کو تیرے تبسّم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ
ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو
زندگی ہے کہ رام کا بن باس

فراقؔ کی تشبیہوں اوراستعاروں میں ندرت اور دل کشی کے ساتھ ساتھ حرکت اور زندگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہ حرکت اور زندگی شاید ان مظاہرِ فطرت کی وجہ سے ہے جن سے انہوں نے اپنی تشبیہوں اور استعاروں کو سجایا ہے۔ شام، صبح، ستارے، پھول اور شبنم وغیرہ ان کی شاعری میں شامل ہوکر مختلف حقیقتوں کی زندہ علامتیں بن جاتی ہیں۔ یہ علائم چوں کہ ہمارے گردوپیش سے تعلّق رکھتے ہیں اس لئے دل کش اور مؤثرمحسوس ہوتے ہیں۔

شام بھی تھی دھواں دھواں، حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں
طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

فراقؔ کی متعدّد شعری خوبیوں کے باوجود ان کی بسیار گوئی ان کی غزلوں کی ایک بڑی خامی ہے۔ ان کی غزلوں میں بسا اوقات اشعار کی تعداد پچّیس تیس تک پہنچ جاتی ہے۔ غالباً اس سبب سے ان کی طویل غزلوں میں بہتیرے اشعار صرف قافیہ پیمائی تک محدود ہوکر رہ جاتے ہیں اور طوالت کے علاوہ تکرارِ مضمون کا احساس بھی ہوتا ہے۔ دوسرا بڑا عیب ان کی شاعری کا یہ ہے کہ انہوں نے جہاں ہندی اور اردو زبان کی آمیزش سے شاعری کے خوب صورت نمونے پیش کیے وہیں بعض جگہوں پر ان کی زبان کھردری اور اکھڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً درج ذیل اشعار میں لفظوں کا انتخاب دیکھیے۔ غزل جیسی صنف ایسی زبان کی متحمّل نہیں ہوسکتی:

دل کو دیکھ لے دل میں بنالے   پریم باٹکا ، پریم تڑاگ
کرکے دکھا کچھ لے کے نہ بیٹھ   خوشی اور غم کا کھڑاگ

ان خامیوں کے باوجود مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ فراقؔ ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے غزل کے وسیع تر امکانات پر غور کیا اور اسے نئی سمتوں سے آشنا کیا۔ انہوں نے ہر تحریک کے صحت مند عناصر کو سمجھا اور اپنی غزلوں میں جگہ دی نیز غزل کو نیا انداز اور نئی زبان عطا کی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ فراقؔ شاعری میں کس کے شاگرد تھے؟

﴿۱۱﴾ فراقؔ کی شاعری کا دوسرا دَور کب شروع ہوا؟

﴿۱۲﴾ فراقؔ کی غزلوں کی چند واضح خوبیاں لکھیے۔

13.05 فراقؔ گورکھ پوری کی پہلی غزل

﴿۱﴾

﴿۱﴾ سر میں سودا بھی نہیں ،دل میں تمنّا بھی نہیں
لیکن اِس ترکِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں

﴿۲﴾ دل کی گنتی نہ یگانوں میں، نہ بے گانوں میں
لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

﴿۳﴾ مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست!
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں

﴿۴﴾ ایک مدّت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے، ایسا بھی نہیں

﴿۵﴾ آہ یہ مجمعِ احباب ، یہ بزمِ خاموش
آج محفل میں فراقِؔ سخن آرا بھی نہیں

13.06 فراقؔ گورکھ پوری کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ وہم اور یقین کے درمیان کی کیفیت اس غزل کا خاصہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس غزل کے جملہ اشعار پر ایک طرح کی دھند چھائی ہوئی ہے۔ اس دھند کی کیفیت کے سبب اشعار کے حسن میں اضافہ ہوگیا ہے۔ واضح رہے کہ دھندیا ''نیم حجابی'' فنونِ لطیفہ کو فزوں تر کرنے والے اسباب میں سے ایک بڑا سبب ہے۔ کیوں کہ بے پردہ حسن کے مقابلے میں نیم پردہ حسن اور واضح تصاویر وخیالات کے مقابلے میں غیر واضح تصاویر وخیالات انسانی ذہن وفکر، خیالات اور تصوّرات کو زیادہ برانگیختہ کرتے ہیں۔ کسی کہانی کا ایک نہایت ہی معنی خیز جملہ ہے کہ روشنی کے گل ہونے سے بینائی کا راستہ رک جاتا ہے، تصوّر چل پڑتا ہے۔ اس جملے کو ذہن میں رکھ کر غزل کو محسوس کریں تو واقعی لطف اندوز ہوں گے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: محبت سے کنارہ کشی کی وجہ سے اب نہ تو میرے سر میں سودائے محبت ہے اور نہ ہی میرے دل میں کوئی تمنّا اور آرزو ہے۔ یعنی محبت سے دوری نے میرے دل کو پژمردہ کر دیا ہے۔ دل کی ساری امنگوں کو ختم کر دیا ہے۔ لیکن ترکِ محبت کا یہ بھرم اور عزم کب تک قائم رہے گا۔؟ مجھے اس کے تادیر قائم رہنے پر بھروسہ بھی نہیں ہے۔

دوسرا شعر: محفلِ محبوب میں میرے دل کا یعنی میرا شمار نہ تو بے گانوں میں ہوتا ہے اور نہ ہی اپنوں میں، گویا میں محبوب کے لئے ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا ہوں۔اس کے باوجود میرا دل جلوہ گاہِ ناز یعنی محبوب کی محفل سے اٹھنے کو تیار نہیں ہے۔

تیسرا شعر: اے دوست! ترس کھا کر مہربانی کرنے کو محبت میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔میں تو تیرے اس رحم کے بجائے تمہاری اس بے جا خفگی اور رنجش کا خواہش مند ہوں جو تو مجھ سے محبت کے طور پر روا رکھتا ہے۔

چوتھا شعر: بہت دنوں سے ہم کو تمہاری یاد نہیں آئی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم نے تم کو فراموش کر دیا ہے۔بس غمِ دوراں اور دنیاوی مصروفیتوں کی وجہ سے تمہاری یادوں میں گم نہیں ہوسکا۔

پانچواں شعر: آہ (افسوس کرتے ہوئے) دوستوں کا یہ مجمع اور ان کی خاموش محفل۔افسوس کہ آج اس محفلِ احباب میں فراؔق بھی اپنا کلام نہیں سنا رہا ہے۔وہ فراؔق جو محبوب کی موجودگی میں ہمیشہ چہکتا رہتا تھا۔آج اس کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہ بھی خاموش ہے۔مختصراً محفل میں آج محبوب کی غیر موجودگی کی وجہ سے خاموشی طاری ہے۔

13.07 فراؔق گورکھپوری کی دوسری غزل

﴿۲﴾

﴿۱﴾
بہت پہلے سے اُن قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی! ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

﴿۲﴾
جسے کہتی ہے دنیا کامیابی، وائے نادانی
اُسے کن قیمتوں پر کامیاب انسان لیتے ہیں

﴿۳﴾
طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

﴿۴﴾
ہم آہنگی میں بھی اک چاشنی ہے اختلافوں کی
مری باتیں بہ عنوانِ دگر وہ مان لیتے ہیں

﴿۵﴾
فراؔق اکثر بدل کر بھیس ملتا ہے کوئی کافر
کبھی ہم جان لیتے ہیں، کبھی پہچان لیتے ہیں

13.08 فراقؔ گورکھ پوری کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔غزل کا ہر شعر بہ اعتبارِ موضوع ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔اس غزل میں بھی تقریباً تمام شعروں کے موضوعات منفرد ہیں۔تاہم ''یاد'' اور ''محبت'' اس مکمّل غزل کا بنیادی تاثر ہے۔''یادوں کی چادر'' جو ہندی شاعری کے تصوّر ''اب کے برس مری رنگ دے چنریا'' اور ''باتوں کے مان لینے کا عمل'' سے واضح ہوتا ہے کہ اس غزل میں روح اور جوہر کے مقابلے میں ''مادّے'' کو فوقیت حاصل ہے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: اے محبوب! ہم محض تمہارے قدموں کی آہٹ سے تم کو جان لیتے ہیں، تمہارے وجود کا احساس کر لیتے ہیں۔اے محبوب! تم ہماری زندگی ہو، تمہیں تو ہم دور ہی سے پہچان لیتے ہیں۔یعنی محبت میں اس قدر شدّت ہے کہ حواسِ خمسہ کے بغیر ہی ہم اس کا ادراک کر لیتے ہیں۔

دوسرا شعر: جسے دنیا کامیابی کہتی ہے اس کو پانے کے لئے طرح طرح کی قیمتیں چکانی پڑتی ہیں۔ہم کو تو کامیابی کے لئے طرح طرح کی قیمتیں چکانے والے لوگوں کی نادانی پر افسوس ہوتا ہے۔

تیسرا شعر: جب سنسان اور خاموش راتوں میں اپنی طبیعت گھبراتی ہے تو ہم اپنے محبوب کو یاد کر لیتے ہیں۔گویا اس کی یاد راحت اور طبیعت کو سکون دینے والی ہے۔

چوتھا شعر: دوستی اور محبت میں اَن بن اور اختلافات کی مٹھاس شامل ہوتی ہے۔دوسرے لفظوں میں تھوڑے بہت اختلافات دوستی اور محبت کو مزید پختہ کر دیتے ہیں۔اس لئے وہ یعنی محبوب مری باتوں کو کسی نہ کسی طریقے سے مان لیتا ہے۔یعنی ہمارے مابین ایسی ہم آہنگی ہے جس میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہے، لیکن وہ میری مخالفت صرف اس لئے کرتا ہے کہ کچھ دیر اختلافات کا لطف اٹھایا جائے تاکہ تھوڑی بہت اَن بن سے محبت میں مزید شدّت اور گہرائی پیدا ہو جائے۔

پانچواں شعر: اے فراقؔ! بھیس بدل کر اکثر ہم سے کوئی کافر (یعنی محبوب) ملتا ہے۔کبھی تو ہم بھیس بدلنے کے باوجود اس کو پہچان لیتے ہیں تو کبھی اس کے ناز و انداز سے ہم جان لیتے ہیں کہ یہ سوائے میرے محبوب کے کوئی اور نہیں ہے۔

13.09 خلاصہ

فراقؔ گورکھ پوری کا پورا نام رگھو پتی سہائے اور تخلص فراقؔ گورکھ پوری تھا۔اپنے گھر کے شاعرانہ ماحول میں انہوں نے ہوش سنبھالا اور اوائلِ عمر سے ہی شاعری کی ابتدا کی۔بی.اے کے بعد ڈپٹی کلکٹری کے لئے منتخب ہوئے لیکن استعفیٰ دے کر آزادی کے متوالوں میں شامل ہو گئے۔ایم.اے کرنے کے بعد الٰہ آباد یونی ورسٹی میں بحیثیتِ انگریزی استاد ان کا تقرّر ہو گیا لیکن انہوں نے اپنا سارا تخلیقی کام اردو میں ہی کیا۔انہوں نے اردو شاعری میں قدیم ہندوستانی شاعرانہ تصوّرات اور مغربی ادب کے خیالات و تجربات کو شامل کر کے اردو ادب کو وسعت دی۔انہوں نے بہترین غزلوں کے علاوہ کئی کامیاب نظمیں اور رباعیات بھی لکھیں۔ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں گیان پیٹھ انعام سے نوازا گیا اور یو جی سی نے انہیں اپنا فیلو مقرّر کیا۔دل کا دورہ پڑنے کے سبب ۳/ مارچ ۱۹۸۲ء کو دہلی میں ان کی وفات ہوئی۔

13.10 فرہنگ

آزاد تلازمہ	:	ادب کی ایک تکنیک ہے	رنجش	:	دشمنی، ناراضی
آفاقی	:	عالمی	شغف	:	دل چسپی
آلودگی	:	گندگی	طرزِ فکر	:	سوچنے کا طریقہ
اختلاف	:	اَن بن، خلاف	غمِ جاناں	:	محبوب کا غم
استفادہ کرنا	:	فائدہ اٹھانا	غمِ دوراں	:	زمانے کا غم
امتزاج	:	اختلاط، باہم ملنا	کثافت	:	غلاظت
ایما	:	مرضی	کسبِ فیض کرنا	:	فائدہ اٹھانا
برگ و بار لانا	:	پھول پتّے لانا، ترقّی کرنا	گج گامنی	:	ہاتھی جیسی چال
بے جا	:	بلا وجہ	گیان پیٹھ ایوارڈ	:	حکومتِ ہند کی جانب سے دیا جانے والا سب سے بڑا ادبی انعام
تحلیلِ نفسی	:	نفسیات کی ایک اصطلاح ہے			
تطہیر	:	پاک کرنا	وسعت	:	پھیلاؤ
تقدیس	:	بزرگی	وِش پان	:	زہر پینا
چاشنی	:	مٹھاس	ہرلینا	:	پکڑ لینا، گرفتار کر لینا، جیت لینا
دیوناگری	:	ہندی رسم الخط	یگانہ	:	منفرد

13.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰۔۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : فراقؔ کی مختصر سوانح رقم کیجیے۔

سوال نمبر ۲ : فراقؔ کی ادبی خدمات پر ایک نوٹ لکھیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰۔۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : فراقؔ کی حیات کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی غزل گوئی کے بنیادی عناصر کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر ۲ : اپنی پسند کے فراقؔ کے چند اشعار لکھیے۔ ان کی تشریح کرتے ہوئے اپنی پسندیدگی کا سبب بتائیے۔

13.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو غزل از ڈاکٹر کامل قریشی

۲۔ فراقؔ کی شاعری از ڈاکٹر افغان اللہ خان

13.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ فراقؔ گورکھ پوری کا پورا نام رگھو پتی سہائے اور تخلّص فراقؔ تھا۔

﴿۲﴾ فراقؔ گورکھ پور میں پیدا ہوئے۔

﴿۳﴾ فراقؔ ڈپٹی کلکٹری کی سرکاری نوکری کے لئے نام زَد ہوئے تھے۔

﴿۴﴾ فراقؔ الٰہ آباد یونی ورسٹی میں انگریزی کے استاد تھے۔

﴿۵﴾ فراقؔ کے شعری مجموعوں کے نام ہیں: مشعل، شعلۂ ساز، گلِ نغمہ، دھرتی کی کروٹ اور چراغاں۔

﴿۶﴾ فراقؔ کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے ۱۹۷۰ء میں نوازا گیا۔

﴿۷﴾ ہندو گھرانوں کی عورتیں اور ہندو تہذیب فراقؔ کی رباعیوں کا خاص موضوع ہے۔

﴿۸﴾ فراقؔ کی چند نظموں کے نام ہیں: ہنڈولہ، آدھی رات، جگنو اور پرچھائیاں وغیرہ۔

﴿۹﴾ ۱۹۷۰ء میں یو جی سی نے فراقؔ کو اپنا فیلو مقرّر کیا۔

﴿۱۰﴾ فراقؔ، وسیمؔ کے شاگرد تھے۔

﴿۱۱﴾ فراقؔ کی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۴۰ء کے آس پاس شروع ہوا۔

﴿۱۲﴾ فراقؔ کی غزلوں کی واضح خصوصیات ہیں:

- ☆ ہندی اور اردو زبان کی آمیزش والی زبان۔
- ☆ قدیم ہندوستانی ادب و روایات کا غزلوں میں استعمال۔
- ☆ انگریزی ادب سے استفادہ۔
- ☆ مقامی رنگ میں رنگے ہوئے تشبیہات و استعارات وغیرہ۔

✵

اکائی 14 : مجروحؔ سلطان پوری

ساخت

14.01 : اغراض ومقاصد

14.02 : تمہید

14.03 : مجروحؔ سلطان پوری کے حالاتِ زندگی

14.04 : مجروحؔ سلطان پوری کی شاعرانہ خصوصیات

14.05 : مجروحؔ سلطان پوری کی پہلی غزل

14.06 : مجروحؔ سلطان پوری کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

14.07 : مجروحؔ سلطان پوری کی دوسری غزل

14.08 : مجروحؔ سلطان پوری کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

14.09 : خلاصہ

14.10 : فرہنگ

14.11 : نمونہ امتحانی سوالات

14.12 : حوالہ جاتی کتب

14.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

14.01 اغراض ومقاصد

یہ اکائی اردو کے نام وَر غزل گو اور مشہور فلمی نغمہ نگار مجروحؔ سلطان پوری کی شاعرانہ خصوصیات کے تفصیلی جائزے پر مبنی ہے۔اس اکائی کے مطالعے سے آپ مجروحؔ سلطان پوری کی زندگی کے حالات، ان کی غزل گوئی اور نمایاں خصوصیات کے تعلّق سے معلومات حاصل کریں گے۔اس کے ساتھ ہی مجروح کی شاملِ نصاب دوغزلوں کے اشعار کی تشریح سے آپ کو ان اشعار کے مفہوم اوران کے ادبی وفنّی نیز شعری محاسن سے واقفیت حاصل ہوگی۔ ہر حصے کے آخر میں مطالعے کی جانچ کے لئے چند سوالات دیے گئے ہیں۔ان کے جوابات سے آپ اپنے مطالعے سے حاصل کردہ معلومات کی جانچ کر سکیں گے۔ پوری اکائی کا خلاصہ درج کرنے کے ساتھ ہی امتحانی سوالات کے نمونے ،مشکل الفاظ کے معانی اور معاون کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے جو آپ کے مطالعے کو مزید افادیت بخشے گی۔آپ کی سہولت کے لئے اپنے مطالعے کی جانچ کے عنوان کے تحت پوچھے گئے سوالوں کے جوابات بھی دیے گئے ہیں۔

14.02 تمہید

غزل کو اردو کی آبرو کہا گیا ہے۔اردو کی تمام اصنافِ شعری میں جو مقبولت و اہمیت غزل کو حاصل ہوئی ہے وہ کسی اور صنف کے حصے میں نہ آسکی۔قصیدہ درباروں کے ساتھ ختم ہوگیا۔مثنویوں کا رواج نہ رہا۔مرثیے کا تعلّق ادب کے ساتھ عقیدے سے بھی تھا۔اس لئے ابھی کسی حد تک باقی ہے مگر غزل کی مقبولیت عام تھی اور آج بھی اس کی مقبولیت قائم ہے۔نہ صرف یہ کہ قائم ہے بلکہ روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔غزل کی اس عدیم المثال مقبولیت سے قطعِ نظر اس پر کئی ادبی و نیم ادبی حلقوں کی جانب سے حملے بھی خوب ہوئے۔کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنفِ سخن قرار دیا۔ترقی پسند شعرانے اپنے افکار وخیالات کے اظہار کے لئے اس کی فنّی وشعری حدود کا شکوہ کیا اور عظمت اللہ نے تو اس صنف کی گردن ہی ماردینے کا مشورہ دے ڈالا۔ایسے پُر آشوب دَور میں جب غزل پر ہر طرف سے حملے ہورہے تھے،اس کے دفاع میں خود ترقّی پسند شعرا کے حلقے کے ہی دو اہم ترین شاعر فیضؔ اور مجروحؔ سامنے آئے۔فیض احمد فیضؔ نے انتہائی خوب صورت غزلیں کہیں لیکن نظم نگاری سے بھی اپنا رشتہ اسی قدر استوار رکھا مگر مجروحؔ شروع سے آخر تک محض غزل گو ہی رہے۔یہاں تک کہ ان کے اکلوتے شعری مجموعے کا عنوان ''غزل'' ہی قرار پایا۔ذیل میں ہم اردو کے اسی ممتاز غزل گو شاعر کی حیات اور اس کی شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ لیں گے۔

14.03 مجروحؔ سلطان پوری کے حالاتِ زندگی

مجروؔح سلطان پوری کا پورا نام اسرار حسن خاں تھا۔نسلاً پٹھان تھے۔خاندان کا تعلق اترپردیش کے ضلع سلطان پور سے تھا۔مجروح کے والد محمد حسن خاں محکمۂ پولیس میں ملازم تھے اور مجروحؔ کی ولادت کے وقت اعظم گڑھ (یوپی) میں ملازمت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔مجروح اعظم گڑھ کے ہی ایک قصبے نظام آباد میں یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔بچپن کا زمانہ نظام آباد میں ہی گزرا اور وہیں مجروح نے ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی جو کہ عربی، فارسی اور اردو پر مشتمل تھی۔کیوں کہ ۱۹۲۱ء میں تحریکِ خلافت کے دَوران ان کے والد نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ مجروح کو انگریزی تعلیم نہیں دلوائیں گے۔۱۹۲۸ء میں وہ قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد (یوپیؔ) گئے اور ایک مدرسے میں انہیں داخل کردیا گیا۔تاکہ درسِ نظامی کی تعلیم حاصل کرسکیں لیکن ایک مدرّس سے جھگڑے کی وجہ سے مجروح مدرسے سے ہٹادیے گئے اور اس طرح مذہبی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔کچھ عرصہ بے کار رہنے کے بعد ۱۹۳۳ء میں وہ لکھنؤ آگئے اور یہاں طبّیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔مجروح بہت ذہین طالبِ علم تھے اور طالبِ علمی ہی کے زمانے میں طبّ پر انہیں کافی دست گاہ حاصل ہوگئی۔طبّ کے ساتھ ہی موسیقی کی طرف بھی ان کی طبیعت مائل تھی اور لکھنؤ کے دورانِ قیام انہوں نے میوزک کالج میں بھی داخلہ لے لیا تھا۔۱۹۳۸ء میں طبّیہ کالج سے طبّ کی سند حاصل کرنے کے بعد مجروح پھر فیض آباد کے قصبہ ٹانڈہ آگئے اور انہوں نے یہیں مطب کرلیا۔لیکن جلد ہی وہ اپنے آبائی وطن سلطان پور واپس آگئے۔

مجروح کی طبیعت شعر گوئی کی طرف بچپن سے ہی مائل تھی۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں ہی انہوں نے شعر کہنا شروع کردیا تھا۔یہ ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء کا زمانہ تھا۔سلطان پور کے ایک مشاعرے میں مجروح سلطان پوری شریک ہوئے اور پہلی بار غزل سنائی۔انہیں بے پناہ داد ملی اور انہوں نے مولانا آسؔ لکھنوی کی شاگردی اختیار کرلی۔مولانا آس کا شمار اساتذۂ وقت میں ہوتا تھا۔وہ اتّفاق سے اس مشاعرے میں بھی شریک تھے جہاں مجروح نے اپنی پہلی غزل پڑھی تھی۔یہ سلسلۂ اصلاح بہت دنوں تک نہ چل سکا اور مجروح سلطان پوری نے پھر کسی کو اپنا کلام بغرضِ اصلاح نہیں پیش کیا اور خود محنت کرکے فنِ شاعری اور زبان وبیان پر قدرت حاصل کی۔ان کی ذہنی تربیت میں جگر مرادآبادی اور

رشید احمد صدّیقی کا نمایاں کردار رہا۔رشید صاحب نے تین سال تک انہیں علی گڑھ میں اپنے گھر پر رکھا۔اس دَوران مجؔروح نے کلاسیکی ادب کا خوب مطالعہ کیا۔

۱۹۴۵ء میں ایک نوجوان شاعر کی حیثیت سے مجؔروح نے جگر مرادآبادی کے ساتھ ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے ممبئی کا سفر کیا۔ یہ مشاعرہ مجؔروح کی زندگی کا اہم ترین موڑ ثابت ہوا۔مشاعرے میں موجود اس وقت کے صفِ اوّل کے ڈائریکٹر عبدالرشید کاردار نے اپنی فلم شاہ جہاں میں گیت لکھنے کے لئے مجروح کو ملازمت کی پیش کش کی۔تنخواہ پانچ ہزار روپیے مقرر ہوئی اور پھر مجروؔح ممبئی کے ہی ہورہے۔'شاہ جہاں' میں اس وقت کی مایہ ناز گلوکار کے۔ایل۔سہگل کی آواز میں مجؔروح کے لکھے گانوں نے برِّصغیر میں ایک دھوم مچادی۔''غم دِیے مستقل''، ''جب دل ہی ٹوٹ گیا'' جیسے گانوں سے مجروؔح کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔یہ مجؔروح کے فلمی سفر کا آغاز تھا۔جو کم وبیش پچپن برس جاری رہا اوران کی موت پر ہی ختم ہوا۔مجؔروح نے تقریباً ساڑھے تین سو گانے لکھے،جن میں شاہ جہاں،ممتا،آرتی،پاکیزہ،انداز،آرزو،فٹ پاتھ،تیسری منزل اور دوستی جیسی مشہور اور کامیاب فلموں کے گانے شامل تھے۔مجؔروح نے فلمی نغموں کو ادبیت اور شعریت سے ہم کنار کیا۔اردو کے بہت سے الفاظ جو عام بول چال کی زبان میں کم استعمال تھے ان نغموں کی بدولت لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے۔ممبئی کے دوران ہی اشتراکیت اور ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی کا آغاز ہوا اور وہ آہستہ آہستہ انجمن ترقّی پسند مصنّفین کے سرگرم رکن بن گئے۔وہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بھی بن گئے اور پارٹی کی کارروائیوں میں حصہ لینے لگے۔اسی دَور میں انہوں نے چند ایسے اشعار اور نظمیں کہیں جن کی وجہ سے انہیں جیل بھی جانا پڑا اور وہ ایک سال تک جیل میں رہے۔۱۹۵۳ء میں انجمن ترقّی اردو (ہند) نے ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ''غزل'' شائع کیا۔ فلموں کی مصروفیت کی وجہ سے مجروؔح کا شعری سفر بہت ہی متاثر ہوا اور ان کا یہی مجموعہ مختلف ناموں سے بار بار برائے نام اضافے کے ساتھ سامنے آتا رہا۔مجؔروح کے انتقال سے ایک سال قبل ۱۹۹۹ء میں یہ آخری بار ''مشعلِ جاں'' کے نام سے شائع ہوا۔مجؔروح کی زندگی میں ان کے علم وفن کا خاطر خواہ اعتراف کیا گیا اور انہیں اعزازات سے نوازا گیا،جن میں ہندوستانی فلم انڈسٹری کا سب سے بڑا اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ بھی شامل ہے۔ان کی شاعری کا انگریزی ترجمہ Never Mind Your Change کے نام سے شائع ہوا۔

مجؔروح نے ممبئی میں ایک آسودہ اور خوش حال زندگی گزاری۔ان کی خانگی زندگی آرام وسکون سے گزر رہی تھی کہ انہیں ایک ایسے حادثے کا سامنا کرنا پڑا جس نے ان کی تندرستی،ان کا عزم،اور زندگی میں ان کی دل چسپی کو یکسر ختم کردیا۔یہ حادثہ ان کے جوان بیٹے کی اچانک موت کا تھا،جس نے مجؔروح کی کمر توڑ دی اور وہ بیمار رہنے لگے۔یہ بیماری بڑھتی گئی اور آخرکار ۲۴؍مئی ۲۰۰۰ء کو ممبئی کے لیلاوتی اسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ مجؔروح کہاں پیدا ہوئے؟

﴿۲﴾ مجروؔح درسِ نظامی کی تکمیل کیوں نہ کرسکے؟

﴿۳﴾ مجؔروح نے کس فلم میں پہلی بار گانے لکھے؟

﴿۴﴾ مجؔروح کا مجموعہ پہلی بار کس نام سے شائع ہوا؟

﴿۵﴾ انہیں فلمی دنیا کا کون سا ایوارڈ دیا گیا؟

14.04 مجروحؔ سلطان پوری کی شاعرانہ خصوصیات

مجروحؔ سلطان پوری اپنے عہد کے ایک مقبول شاعر رہے۔ کسی شاعر کی عوامی مقبولیت عموماً اس کے ادبی مرتبے پر پردہ ڈال دیتی ہے ۔ مجروحؔ کی عمومی مقبولیت کے سبب بعض سنجیدہ ناقدین بہت دیر سے ان کی جانب متوجّہ ہوئے، یہاں تک کہ مجروحؔ نے زندگی کی آخری سانس لے لی۔ گذشتہ کئی دہائیوں سے مجروحؔ کے چند اشعار زبان زدِ خاص وعام ہیں۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ اتنا مختصر کہنے کے باوجود کوئی شاعر صرف چند شعروں کے ذریعے دل ودماغ میں جگہ بنالے ۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن ، جوشِ بہار رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
ہجومِ دہر میں بدلی نہ ہم سے وضعِ خرام گری کلاہ ، ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

ان اشعار کی مقبولیت کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں؟ ان میں معنی کی وہ قیمت بھی نہیں جو اچّھی یا بڑی شاعری کی ضرورت تصوّر کی جاتی ہے، باتیں بالکل صاف اور ساتھ کی ہیں۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

یہ شعر نہ جانے کتنی تحریروں اور تقریروں میں استعمال ہوا ہوگا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مجروحؔ کا درج بالا شعر بیسویں صدی کے نصف آخر کی شناخت بن گیا۔ اچھّے شعر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اسے ہر مکتبِ فکر کا آدمی اپنے سیاق میں پڑھتا ہے اور اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق معنی برآمد کرتا ہے۔ مجروحؔ کے ان اشعار کی مقبولیت میں جہاں ان میں پائے جانے والے عصری کرب کا دخل ہے اور اس کے جواب میں زندگی کو لطف ومسرّت سے بسر کرنے کی تمنّا ہے وہیں غزل کے اصل مزاج اور اس کی روایت کی پاس داری کا بھی دخل ہے۔

مجروحؔ کو ہم اردو غزل کا مزاج شناس کیوں کہتے ہیں؟ غزل اور نظم کے بہت اچھّے شعرا ان کے عہد میں موجود تھے خود جگرؔ جو سرمستی اور تغزّل میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ان سے مجروحؔ کو بہت قربت تھی۔ غلام ربّانی تاباںؔ، جذبیؔ، کیفیؔ اعظمی، سردار جعفریؔ، وامقؔ جون پوری، پرویزؔ شاہدی اور دوسرے ترقّی پسند وغیر ترقّی پسند شعرا موجود تھے۔ ان سب کی اہمیت اپنی جگہ ہے مگر ایک خاص بات جو دوسروں کے مقابلے میں قاری کو مجروحؔ کی طرف متوجّہ کرتی ہے وہ ان کی تغزّل پسندی یا دوسرے لفظوں میں غزل کی مزاج شناسی ہے۔ ہماری غزل کی روایت بہت قدیم، توانا اور مضبوط ہے۔ غزل میں ایک موڑ ترقّی پسندی کا آیا اور دوسرا جدیدیت کا۔ ترقّی پسندی کے زمانے میں ایک مرتبہ پھر غزل کو آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ نظموں کا چلن عام ہوا اور غزل بادِ مخالف کی زد میں آگئی۔ اس وقت بھی مجروحؔ نے غزل کا دامن نہیں چھوڑا۔ ان کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ جو موضوعات نظم میں پیش کیے جا رہے ہیں ان کو غزل کے پیکر میں ڈھالا جائے۔ مجروحؔ غزل کی قوّت کے معترف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے غزل سے کبھی بے اعتنائی نہیں برتی اور ایک مشکل وقت میں غزل کو سہارا دیا۔ اب اگر ان کے اشعار کبھی کبھی نعرہ بن جاتے ہیں تو یہ ان کی تخلیقی مجبوری تھی۔ ایک طرف وقتی تقاضے اور ضرورتیں تھیں اور دوسری طرف غزل کا ایمائی لہجہ تھا۔ مجروحؔ کے چند

اشعار میں وہ للکار اور احتجاج ہے جو نعرہ بازی کی سطح تک پہنچ جاتا ہے لیکن ان اشعار کی بنا پر مجروحؔ کی گرفت کرنا غلط ہے۔ کسی شاعر کے کلام کو مجموعی اعتبار سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ تا کہ اس کی شاعری کا مساوی رنگ اور رجحان سامنے آ سکے۔

غزل اس وقت تک اچھی ہے جب تک اس کے رشتے کلاسیکی غزل سے قائم ہیں۔ جہاں کلاسیکی رشتے ٹوٹ جاتے ہیں وہاں غزل نہیں رہتی بلکہ ذاتی تجربہ بن جاتی ہے۔ دراصل غزل بھی ایک جمالیاتی پیکر ہے۔ جہاں غزل سے جمالیات الگ ہو جاتی ہے وہاں وہ غزل نہیں رہ پاتی۔ مجروحؔ کی غزل اس جذبے اور احساس کی ترجمان ہے ۔

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے

ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

☆☆☆☆☆

شبِ انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی کبھی اک چراغ جلا دیا کبھی اک چراغ بجھا دیا

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

اُس نظر کے اٹھنے میں اُس نظر کے جھکنے میں نغمۂ سحر بھی ہے آہِ صبح گاہی بھی

مجروحؔ کے یہ اشعار خالص عشقیہ معلوم ہوتے ہیں۔ اب یہ استعمال کرنے والوں پر ہے کہ وہ انہیں کس سیاق وسباق میں استعمال کرتے ہیں۔ منشائے مصنّف کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے فیضؔ سے متعلق ایک بحث یہ اٹھائی ہے کہ فیضؔ کے یہاں ہم سیاسی معنی تلاش کرتے ہیں۔ اگر یہی مضمون اٹھارہویں صدی کے کسی شاعر کے کلام میں ہو تو ہم کہتے ہیں کہ وہ عشقیہ صنف سے تعلّق رکھتا ہے۔ سیاسی اور عشقیہ مفہوم کا تعلّق بڑی حد تک ہماری قراءت سے ہے۔ یہ بات نہایت اہم ہے کہ کسی شعر کو پڑھتے وقت ہم اس سے کس طرح کا مکالمہ قائم کرتے ہیں۔ ایک اچھا شعر کسی قاری کو اس کے ذوق کے مطابق کچھ نہ کچھ اپنی جھولی سے نکال کر عطا کر دیتا ہے۔ مجروحؔ بھی اُنہی شاعروں میں ہیں جن کے یہاں سیاسی مفاہیم کی تلاش کا عمل ہنوز جاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ مجروحؔ کے جو اشعار پیش کیے گئے ہیں وہ ہمیں کیوں کر سرور و انبساط سے ہم کنار کرتے ہیں۔ ہاتھ میں ہاتھ آ جانا، چراغِ راہ کا جل جانا، شبِ انتظار کی کشمکش میں چراغ کا جلانا اور بجھانا، آرزو کا ہنس کر باہیں ڈال دینا، نظر کے اٹھنے اور جھکنے کو نغمۂ سحر اور آہِ صبح گاہی سے تشبیہ دینا دراصل غزل کی اس تہذیب اور روایت کا اظہار ہے جو میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، یگانہؔ، حسرتؔ، فانیؔ، فراقؔ اور جگرؔ کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہے۔ مجروحؔ کے یہ اشعار کلاسیکی غزل سے ہم آہنگ ہیں۔ گفتگو کا یہ انداز، محبت کی ایسی دھیمی دھیمی آنچ دراصل غزل کے پورے کلچر کو نمایاں کرتی ہے۔ گذشتہ تین چار دہائیوں کے درمیان عصری آگہی کی اصطلاح اتنی عام ہوئی اور اس کا استعمال اس کثرت سے ہوا کہ زندگی کی ازلی اور دائمی قدریں نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔ عصری حسّیت کو چند بندھے ٹکے موضوعات کی روشنی میں دیکھا اور سمجھا جانے لگا۔ اس اظہار میں بھی کچھ الفاظ وتراکیب کو ضروری سمجھا گیا۔ اس صورت میں مجروحؔ کی غزل کا مخصوص اُسلوب بدلے ہوئے اس مذاق ومزاج کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ مجروحؔ سے اکثر لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ وہ بدلے ہوئے وقت میں خود کو تبدیل نہیں کر سکے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مجروحؔ نئی آگہی یا عصری آگہی کا ادراک نہیں رکھتے تھے اور لازماً نئی تبدیلیوں کا خیر مقدم نہیں کر سکے۔ مجروحؔ کے یہاں زبان کا ایک طے شدہ نظام ہے اور وہ اس سے باز آنے کی کوشش نہیں

کرتے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مجروحؔ اگر زبان کی اس حد کو توڑنے میں کامیاب ہو جاتے تو ان کی غزل میں زیادہ تنوّع آ سکتا تھا۔لیکن انہوں نے اپنے رنگ میں جو کچھ کہا ہے اس کی تازگی ہمیشہ باقی رہے گی۔جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ بعض لکھنے والوں کا خیال ہے کہ ان کے یہاں عصری حسّیت نہیں ہے شاید ایسا کہنے والوں نے عصری حسّیت کے پورے سیاق کی طرف توجّہ نہیں دی۔مجروحؔ کے یہاں عصری حسّیت کو بیانیہ کی شکل میں تلاش کرنا درست نہیں ہوگا۔مجروحؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کی غزل کلاسیکیت میں رچی بسی ہے۔اس لئے وہ جو بات کرتے ہیں، وہ بھی استعاروں اور کنایوں کے لباس میں رہتی ہے۔وہاں تک پہنچنے میں قاری کو بھی شعری جمالیات کے ساتھ سفر کرنا پڑتا ہے۔مجروحؔ کی غزل کا ڈکشن چوں کہ کلاسیکی غزل سے مستعار ہے اس لئے بعض جدّت پسند مجروحؔ کو پسند نہیں کرتے۔چمن، باغباں، زنداں، گلشن اور اس طرح کے دوسرے الفاظ سے خواہ مخواہ کی الرجی کلاسیکی شاعری کے مزاج اور اس کے امکانات سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوئی ہے۔مجروحؔ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔وہ ترقّی پسند ہیں یا غیر ترقّی پسند، ایک طالبِ علم کو ان باتوں سے زیادہ دل چسپی نہیں ہونی چاہیے۔اصل چیز شعری متن ہے۔اس کا فکری نظام جس اُسلوب کے ذریعے سامنے آیا ہے، وہی شاعر کی بڑی طاقت ہے۔متن سے باہر کچھ نہیں ہے۔ادب کا ایک سچّا اور سنجیدہ طالبِ علم اور قاری متن میں پوشیدہ آگہی اور بصیرت سے اپنے شعور و آگہی میں اضافہ کرتا ہے۔مجروحؔ کی غزل جس طرح ہمارے دلوں کو چھوتی ہے اور ان میں ارتعاش پیدا کرتی ہے وہ مجروحؔ کی انفرادیت ہے۔ترقّی پسند غزل پر جو اعتراضات ہوئے ہیں، مجروحؔ کی غزل خود اُن کا جواب ہے۔مجروحؔ کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے بتایا کہ غزل میں Potentiality کتنی ہے اور وہ عصری تبدیلیوں کا کتنا ساتھ دے سکتی ہے۔مجروحؔ نے مشکل وقت میں بھی رجائیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور اپنی کج کلاہی قائم رکھی۔مجروحؔ کی ترقّی پسندی کا اصل رشتہ ترقّی پسندی کی اس روایت سے بھی ہے جو ایک مدّت سے ہماری شاعری میں موجود ہے۔غالبؔ کے چند اشعار کو مجروحؔ کے اشعار کے ساتھ پڑھیے۔

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجیے کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

اب مجروحؔ کے یہ اشعار پڑھیے۔

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
سرشک رنگ نہ بخشے تو کیوں ہو بارِ مژہ لہو حنا نہیں بنتا تو کیوں بدن میں رہے
رہے نہ آنکھ تو کیوں دیکھیے ستم کی طرف کٹے زبان تو کیوں حرفِ نا سزا کہیے
نہ ہم قفس میں رکے مثلِ بوئے گُل صیّاد نہ ہم مثالِ صبا حلقۂ رسن میں رہے

مجروحؔ کی غزل میں کلاسیکی غزل کا رچاؤ اور اس کی روح موجود ہے۔مجروحؔ جیسی غزل کہنے والے کتنے ہیں۔کلاسیکی غزل کے تمام شعری لوازمات کو برتنا ہمیشہ ایک چیلنج رہا ہے۔جو لوگ کلاسیکی غزل کے لفظیاتی نظام اور اس کے جذب و کیف سے ناآشنا ہیں وہ مجروحؔ کی

غزل سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور نہ انہیں کوئی بصیرت مل سکتی ہے۔ مجروحؔ کی شاعری دل کی بھی ہے اور دماغ کی بھی اور مجروحؔ کی غزل میں ایک پورا کلچر سمٹ آیا ہے۔ زندگی کی ایک تہذیب کو مجروحؔ کی غزل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ غزل کی تہذیب کیا ہے؟ کون سی تہذیب اس عہد کی ہے جس عہد سے ہمارا رشتہ ہے۔ اس عہد میں احتجاج کے الفاظ کس طرح کے ہو سکتے ہیں۔ مجروحؔ نے کہا تھا ؎

امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا، مار لے ساتھی جانے نہ پائے

یہ شعر مجروحؔ مزدوروں کے لئے کہہ رہے ہیں یہاں مجروحؔ کو للکارنا تھا، اپنے ساتھ لوگوں کو لانا تھا۔ وہ شاعری نہیں کر رہے تھے، وہ نعرہ لگا رہے تھے، آواز دے رہے تھے اور یہاں وہ اس تہذیب کے دائرے میں احتجاج کر رہے تھے ؎

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

وہ چند اشعار جن میں غزل کا فن مجروح ہوا ہے ان کو سامنے رکھ کر اگر مجروحؔ کی غزل گوئی کو ہم نظر انداز کر دیں تو مجروحؔ سے زیادہ اپنے ساتھ زیادتی ہو سکتی ہے اور ہم غزل کے ایک روشن باب سے محروم ہو جائیں گے ؎

مرے جنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے	تو اے بہارِ گریزاں کسی چمن میں رہے
بغل میں ہم بھی لیے اک صنم کا ہاتھ چلے	بلا ہی بیٹھے جب اہلِ حرم تو اے مجروحؔ
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار کی طرح	مجروحؔ لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام

دیکھیے کس طرح مجروحؔ کی شاعری ہمارے جذبے میں ارتعاش پیدا کرتی ہے اور ہمارے محسوسات کو بیدار کرتی ہے۔ ادب کے ایک طالبِ علم کی حیثیت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نئے پن کے دور میں مجروح کی غزل، غزل کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور یہی وہ خوبی ہے جو مجروحؔ کو غزل کا ایک مزاج شناس بناتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۶﴾ مجروحؔ کا کون سا شعر بیسویں صدی کے آخر کی شناخت بن گیا؟

﴿۷﴾ غزل کب غزل نہیں رہتی؟

14.05 مجروحؔ سلطان پوری کی پہلی غزل

﴿۱﴾

﴿۱﴾ مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

﴿۲﴾ مرے کام آ گئیں آخرش یہی کاوشیں، یہی گردشیں
بڑھیں اِس قدر مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے

﴿۳﴾ وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں آ گئی
وہی لب نہ میں جنہیں چھو سکا قدحِ شراب میں ڈھل گئے

﴿۴﴾ وہی آستاں ہے وہی جبیں وہی اشک ہے وہی آستیں
دلِ زار تو بھی بدل کہیں کہ جہاں کے طور بدل گئے

﴿۵﴾ تجھے چشمِ مست پتا بھی ہے کہ شبابِ گرمیِ بزم سے
تجھے چشمِ مست خبر بھی ہے کہ سب آبگینے پگھل گئے

14.06 مجروحؔ سلطان پوری کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ اِس غزل کے پانچ اشعار شاملِ نصاب ہیں۔ مجروحؔ کہتے ہیں کہ اے محبوب! جب سے تیرا ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا ہے تب سے ہوا کا رُخ بدل گیا ہے، راستے کے چراغ جل اُٹھے ہیں اور میرا سفر آسان ہو گیا ہے۔ سفر کی مشکلات نے میرے پیروں کے کانٹے نکال دِیے ہیں۔ میرا محبوب جو بات مجھ سے نہ کہہ سکا وہ بات میں نے اپنے شعر میں کہہ دی ہے اور محبوب کے ہونٹ جنہیں میں کبھی نہ چُوم سکا وہ شراب کے پیالے میں ڈھل گئے ہیں۔ اے میرے غمگین دل! دنیا کے انداز بدل چکے ہیں اب تُو بھی اپنا انداز بدل لے۔ اے نشیلی آنکھ! کیا تجھے کچھ اندازہ بھی ہے کہ تیری وجہ سے بزم اپنے شباب پر ہے جس کی وجہ سے شراب کے پیالے(شیشے) تک پگھل گئے ہیں۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! جب تک تُو میرے ساتھ نہیں تھا تو میرا حال یہ تھا کہ ہوا میرے چراغوں کو بجھا دیتی تھی جس کی وجہ سے مجھے سفر کرنے میں بہت دشواری پیش آتی تھی لیکن جب سے تُو نے میرا ہاتھ تھاما ہے تب سے ہوا نے اپنا رُخ بدل لیا ہے، اب چراغ بھی جل رہے ہیں اور میرا سفر بھی آسان ہو گیا ہے۔

دوسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ عموماً سفر کی مشکلات سے تنگ آ کر انسان کی ہمت جواب دے جاتی ہے مگر میرا معاملہ بالکل الگ ہے، سفر کی مشکلات نے میرے پیروں کے کانٹے نکال دِیے ہیں یعنی میری ہمت کو بڑھا دِیا ہے۔

تیسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ جو بات میرا محبوب مجھ سے نہیں کہہ سکا میں نے وہ بات اپنے شعر میں کہہ دی ہے اور میرے محبوب کے ہونٹ جنہیں میں کبھی نہیں چُوم سکا اب وہ ہونٹ شراب کے پیالے کی صورت میں بدل گئے ہیں، اب میں جب چاہوں اپنے محبوب کے ہونٹوں کو چوم سکتا ہوں۔

چوتھا شعر: شاعر کہتا ہے کہ اے میرے غمگین دل! تُو کب تک اِسی طرح غمگین واُداس رہے گا؟ زمانے کے انداز بدل چکے ہیں اِس لئے اب تُو بھی اپنا انداز بدل لے یعنی خوش رہنا سیکھ لے۔

پانچواں شعر: شاعر کہتا ہے کہ اے نشیلی آنکھوں والے محبوب! کیا تجھے کچھ اندازہ بھی ہے کہ تیری نشیلی آنکھوں نے بزم کا کیا حال کر دیا ہے؟ تیری آنکھوں کے نشے نے شراب کے پیالے (شیشے) تک پگھلا دِیے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۸﴾ غزل کے مطلع میں 'ہوا کا رخ بدل جانا' کس چیز کا اعلامیہ ہے؟

﴿۹﴾ زیرِ نظر غزل کس وزن میں کہی گئی ہے؟

﴿۱۰﴾ آبگینہ کسے کہتے ہیں؟

14.07 مجروؔح سلطان پوری کی دوسری غزل

﴿۲﴾

﴿۱﴾ جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے، ہمارے ساتھ چلے

﴿۲﴾ ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

﴿۳﴾ دیارِ شام نہیں ، منزلِ سحر بھی نہیں
عجب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے

﴿۴﴾ پھر آئی فصل کے مانند برگِ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے

﴿۵﴾ بلا ہی بیٹھے جب اہلِ حرم تو اے مجروؔح
بغل میں ہم بھی لیے اک صنم کا ہاتھ چلے

14.08 مجروؔح سلطان پوری کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ اِس غزل کے پانچ اشعار شاملِ نصاب ہیں۔ مجروؔح کہتے ہیں کہ ہم وہ دیوانے ہیں جو اپنے گھر کو آگ لگا چکے ہیں، اگر کسی اور میں یہ حوصلہ ہو تو وہ ہمارے ساتھ آجائے۔ اے میرے ہم رَاہیو! جب تک ظلم وستم کا یہ سلسلہ جاری ہے تم اپنے سَروں کے نذرانے پیش کرتے رہنا۔ خدا جانے میں کس جگہ آ گیا ہوں؟ جہاں رات اور دن میں کوئی حرکت ہی نہیں ہے۔ شاید بہار کا موسم آ چکا ہے، پھول کھل

رہے ہوں گے، ممکن ہے کہ مجھے چمن میں جانے کا موقع مل جائے۔اے مجروح! اہلِ حرم سے یہ توقع تو نہیں تھی لیکن اگر انہوں نے بُلا ہی لیا ہے تو ہم بھی اپنے محبوب کا ہاتھ تھامے ہوئے جائیں گے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: شاعر کہتا ہے کہ ہم وہ دیوانے ہیں جنھوں نے دیوانگی میں اپنا گھر تک جلا دیا ہے اگر کسی اور میں ایسا کرنے کا دَم خم ہو تو وہ ہمارے ساتھ آسکتا ہے۔

دوسرا شعر: شاعر اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ اے میرے ہم رَاہیو! جب تک ظلم و ستم کا یہ سلسلہ چلے تم بھی اپنے سَروں کے نذرانے پیش کرتے رہنا، کبھی کسی طرح کی کوتاہی نہ کرنا۔

تیسرا شعر: شاعر اپنے آپ سے بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ خدا جانے میں کس جگہ آ گیا ہوں؟ جہاں رات اور دن میں کوئی حرکت ہی نہیں ہے بلکہ ہر طرف صرف جمود و تعطل کا دَور دَورہ ہے۔

چوتھا شعر: شاعر کہتا ہے کہ غالباً بہار کا موسم آ چکا ہے، چمن میں پھول کھل رہے ہوں گے، اِس لئے ممکن ہے کہ مجھے چمن میں جانے کے لئے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔

پانچواں شعر: شاعر اپنے آپ سے مخاطب ہے کہ ویسے حرم والوں سے یہ توقع تو نہیں ہے کہ وہ مجھ جیسے شرابی کو حرم میں آنے کی دعوت دیں گے لیکن اگر اُنہوں نے دعوت دے ہی دی ہے تو کیوں نہ میں اپنے محبوب کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۱﴾ شاعر نے مشعلِ جاں کو کس سے تشبیہ دی ہے؟

﴿۱۲﴾ مجروح نے کس کے حوالے سے خوب صورت اشعار کہے ہیں؟

14.09 خلاصہ

اسرارحسن مجروؔح اتّر پردیش کے ضلع سلطان پور کے باشندے تھے۔ان کی ولادت یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء کو اعظم گڑھ کے قصبے نظام آباد میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم عربی، فارسی اور اردو کی ہوئی۔بعدازاں انہوں نے طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور مطب قائم کیا۔شعر گوئی کا آغاز ہو چکا تھا۔۱۹۴۵ء میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے ممبئی گئے اور فلمی دنیا میں نغمہ نگاری سے وابستہ ہو گئے پھر یہیں کے ہو رہے اور باقی عمر فلموں میں گیت لکھنے میں گزاری۔

مجروؔح اپنے عہد کے مقبول شاعر رہے ہیں۔جب غزل ترّقی پسندوں کے مسلسل حملوں کا شکار ہو رہی تھی، اس وقت ترّقی پسندوں کی صف سے ہی فیضؔ اور مجروؔح جیسے شاعروں نے غزل کا دفاع کیا۔مجروؔح نے غزل کی کلاسیکی روایات کا احترام کیا اور تغزّل سے اپنی غزل کا رشتہ برقرار رکھا۔غزل کی جمالیاتی حس ہمیں مجروؔح کے زیادہ تر اشعار میں ملتی ہے۔عصری حسّیت بھی ان کے کلام میں ہے مگر اسے راست

بیانیہ کی شکل میں تلاش کرنا درست نہ ہوگا۔ دراصل وہ استعاروں اور کنایوں کے مزاج شناس ہیں اور اُنھی کے ذریعے اپنی بات کہتے ہیں۔ مجروحؔ نے غزل کے تمام تر تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ غزل کی مکمل تہذیب مجروحؔ کی غزلوں میں سمٹ آئی ہے۔

مجروحؔ کا پہلا شعری مجموعہ ''غزل'' کے عنوان سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ یہی مجموعہ ترمیم و اضافے کے ساتھ ۱۹۹۹ء میں ''مشعلِ جاں'' کے نام سے شائع ہوا۔ فلموں میں مجروحؔ کے گراں قدر تعاون کے لئے انہیں فلمی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز 'دادا صاحب پھالکے ایوارڈ' دیا گیا۔ اس کے علاوہ اور بھی اعزازات دیے گئے۔ ۲۴ مئی ۲۰۰۰ء کو ایک بھرپور زندگی گزار کر ممبئی میں مجروحؔ کا انتقال ہوگیا۔

14.10 فرہنگ

آبگینے	:	شیشہ، کانچ، آبگینہ کی جمع	قدحِ شراب	:	شراب کا پیالہ
آخرش	:	آخرکار	کاوشیں	:	محنت، تلاش وجستجو، کاوش کی جمع
بادِ مخالف	:	وہ ہوا جو منزل تک پہنچنے سے روکے۔	کج کلاہی	:	بادشاہت، بانکپن
پُرآشوب	:	فتنوں سے بھرا ہوا	للکار	:	حملے کی دعوت دینا
توانا	:	مضبوط	مجروح	:	زخمی
دَوردَورہ	:	رواج، چلن	محاسن	:	خوبیاں
زنداں	:	قیدخانہ	مساوی	:	برابر
ستون	:	کھمبا	نغمہ نگار	:	فلمی گیت اور گانے لکھنے والا
عدیم المثال	:	جس کی کوئی مثال نہ ہو			

14.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰۔۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : شاملِ نصاب کسی غزل کے دو شعر لکھ کر تشریح کیجیے۔

سوال نمبر ۲ : فلموں سے مجروحؔ کی وابستگی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰۔۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر ۱ : مجروحؔ کے حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔

سوال نمبر ۲ : مجروحؔ کی غزل کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

14.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ غزل از مجروحؔ سلطان پوری

۲۔ گل کاریِ وحشت کا شاعر مجروحؔ از ڈاکٹر خلیق انجم

14.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ مجروحؔ ضلع اعظم گڑھ کے قصبے نظام آباد میں یکم اکتوبر ۱۹۱۹ءکو پیدا ہوئے۔

﴿۲﴾ چوں کہ مدرسے کے ایک مدرّس سے ان کا جھگڑا ہوگیا تھا اور انہیں مدرسے سے ہٹا دیا گیا۔

﴿۳﴾ مجروحؔ نے پہلی بار اے.آر.کاردار کی فلم ''شاہ جہاں'' میں گانے لکھے۔

﴿۴﴾ مجروحؔ کا مجموعۂ کلام پہلی بار ''غزل'' کے نام سے شائع ہوا۔

﴿۵﴾ مجروحؔ کو فلمی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ دیا گیا۔

﴿۶﴾ مجروحؔ کا درج ذیل شعر بیسویں صدی کے نصف آخر کی شناخت بن گیا۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

﴿۷﴾ جب کلاسیکی غزل سے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں تو غزل، غزل نہیں رہتی۔

﴿۸﴾ ہوا کا رخ بدل جانا، مشکلوں کے دور ہو جانے کا اعلامیہ ہے۔

﴿۹﴾ یہ غزل متفاعلن کے وزن پر کہی گئی ہے۔

﴿۱۰﴾ آبگینہ شیشے یا کانچ کو کہتے ہیں۔

﴿۱۱﴾ گھر سے

﴿۱۲﴾ مجروحؔ نے رات کے حوالے سے بے حد خوب صورت اشعار کہے ہیں۔

✵

اکائی 15 : ناصؔر کاظمی

ساخت

15.01 : اغراض ومقاصد
15.02 : تمہید
15.03 : ناصؔر کاظمی کے حالاتِ زندگی
15.04 : ناصؔر کاظمی کی غزل گوئی
15.05 : ناصؔر کاظمی کی پہلی غزل
15.06 : ناصؔر کاظمی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
15.07 : ناصؔر کاظمی کی دوسری غزل
15.08 : ناصؔر کاظمی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح
15.09 : خلاصہ
15.10 : فرہنگ
15.11 : نمونہ امتحانی سوالات
15.12 : حوالہ جاتی کتب
15.13 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

15.01 اغراض ومقاصد

ناصؔر کاظمی نئی اردو غزل کے ایک ممتاز اور معتبر شاعر تھے۔انہوں نے اردو غزل کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ان کی شاعری میں میؔر کی تقلید ہے۔ہندوپاک میں نئی شاعری کو جن چند ناموں نے آبرو بخشی ہے ان میں ناصؔر کاظمی سرِ فہرست ہیں۔انہوں نے سادگی اور سچائی کو ہمیشہ ترجیح دی۔ان کی شاعرانہ خصوصیات کی غرض وغایت سے آپ کو واقف کرانے کے لئے یہ اکائی نصاب میں شامل ہے۔

15.02 تمہید

اس اکائی میں ناصؔر کاظمی کی حیات پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی جائے گی اور ان کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیات کو اجاگر کیا جائے گا۔ تاکہ آپ ان کی شعری بصیرت سے آگہی حاصل کر سکیں۔آپ کے مطالعے کے لئے ان کی دو اہم غزلیں بھی ہوں گی۔ان غزلوں کے تمام اشعار کی تشریح سادہ اور عام فہم زبان میں کی جائے گی۔ان پر مجموعی تاثر کا اظہار بھی کیا جائے گا۔بعد ازاں اس اکائی کا خلاصہ بھی پیش کیا جائے گا۔اس اکائی کے مطالعے سے آپ کو ناصؔر کاظمی کی زندگی اور شاعری سے متعلّق معلومات حاصل ہو سکیں گی۔

15.03 ناصؔر کاظمی کے حالاتِ زندگی

ناصؔر کاظمی کا اصل نام سیّد رضا اور قلمی نام ناصؔر کاظمی تھا۔ ان کی پیدائش ۸ ؍ستمبر ۱۹۲۵ء کو انبالہ میں اپنے نانا کے مکان ’کنیز منزل‘ محلّہ قاضی واڑہ میں ہوئی۔ ان کا سلسلۂ نسب امام موسیٰ کاظم سے ہوتا ہوا حضرت علی بن ابی طالب سے جا ملتا ہے۔ ان کے دادا کا نام سیّد شریف الحسن تھا جو ایک وضع دار انسان کے ساتھ زمین دار بھی تھے۔ ان کی زمین داری نصیر پور، مگر پورہ اور راج گڑھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ پولس انسپکٹر بھی تھے۔ انہوں نے اپنی ملازمت بڑے خلوص اور ذمہ داری کے ساتھ کی۔ وہ جب تک اس عہدے پر فائز رہے، بڑی تندہی سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ غرض کہ ان کی زندگی خلوص و وفا، ایثار و قربانی اور انسان دوستی سے عبارت ہے۔

ناصؔر کاظمی کے والد سیّد محمد سلطان بھی ایک متّقی، پرہیزگار، غریب پرور اور زندہ دل انسان تھے۔ وہ صوبہ دار میجر کے عہدے پر فائز رہے۔ والد کے انتقال کے بعد ناصؔر کاظمی اور ان کے اہلِ خانہ کو مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کبھی کبھی ایسا وقت بھی آیا کہ چولہے میں آگ جلنی بھی مشکل ہوگئی۔ تنگ دستی سے حالات اتنے بگڑ گئے تھے کہ ناصؔر کاظمی نے اپنی والدہ کے زیور فروخت کر کے ضروری کام کیے اور اپنی زندگی اور گھر والوں کی گاڑی کو پٹری پر لانے کی کوشش کی۔ دراصل ان کے لئے یہ دَور پُر آشوب ثابت ہوا۔ پریشانیاں کم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں لیکن ناصؔر کاظمی نے صبر و ضبط کے دامن کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ہمّت و حوصلے سے کام لیا۔ جوانی کے دنوں میں ناصؔر کاظمی کی زندگی کے اندر جو لا اُبالی پن تھا، وہ ماں کی رحلت اور شادی کے بعد کم ہوگیا۔ یعنی انہوں نے اپنی زندگی کی ڈور کو جہدِ پیہم سے باندھے رکھا۔

ناصؔر کاظمی ہمیشہ اسکول جانے سے جی چراتے رہے۔ کیوں کہ انہیں اسکول کا طریقۂ تعلیم قطعی پسند نہیں تھا۔ وہ درسی نظامِ تعلیم میں تبدیلی چاہتے تھے لیکن یہ بھی سچّائی ہے کہ پڑھائی سے دوٗر بھاگنے کے باوجود جب سالانہ امتحان کا نتیجہ آتا تو وہ اکثر اوّل آتے۔ ناصؔر کاظمی جب بی۔اے۔ کے طالبِ علم تھے تو ملک کی تقسیم کا سانحہ پیش آیا اور ان کا خاندان انبالہ (ہندوستان) سے ہجرت کر کے لاہور (پاکستان) چلا گیا۔ تقسیمِ ملک کی وجہ سے ان کی بی۔اے۔ کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ناصؔر کاظمی کا خاندان ہجرت کا کرب، خون ریزی، تصادم اور لوٹ مار کے بازار کا صدمہ جھیل چکا تھا۔ ملک کی تقسیم اور اس کے اثرات ناصؔر کاظمی پر بھی مرتّب ہوئے۔ انہیں اپنا شہر انبالہ چھوڑنے کا بے حد رنج تھا۔

ناصؔر کاظمی کو بہت سی چیزوں کا شوق تھا۔ وہ پشاور میں وزیر باغ، شاہی باغ اور قلعہ اکبر کی سیرگاہوں میں طوطے پکڑنے اپنے دوستوں کے ساتھ اکثر جایا کرتے تھے۔ انہیں بچپن سے ہی کبوتر پالنے، کبوتروں سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے اور گھڑسواری کا شوق تھا۔ کبوتر پالنے کا یہ شوق تو زندگی کے آخری ایّام تک برقرار رہا۔ انہیں مصوّری اور موسیقی بھی بے حد پسند تھی۔ نفسیات اور فلسفہ کے مطالعے سے بھی ان کی گہری دل چسپی تھی۔

ناصؔر کاظمی پائلٹ بننا چاہتے تھے۔ مگر صورتِ حال کے سبب انہیں ریڈیو کی ملازمت قبول کرنی پڑی۔ پھر ’’اوراقِ نو‘‘، ’’ہمایوں‘‘ اور ’’خیال‘‘ جیسے معیاری رسالوں کے ادارتی فرائض احسن طریقے سے انجام دینے لگے۔ ایک مدیر کی حیثیت سے انہوں نے رسالہ ’’اوراقِ نو‘‘ کا کام ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۷ء تک اور ’’ہمایوں‘‘ کا کام ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک کیا۔ جب کہ مدیر اور ناشر کے طور پر ’’خیال‘‘ کی ادارت ۱۹۵۷ء میں کی۔ وہ ’’ہم لوگ‘‘ کے نائب مدیر بھی رہے۔ ان کی ملازمت کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو انہوں نے ’’ولیج ایڈ‘‘ میں نوکری کر لی جہاں یکم جنوری ۱۹۵۹ء سے ۳۱ ؍جولائی ۱۹۶۹ء تک اپنی خدمات انجام دیں۔ لیکن ۲۲ ؍جون ۱۹۶۴ء کو ریڈیو پاکستان (لاہور) سے وابستہ ہو گئے اور یہاں انہوں نے اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے تادمِ آخر اپنی ملازمت کو سلیقے سے نبھایا۔

ناصرؔ کاظمی کی شادی سیّد انوار الحق صاحب کی بیٹی شفیقہ بانو سے ہوئی۔ ان کے دو بیٹوں کے نام باصر رضا اور حسن رضا ہیں۔ ان کے عزیز دوستوں میں انتظار حسین، احمد مشتاق، حفیظ ہوشیار پوری، غالب احمد، سجّاد باقر رضوی، سعید احمد، شیخ سعید اختر، مظفر علی سیّد، اختر محمود، حنیف رامے اور شیخ صلاح الدّین وغیرہ کے نام قابلِ ذِکر ہیں۔ انہی دوستوں کے ساتھ ان کا بہترین وقت گزرتا تھا اور بزمِ دوستاں کا چراغ روشن تھا۔ ناصرؔ کاظمی بنیادی طور پر ایک مذہبی اور نمازی آدمی تھے۔ رمضان المبارک میں وہ تمام روزے رکھتے اور تلاوتِ کلامِ پاک بھی پابندی سے کرتے تھے۔

ناصرؔ کاظمی کے پانچ مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں جن میں غزلوں پر مشتمل مجموعے ''برگِ نے'' (۱۹۵۲ء) ''دیوان'' (۱۹۷۲ء)، ''پہلی بارش'' (۱۹۷۵ء) اور نظموں پر مشتمل ایک مجموعہ ''نشاطِ خواب'' (۱۹۷۷ء) اور ایک طویل منظوم ڈراما ''سر کی چھایا'' (۱۹۸۱ء) شامل ہیں۔ ان کی نثری کتابوں میں ''خشک چشمے کے کنارے'' (۱۹۸۲ء)، ''انتخابِ میرؔ'' (۱۹۸۹ء)، ''انتخابِ نظیرؔ'' (۱۹۹۰ء)، ''انتخابِ ولیؔ'' (۱۹۹۱ء)، ''انتخاب انشاؔ'' (۱۹۹۱ء) اور ''ناصرؔ کاظمی کی ڈائری'' (۱۹۹۵ء) قابلِ ذِکر ہیں۔ اب ان کی کلیات ''کلیاتِ ناصرؔ'' کے نام سے منظرِ عام پر آ چکی ہے، جس میں برگِ نے، دیوان اور پہلی بارش کی تمام غزلیں اور نشاطِ خواب کی تمام نظمیں نیز سر کی چھایا کا طویل منظوم ڈراما شامل ہے۔ ''کلیاتِ ناصرؔ'' میں ۱۲ر غیر مطبوعہ غزلیں اور ۳۲ر متفرّق اشعار کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ''کلیاتِ ناصرؔ'' میں جو غیر مطبوعہ غزلیں اور اشعار موجود ہیں وہ یوں تو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے لیکن یہ کلام ان کے کسی بھی شعری مجموعے میں شامل نہیں تھے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ ناصرؔ کاظمی کا اصل نام کیا ہے؟ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

﴿۲﴾ ناصرؔ کاظمی کے شعری مجموعوں کے نام لکھیے؟

﴿۳﴾ ناصرؔ کاظمی کن کن رسالوں سے وابستہ رہے؟

15.04 ناصرؔ کاظمی کی غزل گوئی

ناصرؔ کاظمی نے غزل کو بول چال کی زبان سے قریب کیا۔ انہوں نے جو علامتیں استعمال کیں ان کا تعلق بھی فطری ماحول یا روزمرّہ کی زندگی سے ہے۔ تقسیم کے بعد کے حالات کو انہوں نے جس طرح غزل کا حصہ بنایا اور اس میں جو ذاتی نرمی، آہستگی، افسردگی اور محرومی کی کیفیت شامل کی، اس کی بنا پر ہی وہ نئی غزل کے پیش رو قرار پائے۔ انہوں نے غزل کے کلاسیکی آداب و آئین میں خود کو قید کر رکھا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ غزل کی ایک نئی فضا بھی تیار کی، جس میں اداسی، تنہائی، رات، صحرا، شہر، اجنبیت اور بے دلی وغیرہ کے شخصی جذبات کی آنچ کی لو تیز نظر آتی ہے۔ ناصرؔ کاظمی نے اپنی غزلوں میں ہندوستان کی تقسیم کا المیہ، ہجرت کا کرب، فرقہ وارانہ فسادات اور معاصر عہد کی بے چہرگی کے احساس کو اپنے منفرد اسلوب کے سانچے میں ڈھال کر ایک نئی شعری بستی آباد کی ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعۂ کلام ''برگِ نے'' میں ایسے بے شمار اشعار مل جاتے ہیں، جن سے گہرے جذبات کی عکّاسی ہوتی ہے لیکن اتنے نازک اور کرب ناک تجربات سے گزرنے کے بعد بھی ناصرؔ کاظمی کا لہجہ چیخ و پکار سے کوسوں دور ہے۔

ہندوستان کو آزادی تو ضرور ملی لیکن تقسیم کے سائے اور ہجرت کے درد نے ہندو پاک کے دونوں طرف کے عوام کو بے حد متاثر کیا۔ لاکھوں ہندوستانی اپنی تہذیب واقدار اور ادبی خزانے لے کر نئے ملک میں آباد ہوئے لیکن اپنی مٹّی کی خوشبو کو ہمیشہ محسوس کیا یعنی پاکستان میں رہ کر بھی ہندوستان کو دل میں بسائے رکھا۔ اسی طرح کا ردِّ عمل دوسری طرف بھی ہوا۔ آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات نے سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ پنجاب میں زبردست فسادات ہوئے، جس سے لوگوں نے پاکستان کے لئے اپنا رختِ سفر باندھا۔ ناصؔر کاظمی اور ان کا خاندان بھی فسادات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ناصؔر اور ان کے گھر والوں نے فسادات کی بدولت انبالہ سے ہجرت تو کی مگر ورثے کے طور پر خون خرابے، حادثے و غارت گری اور صدمات ہی ان کے حصے میں آئے۔ پاکستان کی ابتدائی غزلیہ شاعری میں انہی فسادات، اقدار کی شکست و ریخت، ہجرت اور ماضی کے آنگن میں تنہائی کی صدا خوب سنائی دیتی رہی۔ ناصؔر کاظمی نے بھی اپنے پاکستان کے ہم عصر شعرا احمد فرازؔ، شہزاد احمد اور احسان دانشؔ وغیرہ کی طرح اس عہد کی جیتی جاگتی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا اور پھر اسے شعری پیکر عطا کیا۔ نیز آزادی کو فریبِ آزادی سے تعبیر کیا۔ اس تعلّق سے چند اشعار دیکھیے۔

کس قدر تاریکیوں میں آگئے ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

پاکستان میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد یعنی ۱۹۵۸ء کے آس پاس ایک اہم رجحان ابھر کر سامنے آیا جو دراصل جدیدیت کی اساس تھی۔ فوجی حکومت کے ظلم و جبر سے وہاں کے عوام متنفّر ہو گئے۔ گویا پوری زندگی سکتے میں آ گئی۔ اس عہد میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک کی غزل گوئی میں رمزیت اور تہ داری بڑھ گئی۔ غزل کے رموز وعلائم اور لفظیات میں تنوّع پیدا ہوتا گیا، جس سے شاعری ایک نئے اسلوب کے قالب میں ڈھل کر نمودار ہوئی۔ ساتھ ہی دونوں ملکوں کے عوام کی بے چینی، حالات کی کرب ناکی اور ہجرت سے پیدا ہونے والی بے گھری اور دربدری کے موضوعات کو اردو غزل میں کثرت سے استعمال کیا گیا، جس میں منفی اور مثبت دونوں رویّے دیکھے گئے۔ درحقیقت یہی دور میرؔ کے اتبّاع کا بھی تھا۔ پاکستان میں شاعروں کے ایک گروپ نے میرؔ کی شعری کائنات سے استفادہ کیا، جس کے سپہ سالار ناصؔر کاظمی کہلائے۔ انہوں نے میرؔ کے زمانے کی رات کو اپنے زمانے کی رات سے منسوب کر کے غزل کو ایک نئی معنویت بخشی۔ بلکہ انہوں نے 'رات' کو ایک نئے استعارے کے طور پر استعمال کیا اور میرؔ کی از سرِ نو دریافت کی۔ دوسری طرف وہ میرؔ کی تقلید سے تنقید کا نشانہ بھی بنے لیکن سچّائی یہ ہے کہ اس سے ناصؔر کاظمی کی شعر گوئی پر آنچ نہیں آئی۔ بزرگ شاعروں کی زمینوں میں غزلیں کہنے کا رواج بہت پہلے سے ہماری اردو شاعری میں رہا ہے۔ آیئے یہاں میرؔ کی تقلید میں ناصؔر کاظمی کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

تری گلی میں گیا ، پھر گیا نہ پھر بولا میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار رہا (میرؔ)
وہ رات کا بے نوا مسافر، وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصؔر تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ (ناصؔر)
افسردگیِ سوختہ جاناں ہے قہر میرؔ دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ (میرؔ)
کرم اے صرصرِ آلامِ دوراں دلوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے (ناصؔر)

'عشق' غزل کا ہمیشہ کلیدی موضوع رہا ہے اور ہر دور میں شاعروں نے عشق و محبت کی مختلف کیفیات کو بیان کیا ہے۔ ناصؔر کاظمی کی غزل بھی عشقیہ جذبات سے معمور ہے، جو سادگی اور سچّائی سے عبارت ہے۔ دراصل ان کی غزل میں عشقیہ جذبات واحساسات کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ عشق کی تمام کیفیات ذہن و دل میں گھر کر لیتی ہیں۔ ان کا عشقیہ رویّہ منفرد اور یگانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے منفرد عشقیہ لہجے نے ان کو بڑا شاعر بنا دیا۔ عشقیہ موضوع کی رنگارنگی سے ان کی غزل دھیان کی سیڑھیوں پر اس طرح قدم رکھتی ہے کہ محبوب کو بھول سکنے اور کڑی دھوپ کے سفر میں سر پر خیالِ یار کی چادر لے کر چلنے کی بات کرتا ہے تو عشق کی کیفیات سے ذہن منوّر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح 'شبِ ہجر' میں کسی کی یاد نہ آنے کا ذکر کر کے ناصؔر کاظمی نے عشقیہ غزل کو ایک نئے شعری بوطیقا سے ہم کنار کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر   کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

فکر یہ تھی کہ شبِ ہجر کٹے گی کیوں کر   لطف یہ ہے کہ ہمیں یاد نہ آیا کوئی

حقیقت یہ ہے کہ ناصؔر کاظمی اپنے عشق کے اظہار میں دوسری چیزوں سے ضرور آنکھیں بند کر لیتے ہیں لیکن ان کی عشقیہ شاعری میں جمالیاتی حس موجود ہے جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔ ان کا عشقیہ رویّہ اپنی تہذیبی شناخت کا مظہر ہے۔ یعنی اس میں مخصوص سماجی یا تہذیبی قدریں موج زَن نظر آتی ہیں۔

ناصؔر کاظمی کی شاعری میں اجتماعی زندگی کی تلاش کی شعوری کوششیں کم ملتی ہیں۔ لیکن عصری حالات سے ان کی شاعری یکسر خالی بھی نہیں ہے۔ اس تعلّق سے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ناصؔر کاظمی کی زندگی کو ان کے گہرے تجربات نے کافی متاثر کیا۔ وہ اپنے عہد کے حالات و واقعات سے دوچار ہوئے لیکن انہوں نے کبھی دباؤ محسوس نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے دوسرے معاصرین کی طرح ان واقعات و حالات سے تخلیقی قوّت پر کوئی آنچ نہیں آنے دی اور بلند آہنگی سے بچتے رہے۔ وہ عصری تقاضوں سے واقف تھے لیکن ان تقاضوں کا رنگ کبھی اپنے کلام میں گہرا نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے اپنی شاعری کو نئی جہتوں سے آشنا کیا اور حالاتِ حاضرہ کا براہِ راست بیان کر کے شاعری کو شہرآشوب ہونے سے بچا لیا لیکن بعض حلقوں کی جانب سے یہ کہا جانا درست نہیں کہ ان کے یہاں 'روحِ عصر' ہے ہی نہیں۔ کوئی فن کار کبھی 'روحِ عصر' سے خود کو محفوظ نہیں کر سکتا۔ شاعری زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کا نام ہے، تو پھر 'روحِ عصر' سے خالی کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اور شاعر بھلا پوری انسانیت کے بارے میں کیوں نہیں سوچ سکتا۔

اب آیئے ناصؔر کاظمی کی غزلوں میں سماجی انتشار اور دہشت خیزی کے شعری پیکروں کو محسوس کریں تا کہ شاعر کے منفرد اندازِ بیان سے آگہی حاصل ہو سکے اور یہ بھی محسوس کریں کہ ناصؔر کاظمی نے عصری حالات کو اپنی تخلیقی قوّت سے کس طرح ہم آمیز رکھا ہے۔ چند اشعار بطورِ نمونہ پیشِ خدمت ہیں۔

انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ   یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

بازار بند، راستے سنسان، بے چراغ   وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

شہر سنسان ہے کدھر جائیں   خاک ہو کر کہیں بکھر جائیں

ناصؔر کاظمی کے یہاں لفظ شہر کا استعمال علامت کے طور پر خوب ہوا ہے۔ جدید شاعری میں شہر کی علامت کا کینوس کافی پھیلا ہوا ہے۔ ناصؔر کاظمی اپنے شعر میں شہر سے نئی معنویت پیدا کرتے ہیں۔ اس سے ان کی فکر کی تہ داری اور فن کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے اور شعر کے داخلی و خارجی انسلاک سے ایک نئی شعریت ابھرتی ہے۔ شاعر کے شہر میں جو رمزیت ہے اس کا ادراک وسیع معنوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے شہر کو ایک مثبت اور معنی خیز معنوں میں استعمال کیا ہے۔ زندگی کے بہترین امکانات و نتائج، معاشرے کے مثبت فکر و عمل اور تہذیبی اقدار کے معنوں میں شہر کے استعمال سے شاعری کے تلازمے میں نئی شعریت پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے شہر کو کبھی پیچیدہ مفہوم سے آراستہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ان کا شہر دنیا کے ہر علاقے میں مل جائے گا۔ جہاں لوگ خوش رنگ زندگی گذارتے ہیں اور کھلی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ وہ اسی شہر کی تلاش میں عمر بھر سرگرداں رہے۔ ان کا شہر جو کبھی اجڑ چکا تھا پھر کہیں نہیں ملا۔ وہ اس جستجو میں رہے کہ ان کو اپنے شہر جیسا کوئی شہر مل جائے لیکن وہ اس کے لئے ترستے رہے۔ پھر بھی امید یہ بندھی رہی کہ ایک نہ ایک دن وہ شہر ضرور ملے گا، جس کی شناخت کب کی مٹ چکی ہے۔ میرؔ کو اپنے شہر دلّی کے اجڑنے کا رنج تھا اور ناصؔر کاظمی کو اپنے شہر کی نشانیاں مٹ جانے کا کرب۔ دلّی کی تباہی اور بربادی کا نقشہ میرؔ نے بہت ہی عمدہ طریقے سے کھینچا ہے۔ دوسری طرف ناصؔر کاظمی نے بھی ہندوستان سے اپنی ہجرت کو 'زندہ دلانِ لاہور' میں پیش کیا ہے۔ یوں تو ناصؔر کاظمی نے اپنے شہر کی رونق کو تھوڑا بہت محسوس کیا اور اپنے دل کو اس دھرتی سے ہٹا کر دیکھا، اسے احساس ہوا کہ شاید یہ اسی کا شہر ہے لیکن بعد میں اربابِ سیاست کی بدولت شہر کی روشنی سمٹتی گئی اور تاریکی نے اپنا ڈیرہ جما لیا۔ اس بے رونقی کو دیکھ کر شاعر چیخ اٹھا۔

وہ شاعروں کا شہر وہ لاہور بجھ گیا
اُگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی

گویا ناصؔر کاظمی کے یہاں شہرِ مخصوص ایک شہر ہی نہیں بلکہ ایک المیہ بھی تھا جس کی کرب ناکی کو انہوں نے اپنے بہت سے شعروں میں بیان کیا۔ مثلاً چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

کس سے کہوں کوئی نہیں سو گئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے راہ میں میّتِ شہر بے کفن

شہر میں اب ہمارے چرچے ہیں — جگمگاتے ہیں کاخ و کو ہم سے

کھلی جو آنکھ تو کچھ اور ہی سماں دیکھا — وہ لوگ تھے نہ وہ جلسے نہ شہرِ رعنائی

ناصؔر کاظمی کے بنیادی شعری محرّکات میں عشق، شہر، رات، تنہائی، یاد اور یادِ رفتگاں قابلِ ذکر ہیں۔ رات اپنے وسیع تر معنی میں جا بجا نظر آتی ہے۔ ناصؔر کاظمی کو اسی لئے 'رات کا بے نوا مسافر' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ رات کی جتنی مسافت ناصؔر نے طے کی ہے شاید ہی کسی نے کی ہو۔ آیئے 'رات' کی ان کثیر جہتوں کو اشعار میں ڈھونڈتے ہیں۔

مرا تو خوں ہو گیا ہے پانی ستم گروں کی پلک نہ بھیگی — جو نالہ اٹھا تھا رات دل سے نہ جانے کیوں بے اثر گیا وہ

وہ رات کا بے نوا مسافر، وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصؔر — تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

لفظ 'تنہائی' بھی ناصؔر کے یہاں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔تنہائی ایسی چیز ہے جو ہر شخص کو ڈستی ہے۔ ناصؔر کے مطابق اگر تنہائی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔تنہائی سے ہر شاعر کو گزرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ تنہائی ہمیشہ سے شاعروں کا مقدر رہی ہے اور تنہائی میں ہی بہتر تخلیق کی توقع کی جاسکتی ہے۔ انسان ہمیشہ آزادی کا طلب گار رہتا ہے۔لیکن جب تک وہ تنہائی سے اقرار نہیں کر لیتا اس کو سکون نصیب نہیں ہوسکتا۔تنہائی کی مختلف تہیں ناصؔر کاظمی کی غزلوں میں موجود ہیں، چند اشعار بطورِ نمونہ ۔

تنہائی مرے دل کی جنّت میں تنہا ہوں ، میں تنہا تھا
ان سے اُلجھ ، کر بھی کیا لیتا تین تھے وہ اور میں تنہا تھا

جہاں تنہائیاں سر پھوڑ کے سو جاتی ہیں
ان مکانوں میں عجب لوگ رہا کرتے ہیں

یادِ رفتگاں تو ناصؔر کاظمی کا بنیادی تخلیقی محرّک ہے۔ کسی نہ کسی صورت میں شاعر گزرے دنوں کو یاد کرتا ہے، اس کا سراغ لگاتا ہے اور ماضی کو تلاش کرتا ہے۔ یادِ ماضی، یادِ رفتگاں، یادِ محبوب کی مختلف کیفیتوں سے ناصؔر کی غزلیں سرشار ہوتی ہیں، جو دلوں کے تار کو چھیڑ کر گئے دنوں کی یادتازہ کر دیتی ہیں۔آیئے آپ بھی ان کے یادِ ماضی کے درد و کرب اور کھوئی ہوئی کائنات کو محسوس کیجیے ۔

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں
ایسا الجھا ہوں غمِ دنیا میں ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

ناصؔر کاظمی کی شاعری میں اداسی، بےزاری، بے گھری اور تلاش و جستجو خوب مگر محتاط اندازِ فکر اختیار کیے ہوئے ملتے ہیں۔ملاحظہ کیجیے اس حوالے سے یہ اشعار ۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصؔر اداسی بال کھولے سو رہی ہے
خوشبوؤں کی اداس شہزادی رات مجھ کو ملی درختوں میں

ناصؔر کی شاعری کا ایک اسلوب ایسا بھی ہے جس پر فارسیت غالب ہے۔ان کے بہت سے اشعار میں فارسی تراکیب کے عمدہ نمونے دیکھنے کو مل جاتے ہیں یعنی اردو غزل میں فارسی تراکیب کے استعمال کی جو روایت رہی ہے اس سے ناصؔر کاظمی آشنا ہیں۔خوب صورت اور برمحل فارسی تراکیب سے ان کے کلام میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ دراصل یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنیاد پر بعض نقاد ناصؔر کاظمی کو غالبؔ سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ درج ذیل اشعار ہماری اسی بات کی غمازی کرتے ہیں ۔

ہم سے پہلے زمینِ شہرِ وفا خاک تھی ، کیمیا ہمیں سے ہوئی
ہر سحر بارگاہِ شبنم میں پھول ملتے ہیں باوضو ہم سے

فارسی کی بوجھل تراکیب سے پاک ناصؔر کاظمی کی شاعری کا ایک وصفِ خاص ان کی برجستگی بھی ہے جو ان کے گداز ہنر کو واضح کرتی ہے۔یہ شعر دیکھیے ۔

دل تو میرا اداس ہے ناصؔر شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے
کنج میں بیٹھے ہیں چپ چاپ طیور برف پگھلے گی تو پر کھولیں گے

جنگل، راستہ، رات، نیند، دشت، صحرا، جزیرے، پانی، خوشبو، چاندنی، خیمہ، خالی کمرہ، حویلی، گلی، شہر، تنہائی، چراغ، شجر، دیوار، دھوپ، آنگن، خالی ہاتھ، بارش، جھیل اور پہاڑ وغیرہ ناصؔر کاظمی کی شاعری کے بلیغ استعارے ہیں جن کے استعمال سے ایک نئی شعری فضا قائم ہوتی ہے اور نئی شاعری کی تفہیم میں آسانیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ اشعار دیکھیے ۔

رستوں میں اداس خوشبوؤں کے　　پھولوں نے لُٹا دیے خزانے
ہر ادا آبِ رواں کی لہر ہے　　جسم ہے یا چاندنی کا شہر ہے
بھیگ چلیں اب رات کی پلکیں　　تو اب تھک کر سویا ہوگا

ناصؔر کاظمی کا لسانی شعور بھی بہت پختہ ہے، اتنا پختہ کہ لفظوں میں اس کا درک شامل ہوتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں لفظوں کے استعمال میں حد درجہ احتیاط برتتے ہیں اور ایسے الفاظ کو کبھی نہیں چھوتے جو غیر مانوس اور غیر فصیح ہوتے ہیں۔ ناصؔر کاظمی کے پہلے مجموعے ''برگِ نے'' میں عشق غالب رہا تو دوسرے مجموعۂ کلام ''دیوان'' کی شاعری پوری طرح جذباتیت سے عاری ہے اور ذات حاوی ہوگئی ہے۔ ذات کی کرب ناکی زیادہ وسیع نظر آتی ہے۔ فلسفہ بھی بہت کم ہے۔ جب کہ تیسرے مجموعے ''پہلی بارش'' میں بھی اجتماعی شعور کا درک بہت کم ہوتا ہے اور پیکر تراشی کی عمدہ مثالیں مل جاتی ہیں۔ ان میں پیکر اور علامت دونوں ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ بعد کی غزلوں میں پیکر تراشی سے ان کا شاعرانہ کمال اور واضح ہو جاتا ہے۔ اس تعلّق سے چند اشعار ۔

ہاتھ ابھی تک کانپ رہے ہیں　　وہ پانی کتنا ٹھنڈا تھا
آنکھیں اب تک جھانک رہی ہیں　　وہ پانی کتنا گہرا تھا
کتنا چپ چپ، کتنا گم سم　　وہ پانی باتیں کرتا تھا

ناصؔر کی اصل شناخت ان کی غزلوں سے ہوتی ہے، لیکن انھوں نے کم عمدہ نظمیں بھی نہیں کہی ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ''نشاطِ خواب'' ہے، جس میں 'شہر غریب، نیا مسافر، بارش کی دعا، گھر پھولوں کے اور ساتواں رنگ جیسی عمدہ نظمیں موجود ہیں۔ ناصؔر کاظمی نے شاعری کے علاوہ مضامین بھی لکھے ہیں اور 'سر کی چھایا' جیسا خوب صورت طویل ڈرامہ بھی لکھا جو ہر اعتبار سے شاعری ہی معلوم ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ ناصؔر کاظمی نے غزل کے روایتی انداز کو قائم رکھتے ہوئے لہجے، تجربے اور احساس کی ایک نئی فضا قائم کی اور غزل کو ایک نیا پس منظر فراہم کیا۔ ان کا تخلیقی شعور پرانی صورتوں میں ادراک کا ایک نیا زاویہ ڈھونڈھ نکالتا ہے۔ اس لئے نئی غزل کے تمام پیش رووں میں ان کی غزل گوئی ایک الگ پہچان رکھتی ہے۔

ہم نے ایجاد کیا تیشۂ اشک　　شعلہ پتھر میں نہاں تھا پہلے
ہم نے روشن کیا معمورۂ غم　　ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے
ہم نے بخشی ہے خموشی کو زباں　　درد مجبورِ فغاں تھا پہلے
ہم نے آباد کیا ملکِ سخن　　کیسا سنسان سماں تھا پہلے

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ غزل کا کلیدی موضوع کیا رہا ہے؟

﴿۵﴾ ناصؔر کاظمی کے یہاں کون کون سے بنیادی شعری محرّکات ہیں؟

﴿۶﴾ ناصؔر کاظمی کی شاعری میں کچھ بلیغ استعاروں کی نشان دہی کیجیے۔

15.05 ناصؔر کاظمی کی پہلی غزل

﴿۱﴾

﴿۱﴾ بدلی نہ اس کی روح کسی انقلاب میں
کیا چیز زندہ بند ہے دل کے رباب میں

﴿۲﴾ لفظوں میں بولتا ہے رگ عصر کا لہو
لکھتا ہے دستِ غیب کوئی اس کتاب میں

﴿۳﴾ تو ڈھونڈتی ہے اب کسے اے شامِ زندگی!
وہ دن تو خرچ ہو گئے غم کے حساب میں

﴿۴﴾ نیندیں بھٹکتی پھرتی ہیں گلیوں میں ساری رات
یہ شہر چھپ کے رات کو سوتا ہے آب میں

﴿۵﴾ یہ آج راہ بھول کے آئے کدھر سے آپ
یہ خواب میں نے رات ہی دیکھا تھا خواب میں

15.06 ناصؔر کاظمی کی پہلی غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ ناصؔر کاظمی کی یہ غزل ان کی شعری بصیرت کو واضح کرتی ہے۔اس غزل میں رباب، رگِ عصر، دستِ غیب، نیند، گلی، شہر اور خواب وغیرہ کلیدی الفاظ ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں ان کی شاعری میں مل جاتے ہیں۔ دراصل یہ ناصؔر کاظمی کے بنیادی شعری محرّکات بھی ہیں۔عشق کے موضوع کو ناصؔر کاظمی نے خوب برتا ہے۔اس غزل میں بھی عشقیہ شاعری کے نمونے موجود ہیں۔ زبان و بیان اور موضوع کے اعتبار سے ناصؔر کی یہ غزل بہت عمدہ ہے۔جس سے ان کے شعری اظہار کے رویّے کا بخوبی اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: شاعر کہتا ہے کہ خدا جانے دل کے رباب میں کون سی چیز زندہ بند ہے کہ کوئی بھی تبدیلی اُس کی روح کو بدل نہیں سکی۔

دوسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ شعر اپنے زمانے کا آئینہ ہوتا ہے کوئی غیبی ہاتھ ہے جو اِس کتاب میں لکھتا ہے۔

تیسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ اے زندگی کی شام! تُو جن دنوں کو تلاش کر رہی ہے وہ غم کا حساب کرنے میں خرچ ہو گئے۔

چوتھا شعر: شاعر کہتا ہے کہ نیندیں ساری رات شہر کی گلیوں میں پھرتی ہیں اور شہر رات کو چھپ کر پانی میں سوتا ہے۔

پانچواں شعر: شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ آج آپ میری طرف کیسے آ گئے؟ میں نے رات خواب میں بالکل ایسا ہی دیکھا تھا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ ’’شامِ زندگی‘‘ سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

﴿۸﴾ درج بالا غزل ناصرؔ کاظمی کے کس مجموعۂ کلام میں شامل ہے؟

15.07 ناصرؔ کاظمی کی دوسری غزل

﴿۲﴾

﴿۱﴾ وہ دل نواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
مرا علاج مرے چارہ گر کے پاس نہیں

﴿۲﴾ تڑپ رہے ہیں زباں پر کئی سوال مگر
مرے لئے کوئی شایانِ التماس نہیں

﴿۳﴾ کبھی کبھی جو ترے قرب میں گزارے تھے
اب اُن دنوں کا تصور بھی میرے پاس نہیں

﴿۴﴾ گزر رہے ہیں عجب مرحلوں سے دیدہ و دل
سحر کی آس تو ہے زندگی کی آس نہیں

﴿۵﴾ مجھے یہ ڈر ہے تری آرزو نہ مٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت مری اداس نہیں

15.08 ناصؔر کاظمی کی دوسری غزل کا مجموعی تاثر اور تشریح

مجموعی تاثر:۔ ناصؔر کاظمی کی یہ غزل بھی پہلی غزل کی طرح بے حد مقبول ہے۔ انتہائی سادگی اور سچّائی سے شاعر نے اپنے دل کی بات کہہ دی ہے۔ اس غزل کا تیور بھی ناصؔر کاظمی کا اپنا ہے۔۔غزل کی لفظیات عام فہم ہیں۔ ساتھ ہی یہ غزل روایت سے گہرا ربط بھی رکھتی ہے۔ پوری غزل ایک وحدت تاثر لیے ہوئے ہے۔ ہر شعر میں عشق کی مختلف کیفیات کو الگ الگ طریقے سے ظاہر کیا گیا ہے۔ موسیقیت کی چاشنی اور احساسات وجذبات کی ترجمانی گہرے رنگ میں موجود ہے۔ غنائیت چوں کہ غزل کی جان ہوتی ہے اور تغزل جس کے بغیر غزل، غزل ہو ہی نہیں سکتی اس میں بھرپور انداز میں موجود ہے۔ کل ملا کر غزل کا مطالعہ قاری کو ایک گہرے احساس میں مبتلا کر دیتا ہے۔

غزل کی تشریح:۔

پہلا شعر: اس شعر میں شاعر اپنے محبوب کی شکایت کرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ وہ محبوب کی بے پرواہی کا شکوہ کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ وہ دل کو نوازنے والا ہے، دل کا حال جاننے والا بھی ہے۔ اگر اس سے مدعا بیان کیا جائے تو عطا کرنے میں کوتاہی بھی نہ کرے گا مگر اس کے اندر وہ نگاہ نہیں ہے جو میرے پنہاں رازوں کی حقیقت سے آگاہ ہو سکے اور ان کا مداوا کر سکے۔ میں بھی ایسا ہوں کہ میرے درد کا مداوا میرے محبوب کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔

دوسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ حرفِ مدعا بیان کرنے کے لئے بہت سے سوال ذہن میں اٹھ رہے ہیں۔ جن کے اظہار کے لئے اندر بے چینی اور تڑپ کا عالم ہے مگر مشکل یہ ہے کہ محبوب سے گفتگو کرنے اور حالِ زار بیان کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ یعنی محبوب کے شایانِ شایان ہی اپنا مدعا بیان کرنا چاہیے۔

تیسرا شعر: اس شعر میں شاعر اپنے ماضی کو یاد کر کے کہتا ہے کہ اے محبوب! میں نے وہ لمحے جو کبھی تیرے پہلو میں گزارے تھے اور مجھے تیرا قرب میسر تھا مگر وقت اور حالات نے اب سب کچھ بدل دیا۔ اب میرے پاس ان سب کا تصور بھی باقی نہیں رہا۔ یعنی ان گزرے ہوئے حسین لمحوں کا جو تیری قربت میں گزارے تھے۔

چوتھا شعر: شاعر زندگی سے مایوسی کی بات اس شعر میں کر رہا ہے۔ حالاتِ زندگی اور حادثاتِ وقت نے اس کے جذبات و احساسات میں عجب بے چینی کی حالت پیدا کر دی ہے۔ اس کے دل و دماغ میں عجیب سی کیفیت آ گئی ہے۔ وہ یاس و امید کے درمیان ڈول رہا ہے۔ اسے یہ تو امید ہے کہ حالات بدلیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ دیدہ و دل بھی ان لمحوں سے اپنے آپ کو بدل لیں مگر زندگی ساتھ چھوڑ دے گی۔ یعنی حالات نے اتنا توڑ دیا ہے کہ موت یقینی ہے۔

پانچواں شعر: یہ شعر نہایت عمدہ ہے اور اپنے اندر شعری فن کو سمیٹے ہوئے ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تیری یاد میری اداسی کا سبب بن جاتی ہے اور اس اداسی میں تو مجھے اور یاد آتا ہے مگر اب ایسا لگتا ہے کہ اب میری اداسی دور ہو رہی ہے اگر ایسا ہے تو میرے اندر تیری خواہش، تیری تمنا ختم ہو جائے گی۔ یہاں شاعر ہجر کو وصل پر فوقیت دے رہا ہے۔

15.09 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے نئی اردو غزل کے ایک معتبر شاعر ناصؔر کاظمی کی حیات اور غزل گوئی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا اور ان کی زندگی کے نشیب وفراز، شوقِ تعلیم اور ملازمت وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ ناصؔر کاظمی ۸؍دسمبر ۱۹۲۵ء کو انبالہ میں اپنے ننیہال میں پیدا ہوئے۔ وہ ابھی بی.اے میں تھے کہ ملک تقسیم کے سانحے سے دوچار ہوا۔ حالات اتنے بگڑے کہ ان کے خاندان کو لاہور ہجرت کرنی پڑی۔ ہجرت سے ان کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ انہوں نے ریڈیو لاہور میں کچھ دنوں ملازمت کی اور مختلف ادبی رسائل کی ادارتی ذمّہ داریوں کو بہ حُسن وخوبی انجام دیا۔ ناصؔر کاظمی کے شعری مجموعے ''برگِ نے''، ''دیوان''، ''نشاطِ خواب''، ''پہلی بارش'' اور ایک طویل نظم منظوم ڈارما ''سر کی چھایا'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کی کچھ نثری تصانیف بھی بطور یادگار موجود ہیں۔ کینسر کی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی اور انہوں نے ۲؍مارچ ۱۸۷۲ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

اس اکائی میں ناصؔر کاظمی کی غزلیہ شاعری کی چند اہم خصوصیات اور بنیادی شعری محرکات پر گفتگو کی گئی۔ عشق، رات، شہر، یادِ رفتگاں اور تنہائی وغیرہ کو بطورِ خاص موضوعِ بحث لایا گیا ہے تاکہ ان کی غزل گوئی کی انفرادیت واضح ہو سکے۔ مناظرِ فطرت اور عشق دونوں سے ان کی دل چسپی اور موسیقی ومصوّری سے گہرے لگاؤ کا عکس ان کی غزلوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے میؔر، غالبؔ اور فراقؔ وغیرہ کا اتّباع کیا اور کلاسیکی شاعری کا احترام کرتے ہوئے جدّت افروزی کو خوب پروان چڑھایا۔ نئی نئی اصطلاحیں، نئے نئے تلازمات، استعارے، تشبیہات اور علامات سے اپنی شاعری کو ایک جہانِ معنی عطا کیا ہے۔

15.10 فرہنگ

آشوب	ہلچل، فتنہ، فساد، پریشانی، شور	سحر	صبح، فجر، تڑکا
آفاق	ساری دنیا کا، عالم گیر	سوختہ	جلا ہوا، بجھا ہوا، مصیبت زدہ
افسردگی	کملاہٹ، پژمردگی، مایوسی	شکست وریخت	ٹوٹ پھوٹ، نقصان، ہارا ہوا
انتشار	پراگندگی، تتر بتر ہونا، منتشر ہونا	صرصر	آندھی، بادِ تند
برگزیدہ	منتخب، چنا ہوا، پسندیدہ	عمیق	گہرا
بساط	طاقت، سرمایہ، بستر	گجر	گھنٹے یا گھڑیال کی آواز
بصیرت	بینائی، دل کی بینائی، عقل مندی، رائے، خیال	مٹر گشتی	آوارگی، ہواخوری
بے سروسامانی	غریبی، مفلسی	مصائب	مصیبت کی جمع، تکلیفیں، بلائیں
تگ ودو	کوشش، سعی، دوڑ دھوپ	معنویت	باطن پن
خزاں	پت جھڑ، وہ موسم جس میں پتّے جھڑتے ہیں	نشیب وفراز	اونچ نیچ، اتار چڑھاؤ

15.11 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰-۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : ناصؔر کاظمی کے شوقِ تعلیم اور ملازمت وغیرہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

سوال نمبر۲ : ناصؔر کاظمی کی غزلوں میں فارسی اثرات کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۳ : ناصؔر کاظمی کی شعری ونثری تصانیف کے بارے میں اپنی معلومات سے ہمیں آگاہ کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰-۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : ناصؔر کاظمی کی مختصر سوانحِ حیات بیان کیجیے۔

سوال نمبر۲ : ناصؔر کاظمی کی عشقیہ شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

سوال نمبر۳ : ناصؔر کاظمی کی غزلیہ شاعری کے امتیازی نکات بیان کیجیے۔

15.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ کلّیاتِ ناصؔر از ناصؔر کاظمی

۲۔ معاصر اردو غزل از پروفیسر قمر رئیس (مرتّب)

۳۔ ناصؔر کاظمی ایک دھیان از شیخ صلاح الدین

۴۔ ناصؔر کاظمی کی شاعری از حامدی کاشمیری

15.13 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ ناصؔر کاظمی کا اصل نام سیّد ناصر رضا ہے۔، وہ ۸/دسمبر ۱۹۲۵ء کو انبالہ میں اپنے نانا کے مکان 'کنیز منزل محلّہ قاضی واڑہ میں پیدا ہوئے۔

﴿۲﴾ ناصؔر کاظمی کے شعری مجموعوں کے نام یہ ہیں: 'برگِ نے، دیوان، پہلی بارش، نشاطِ خواب اور سر کی چھایا'۔

﴿۳﴾ ناصؔر کاظمی 'اَوراق، ہمایوں، خیال، ہم لوگ وغیرہ رسالوں سے وابستہ رہے۔

﴿۴﴾ ''عشق'' غزل کا کلیدی موضوع رہا ہے۔

﴿۵﴾ ناصؔر کاظمی کے بنیادی شعری محرکات میں عشق، شہر، رات، تنہائی، یاد اور یادِ رفتگاں قابلِ ذِکر ہیں۔

﴿۶﴾ جنگل، راستہ، یاد، نیند، دشت، صحرا، جزیرے، پانی، خوشبو، چاند، چاندنی، خیمہ، خالی کمرہ، حویلی، گلی، تنہائی، چراغ، شجر، دیوار، دھوپ، آنگن، کالی ہاتھ، بارش، جھیل اوع پہاڑ وغیرہ ناصؔر کاظمی کی شاعری کے بلیغ استعارے ہیں۔

﴿۷﴾ ''شامِ زندگی'' سے شاعر کا ''محبوب'' مراد ہے۔

﴿۸﴾ متن کی پہلی غزل 'بدلی نہ اس کی روح کسی انقلاب میں' ناصؔر کاظمی کے مجموعۂ کلام 'دیوان' میں شامل ہے۔

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

Teenpani Bypass Road, Behind Transport Nagar

Haldwani - 263 139, Nainital (Uttrakhand)

Phone: 05946-261122, 261123 Fax No.: 05946-264232

www.uou.ac.in email: info@uou.ac.in

Toll Free No: 1800 180 4025

BAUL(N)-101-1(003828)